جمیلہ ہاشمی کے نایاب و شاہکار افسانے اور تحریریں

مختلف کتب ورسائل سے ماخوذ

------- ۞۞۞۞۞۞۞۞ -------
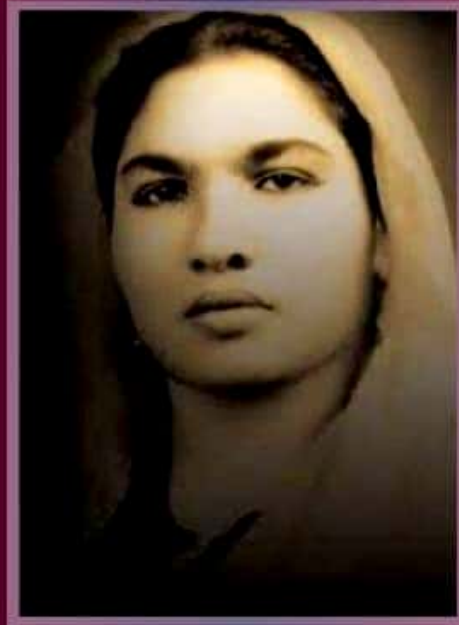
پیشکش : میر ظہیر عباس روستمانی

+92 308 3502081 ~~ +92 307 2128068

★★★★★★★★★★

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Title By : Ghulam Mustafa Daaim

PDF By :
Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO: +92 307 2128068 ! +92 308 3502081

FACEBOOK GROUP LINK :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

نیا دور

سہ ماہی

نیا دور کراچی

شمارہ نمبر

۸۱ — ۸۲

خاص نمبر

قیمت: پچاس روپے

شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی

جمیلہ ہاشمی

شبِ انتظار

جس رات کی میں بات کہنے جا رہی ہوں اُس کی صبح مجھ پر زیادہ اور بھائی پر کم مار پڑی تھی ماں آتی سردیوں کی گرم دھوپ میں آنگن میں لحاف پھیلائے اُس میں ڈورے ڈال رہی تھی ــــ لڑکیاں سیپاروں پر جھکی نانی کا پڑھایا ہوا سبق دُہرا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر ایک دوسری سے زیادہ کرخت آوازیں نکال رہی تھیں۔ میں تاگے اُلجھا رہی تھی، حالاں کہ میں ماں کو سوئی میں لمبا دھاگا پرو کر دینا چاہتی تھی۔ پھر تھک کر میں نے جھاڑو کی سینک پر دھاگے باندھے اور بوتل کے ڈھکنے سے ترازو بنانے لگی ـــ نانی نے لمبی ہوں کی تو ہم خوف زدہ ہو گئے ماں نے ڈانٹا کہ ہم جھاڑو برباد کر رہے تھے۔ ڈر کر ہم سیڑھی پر چڑھ گئے جہاں دیوار کے پار سے مامے دلاور کا صحن نظر آتا تھا جس میں چڑیاں گوبر کے ڈھیروں سے دانے چُن کر اُڑ اُڑ جاتی تھیں اور کُتّے گھڑی گھڑی بھونکتے تھے۔ پھر بطخیں ماں برکتے کی طرف سے بڑی محراب والی نالی کے راستے قائیں قائیں کرتی چونچیں پانی میں مارتی دھوپ کو دُھنکتی سر کو بار بار ڈبکی دیتیں چھوٹی کشتیوں کی طرح تیرتی ہوئی اوپر آتیں۔ کوّے خالی گھر کے دالان میں گھس کر کائیں کائیں شور مچا رہے تھے، کیوں کہ مامی خورشید اور ماسی شاد کھیتوں پر گئی ہوئی تھیں یہ کپاس کی چنائی کے دن تھے۔

ہم دیوار پر ہاتھوں پاؤں سے چلتے دوسری سیڑھیوں سے خالی صحن میں اُتر گئے۔ کُتا زور سے بھونکا بطخیں کواں کواں کرتیں ہمارے پیچھے بھاگیں۔ ہم دوڑ کر دالان کے ساتھ بنے ہوئے چھپر تلے چولھوں کی قطار پر چڑھ گئے اور چھپ کر بیٹھ گئے، جھانک کر دیکھا تو بطخیں زرد پانی میں کُھلی آسمان کی نیلاہٹ اور دُھوپ سے پار جا چکی تھیں کوّے دالان کو بھول کر منڈیر پر بیٹھے چونچوں

سے پروں کو صاف کر رہے تھے اور چپ تھے۔ ہم دونوں بھی اپنے ترازو سے کھیلنے لگے۔ ہم چولھوں میں پڑی راکھ کو تولنے لگے۔

اب کچھ اور تولتے ہیں مجھے یاد آیا شہر میں دکان دار اُجلے دہی کو کیسے کھٹا کھٹ برتنوں میں ڈالتے ہیں۔ دیکھنے سے ہی کتنا مزہ آتا ہے۔

ایک چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے سلگتے اُپلوں کا دھواں ذرا ذرا باہر آرہا تھا۔ کاڑھنی میں دودھ گرم ہو رہا تھا، چلو دودھ تولتے ہیں میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ چولھے پر لُڑھکے ہوئے گلاس سے ہم نے دودھ نکالا، میں دُکان دار تھی اور آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی بھائی گاہک تھا اور ایک ایک پیسے کا سودا گھڑی گھڑی لے رہا تھا۔ گرم دودھ اُس کے حساب میں میں زمین پر ڈال رہی تھی ہم بہت ہی مگن تھے بہت ہی خوش۔ چھوٹی چھوٹی دودھ ندیاں سی ہمارے چاروں طرف بہہ رہی تھیں

" ہائے میں مرگئی" ماسی شادو کی آواز سنائی دی۔ میں نے اوپر دیکھا اور ترازو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ شادو نے ماں کو آواز دی۔

"بہن تشانی بہن تشا - دیکھ اپنے لاڈلوں کے کام"۔

ماں کی خوف زدہ آواز سیڑھیوں پر سے آئی۔ نی شادو میرے بچے تو خیریت سے ہیں اور وہ بھاگتی ہوئی دیوار پر سے ڈولتی ہوئی گرنے سے بچتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی پھولے ہوئے سانس سے جیسے اُڑتی ہوئی آئی ہو ماموں دلاور کی طرف آئی۔

" یہ دیکھ یہ دیکھ" شادو نے چیختے ہی کہا " سارا دودھ غارت کر دیا ہے"۔

ماں کا دھواں دھواں چہرہ ایک دم تمکا اور وہ چمک اُس کے ہاتھوں میں اُتری اُس نے مجھے گھسیٹا اور روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیا۔ بھائی کو بھی دو چار طمانچے پڑے۔

ماں برکتے ننگے پاؤں دھوتی سنبھالتی اپنے دالان سے آئی اور مجھے پکڑ کر ایک طرف کیا۔

"ہوش کر نشا بچے ہی تو ہیں" پھر دودھ کو دیکھ کر کہنے لگی۔ " اگر سمجھ دار ہوتے تو نقصان کیوں کرتے"۔

ماں نے ہانپتے ہوئے کہا " شادو کو چیختے سنا تو میں نے سوچا خدا نخواستہ بچوں کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ مگر اب ان کو نصیحت ہوگئی، کبھی پھر ایسا نہیں کریں گے۔ ماسی تم ہٹ جاؤ آج مجھے اس کی ہڈیاں سینک لینے دو، یہ سمجھ دار ہے بڑی ہے دودھ کا حشر کر دیا ہے۔ شادو ٹھیک ہی کہتی ہے اور ماں میری طرف پھر

بیکی۔

نانی کی سیڑھیوں پر آتے آتے ہمسائے میں ماں فضلاں کی بہو کر ماں کا جھانکتا چہرہ سب آنسوؤں کی جلن اور کانوں کی سائیں سائیں میں گڈمڈ ہو گئے۔

ماں برکتے مجھے اپنے گھر لے آئی۔ دالان میں بچھی کھاٹ پر بٹھا کر زبردستی گرم دودھ پلایا پھر جب آنسو اور شرمندگی کا زور ذرا کم ہوا تو میرا تپتا ہوا چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھلایا۔ اُس کی پوتی مودی نے اپنی گڑیاں اور اُن کے پوتے لا کر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ تھوڑی دیر تو میں روتی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی پھر رنگ برنگ کپڑوں ننھے مُنّے پوتوں اور موتیوں کی نتھ پہنے گڑیا نے مجھ پر جادو کر دیا۔ ہم نے لکڑی کے ستونوں کے پیچھے اپنے اپنے گھر سجائے اور جہیز سینے لگے۔ پُوتے بنانا بہت آسان تھا ذرا ذرا سی کترنوں کو ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر زور سے پھیلاؤ تو ڈوری سی بٹ جاتی تھی اور ٹانگوں کے سرے پر ایسے ہی بازو لگا کر ایک گولی سی بنا کر سر لگا دیا جاتا۔ مودی اُن کی آنکھیں اور مُنہ توے کی سیاہی سے بناتی جاتی۔ ہم نے ایک بھیڑ بنا ڈالی۔ حالاں کہ مودی کہتی تھی زیادہ پُوتے سنبھالنا بہت مشکل ہو جائیگا پھر یہ آپس میں لڑیں گے تو گڑیا مصیبت میں پڑ جائے گی۔ تھک کر ہم نے لق و دق آنگن کے دوسرے سرے تک بطخوں کو بھگایا، کچّے امرود کھائے پینگ پر لمبے لمبے جھونٹے لئے۔ دیوار پر چڑھ کر پچھلی طرف سارنگی بجانے والے فقیروں کے گھر جھانکا۔ مودی نے مجھے اپنی گڑیا کے بیاہ کا قصّہ سنایا۔ آئندہ وہ گڑیا کی شادی نُوری کے گُڈے سے کرنے والی تھی۔ کیوں کہ پہلا گُڈا کانا تھا اور اُس کا سہرا تھا بارات جو آئی تھی تو باجا بجانے والے لڑکے نہیں تھے۔ وہ گُڑیا کے بغیر ہی چلے گئے تھے، کیوں کہ مودی نے اتنے میلے گُڈے کے ساتھ اپنی گڑیا بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر شمو کی اور اُس کی لڑائی ہو گئی تھی دونوں نے ایک دوسرے کے بال نوچے تھے اور بڑا ہنگامہ ہوا تھا دونوں کی ماؤں کو درمیان میں آنا پڑا تھا۔

شام ہو گئی تو گائیں بھینسیں گھر لوٹ آئیں وہ بے صبری سے چارے کی ناندوں میں سر دیئے تھیں اور اُن کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ٹناٹن بولتی تھیں اور تیز تیز اُڑتی اپنے گھروں کو جاتی چڑیاں اور کوّے اور تیز اُڑتے تھے۔ مودی کی ماں اور ماسیاں کھیتوں سے واپس آ گئیں۔ گھر چمکتے چہروں باتوں اور جوان لڑکیوں سے بھر گیا۔ مودی نے گڑیاں سمیٹ کر ایک ڈبے میں بھریں اور کوٹھری میں

اناج اور گڑ کی بوریوں کی اوٹ میں چھپا کر رکھ دیں۔

"آج نشا کی طرف جانا ہے چرخے تو ٹھیک ہیں نا۔ میرے چرخے کی مال پرانی ہے اور تکلے کو بھی کسی نے ٹیڑھا کر دیا ہے"۔ اس نے پھر کر مودی کی طرف دیکھا۔ "کیوں مودی تو نے آج میرے چرخے کو چھیڑا تھا؟

"نہیں ہم دونوں تو آج گڑیاں کھیلتی رہی ہیں۔ اس سے پوچھ لو۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔

مودی کی ماں نے میرے سر پر پیار کیا:

پھر وہ آٹا گوندھنے لگ گئی۔ ماں برکتے نے دال کو بگھار لگایا تو مہک سے آنگن بھر گیا۔ ملائی بنا کر اُس نے دودھ کو بڑی چاٹی میں پلٹا اُس کا رنگ پک پک کر ہلکا سُرخ ہو رہا تھا یا شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں سورج کی لالی منڈیر پر سے اس میں جھلک رہی تھی تنور میں شعلے اُونچے اور روشن تھے۔

رات ہونے سے پہلے مودی اور میں ماں برکتے کے بستر میں گھس گئے۔ وہ کہتی میری ماں کو بڑی کہانیاں آتی ہیں چڑیا اور کوے کی کہانی تو بہت ہی مزیدار ہے۔

کہانیاں تو میری ماں کو بھی بہت آتی تھیں مگر مجھے یاد آیا کہ صبح میری پٹائی ہو چکی ہے اور ماں مجھ سے سخت خفا تھی۔ گھر سے مجھے لینے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ مجھے راج ہنس کی بہت عُمدہ کہانی یاد تھی مگر میں نے کچھ نہ کہا اور چڑیا کی کہانی سنتی رہی سنتی ہی رہی۔

آنکھ کُھلی تو میں ماں کے کندھے سے لگی تھی اور میری ناک اُس کی موٹی چوٹی سے رگڑ کھاتی تھی بالوں میں سے کھٹی لسی کی مہک اُس کی خوشبو سے ملی بڑی میٹھی اور تلخ تھی پھلکاری میں سے ہوا میری ٹانگوں کو لگ رہی تھی۔ مامے دلاور کے صحن میں کتے بھونک رہے تھے لڑکیاں بے پرواہ کھچر کھچر باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔

پھر اناج کی کوٹھیوں کے ساتھ بنے اوسارے پر جب ماں نے اور بچوں کے درمیان مجھے لٹایا تو میں نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اُس نے جھک کر میرے ماتھے کو چوما اور میرے گرد رضائی لپیٹ دی۔ کوٹھڑی آوازوں اور چرخوں کی گھوں گھوں ہنسی کے شور سے

دہکی ہوئی تھی۔ تیل کے دیئے جلنے کی بو۔ مہندی لگے ہاتھوں کے پسینے میں ملی گیتوں کی تانوں میں اُڑتی تھی۔ قہقہے چھن چھن بولتے تھے۔ آنکھیں گنگناتی اور چمکتی تھیں ناک کے کیل مجھے چاند لگ رہے تھے اور اُن کی اُنگلیاں دھاگے پر یوں تیزی سے جمی ہاتھوں کے ساتھ اُٹھ اور گر رہی تھیں جیسے مولے وال کے ٹیلے پر وہ ناچ رہی ہوں۔ عجیب جادو تھا ہلکا نیلا دھواں کوٹھری میں بھر گیا تھا اور پھر وہ غبار بن کر میری آنکھوں میں اُتر آیا۔

کسی بچّے نے اد سارے پرخواب میں زور سے ٹانگ چلائی جو میرے سر پر لگی اور میری آنکھ کھُل گئی۔

"آج کرم نہیں آئی نا اُس کا بہنوئی پچیس سال کے بعد واپس آیا ہے سارے خوش ہیں۔" کسی نے کہا۔

"جانے والے کبھی لوٹ کر تو نہیں آیا کرتے۔" ماں کی آواز آئی۔

"تیرا چاچا واپس نہیں آیا نا!" مودی کی ماں نے کہا۔

"اب چاچا آ بھی جائے تو کیا فائدہ دادی تو رہی نہیں جسے اُس کا انتظار تھا۔ میں کوٹھری میں دادی کے ساتھ ہی سویا کرتی تھی۔ سردی میں جب بھی آنکھ کھُلتی میں جاگ جاتی تو اُسے بیٹھے ہوئے ہی دیکھتی گھٹی گھٹی آواز میں جسے وہ خود ہی سُن سکتی تھی، کہتی امام علی آوے امام علی۔ اُن دِنوں میں سوچتی وہ زور سے کیوں نہیں پکارتی کسے بلاتی ہے۔ دم گھونٹ کر کیوں روتی ہے کسی سے کچھ کہتی کیوں نہیں دن کے وقت چُپ چاپ سائے کی طرح پھرتی رہتی ہے رات کو کیوں جاگتی ہے۔ یہ امام علی کون ہے؟ اُس کا کون ہے؟ کیوں کہ گھر میں اور کسی کو میں نے یہ نام پکارتے کبھی نہیں سُنا۔

بڑے ہو کر دادی کے مرنے کے بعد ہی مجھے پتہ چلا کہ وہ میرا چاچا تھا۔

گاؤں کے سرے پر ایک مسجد ہے دالان در دالان اور مغرب کی طرف حُجروں کی قطار ہے۔ بڑا سا پختہ کنواں جو ڈھاب کے بڑھنے کی وجہ سے تقریباً مُنہ تک بھرا رہتا اور مسجد کے باہر کھُلی زمین پر سایہ کئے ایک تناور بڑ ہے، جس کے تنے کے گرد چبوترے پر مسافر آکر دم لیتے اور گرمیوں کی دوپہروں میں لوگ سوتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہیں اور رونق رہتی ہے مگر مسجد میں میرے نانا دو چار شاگردوں کے ساتھ درس دیتے ہیں۔ پتہ نہیں لوگ زیادہ درس میں شریک کیوں نہیں ہوتے تھے

نانا کو کھانا دینے کے بہانے میں اُس برگد کی چھاؤں میں خُوب کھیلتی پھر جب چھٹیوں میں ہم شہر سے گاؤں آتے تو ان خالی حجروں میں گری ہوئی چھتوں تلے چمگادڑوں کے ڈر سے میں صرف جھانک لیتی یا ستونوں کے گرد بازو ڈال کر خُوب چک پھیریاں لیتی کبھی محرابوں تلے بیٹھ کر منقش چھت کو تکتی اور لکیروں کو دُور تک گنتی چلی جاتی یہاں تک کہ میری نظر گھبرا کر لوٹ آتی۔ نانا اکثر مراقبے میں ہوتے۔ پھر شمّو میں اور مودی کنوئیں کے ٹھیرے ہوئے پانی میں اپنے اپنے چہرے دیکھتے اور ڈھاب سے کنول نکال کر اُن کے ہار پروتے۔ شام پرندوں کے شور میں ڈوبی ہوتی یہاں تک کہ اذان کی آواز بھی دب جاتی۔ اندھیرا بڑا ڈراؤنا ہوتا لوگ کہتے تھے یہاں ایک دیو رہتا ہے مگر مسجدوں میں رہنے والے اُس سے کیوں ڈریں۔ لوگ گاؤں کی طرف جانے کے لئے شام کے بعد دوسرے راستے سے جلتے جو ٹھنڈے کنوئیں کی طرف سے ذرا لمبا تھا مگر آباد تھا۔

"امام علی تم کو مُوطا پڑھے بنا اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے اتنی دُور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ایک بار کہہ دیا تھا کہ یہ روایت کا مسئلہ ہے اور اس کا سمجھنا بغیر فضلِ خداوندی کے محال ہے اور بغیر مطالعہ کے جنون ہے۔ تم لوگ اکتسابِ علم کے ساتھ اکتسابِ فیض کی بھی دُعا کیا کرو۔"

میرے ذہن میں ایک دم چھن سے ہوا برسوں پہلے کی بھُولی ہوئی وہ رات یاد آئی اپنی ماں کی آواز امام علی آ رے امام علی۔

"اچھّا تو یہ ماں کے چاچا ہیں جو نانا کے پاس آگئے ہیں۔" میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی گلیوں میں سے دیوانہ وار دوڑتی ہوئی۔ لوگوں سے ٹکراتی گلی کے پتھروں پر ٹھوکریں کھاتی۔ کھیتوں سے پلٹتے ہوئے لوگوں کے ہلوں تلے روندے جانے سے بمشکل اپنے آپ کو بچاتی اُڑتی ہوئی۔ ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی ماسیاں اور مامیاں مجھے پکارتی ہی رہ گئیں "نشا کی بیٹی کیسے بھاگی جاتی ہے۔" سانس میرے سینے میں سما نہیں رہا تھا۔ باہر کا دروازہ دھڑ سے کھول کر میں جا کر ماں سے لپٹ گئی۔

"ماں۔ ماں" اس کے سوا میرے منہ سے اور کچھ نکل نہیں رہا تھا۔

"ارے خیر تو ہے لڑکی کیا ہوا ہے۔؟" ماں نے مجھے لپٹا لیا۔ "کسی نے مارا ہے کسی شے نے

کانا ہے؟"

"نہیں نہیں" میں نے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہ آئے ہیں" بس۔ نے اٹک اٹک کر کہا

" ارے کون آئے ہیں بول تو سہی " ماں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

" امام علی تمہارے چاچا امام علی۔ وہ ادھر مسجد میں نانا کے پاس بیٹھے ہیں"۔

" ماں کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا، اُس کے ہاتھ میرے بازوؤں سے پھسل کر بے جان سے اُس کے پہلو میں گر گئے جیسے اُس کے اندر خوشی کا سناٹا ہو گیا ہو' جیسے یہ سب سے بڑا بوجھ ہو جو میں نے اُس کے کندھوں پر ایک دم اُلٹ دیا ہو۔

نانی نے زور سے ہنکارا بھرا۔" بھئی کون آیا ہے۔" اُس نے حقے کی نے مُنہ سے نکالی۔

۔ماں ہولے ہولے قدم اٹھاتی نانی کی طرف چلی۔

اب میں سانس سنبھال چکی تھی۔

" وہ امام علی آئے ہیں ماں کے چاچا" میں نے دور کھڑے ہو کر کہا۔

" تجھ سے کس نے کہا ہے۔ کیا بکتی ہے۔" نانی نے زور سے کہا۔

" نانا کے پاس مسجد میں بیٹھے ہیں باتیں کر رہے ہیں امام علی۔" میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

نانی نے سر دائیں بائیں گھماتے ہوئے کہا۔" وہ امام علی ہو ہی نہیں سکتا" پھر میری طرف مڑ کر کہا۔" تجھے کیا پتہ امام علی تیری ماں کا چاچا ہے۔ کون یہ قصے کہتا ہے تجھ سے"؟

" ماں کی دادی راتوں کو روتی اور پکارتی تھیں امام علی آ دے امام علی" میں نے سر اُٹھا کر بڑے حوصلے اور دلیری سے ماں کی طرف دیکھا ماں نے سر جھکا لیا وہ اُپلوں کو توڑ رہی تھی تاکہ اُن پر دال کی ہنڈیا سہج سہج پکے۔

نانی نے کہا" چل بھاگ یہاں سے جانے کہاں سے اتنی باتیں آگئی ہیں اسے۔ نشا اسے کریما یاد کروا یہ سارا دن ٹک کر نہیں بیٹھتی کھیتوں اور باغوں میں گھومتی ہے۔ باتیں سننے اور لوہ لینے کی عادت پڑ گئی تو جائے گی نہیں۔ چل جا تختی لے کر آ اور لکھ۔"

میں مرے مرے قدموں سے اندر گئی کافی دیر کھڑی رہی پھر تختی کو ڈھونڈا اور باہر لا کر اُسے ملتانی مٹی سے پوچا پھر ہل ہل کر اُسے سُکھاتی رہی۔ کلک سے اُس پر الف بے لکھتی رہی مگر سارا وقت میرا جی اس بات میں پڑا تھا کہ آخر امام علی جو ماں کا چاچا تھا کیوں واپس نہیں آسکتا۔ وہ آگیا ہے مسجد میں نانا کے پاس ہے مگر نانی کیوں خفا ہو رہی ہے آخر؟

پھر شام کی نرم ہوائیں کھیتوں پر سے دھان کی خوشبو لائیں ستاروں کے دیئے تیزی سے ایک کے بعد ایک جلنے لگے۔ کام سمیٹ کر ماں اور اُس کی سہیلیاں۔ ماں برکتے کی بہوئیں شادو اور اُس کی بہنیں مولے والی کی طرف چلیں۔ جہاں ٹیلوں پر روز شام کو مٹیاروں کا ہجوم ہوتا تھا۔ بوڑھی عورتیں ایک دوسری سے ملتی تھیں اور بہوؤں کے قصے کہتی تھیں۔

میں نے مودی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُس سے کہا: "میں تجھے ایک بات بتاتی ہوں بڑے رازکی۔ ماں کا چاچا امام علی آگیا ہے اور مسجد میں نانا کے پاس بیٹھا ہے مگر نانی کہتی ہے وہ آ ہی نہیں سکتا۔ اور وہ بھوت نہیں تھا نہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ وہ باتیں کر رہا تھا اور اُن کے پاؤں چھو رہا تھا۔

مودی نے کہا ہو سکتا ہے وہ بھوت ہی ہو تمہارے نانا کے پاس سُنا ہے جن قابو ہیں"۔

"اچھا میں نے حیرت سے کہا بڑے مزے کی بات ہے نانا کے پاس بھوت آتے ہیں"

"اور کیا میری دادی کہتی ہے، امی خورشید کہتی ہے، پھوپھی شادو کہتی ہے سب کو پتہ ہے"۔ مودی نے کانپ کر کہا۔

"نہیں مودی وہ سچ مچ کا امام علی تھا" میرے دل میں عجیب پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔

"تم یہاں ٹھہرو میں اپنی دادی سے پوچھ کر آتی ہوں" وہ ٹیلے پر ناچتی ہوئی عورتوں کے گھیرے سے پرے دوسرے گھیرے کی طرف چلی گئی۔

ستاروں کی مدہم روشنی میں گیت اور پاؤں کے لہریئے غبار کی طرح مولے والی کی مٹی پر گھوم رہے تھے اور مودی کی چھوٹی سی ڈری ہوئی دادی کو پکارتی آواز اسی میلے میں گُم ہوئی لگتی تھی میں نے تھوڑی دیر مودی کا انتظار کیا اور پھر دوسری، کی نلچنے والی لڑکیوں کی ٹولی میں رل مل کر گیت گانے کی کوشش کرنے لگی، جن کے بول مجھے نہیں آتے تھے مگر جو مجھے اپنی جھنکاروں کی وجہ سے اچھے لگتے تھے۔ میٹھے رسیلے جیسے گنے کا رس ہو جو ہاتھوں میں اور منہ پر لگ جاتا ہے جس

کی بُو خواب کی طرح ہوتی ہے بھلائے نہیں بھولتی ساتھ ساتھ چلتی ہے یا پکتے گڑ کی مہک کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے اور جان کو مٹھاس سے بھر دیتی ہے۔

واپس جاتے ہوئے عورتیں ماں سے پوچھ رہی تھیں "نشا تیرا چاچا امام علی سُنا ہے آگیا ہے اور مسجد میں ہے۔"

"اگر چاچا ہوتا تو گھر پیغام آتا" ماں نے ہولے سے کہا۔

"میں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی جب امام علی گیا ہے"۔ ماں برکتے نے کہا تو تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی نشا۔

اندھیرے اور بھیڑ اور غبار میں جو ستاروں کی روشنی میں کم دھندلا تھا۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا جو بہت دُکھی لگ رہی تھی اُس کے قدم آہستہ اُٹھ رہے تھے اور وہ باتوں کے شور میں گم سُم ہو گئی تھی۔ ماں کو اپنی دادی کا گھٹی گھٹی آواز میں رونا اور پکارنا اور امام علی آوے امام علی کہنا یاد آ رہا ہو گا۔ آدمی اکثر کسی قصور کے بنا بھی بہت دکھی ہو جاتا ہے بہت ہی دکھی۔

"ماں نانا کے پاس جن قابو ہیں"؟ کریما کا سبق سُنا کر میں نے پوچھا۔

"تجھے کون یہ سب سناتا ہے تیری نانی ٹھیک ہی کہتی ہیں سارا دن کھیتوں اور باغوں میں گھومتی اور بڑ تلے اکیلی کھیلتی ہے۔ یہ کیا قصّے تُو نے بنا رکھے ہیں۔ ماں خفا نہیں تھی مگر خفا لگتی تھی۔

"پھر وہ امام علی جو نانا کے پاس آئے کون تھے، کیا جن تھے تیرے چاچا نہ تھے، جن کے لئے روتے روتے تیری دادی مرگئی"؟

"کس نے تجھ سے یہ سب کہا۔" ماں نے میرے کندھے پکڑ کر مجھے اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس رات جب تم سب چرخے کات رہی تھیں اور اُسارے میں بچے سو رہے تھے تو میں جاگ رہی تھی۔ میں نے تمہاری سب باتیں سُن لی تھیں۔

ماں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تو تم نے میری بات سُن لی تھی۔" پھر سوچ سوچ کر کہنے لگی "پتہ تو مجھے بھی ٹھیک سے نہیں کہ کیا ہوا مگر سُنا ہے کہ تمہارے نانا اپنے چھوٹے بھائی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے اور اُنھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ کہا تھا اس گھر میں اب کبھی نہ آنا اور چاچا نہیں آئے۔"

"کہیں تو ہوں گے وہ کبھی تو واپس آسکتے ہیں۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں منی کبھی نہیں جو ایک بار لکیر سے نکل گیا تو وہ بس گیا پھر وہ واپس نہیں آسکتا۔" ماں مجھ سے زیادہ اپنے سے بات کر رہی تھی۔ "تمہارے نانا بہت غصہ ور اور بات کے پکے ہیں اور یہ سب امام علی چاچا بھی جانتے ہوں گے اُن کے واپس آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

"مگر وہ کہیں تو ہوں گے۔؟" میں نے پھر ہٹ دھرمی سے کہا۔

ماں نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "دادی اُنھیں پکارتی ہوئی مرگئی۔ روتی روتی چلی گئی۔ سانس بند کر کے وہ گھُٹی گھُٹی آوازیں دیتی جو اُس کے سوا کوئی سُن نہ سکتا۔ اب تو لوگ سب بھول گئے ہیں، اس گھر میں کوئی یہ نام نہیں لیتا، کہیں تو کسی دن نانا کے سامنے یہ نام نہ لے دینا۔"

"تمہارے چاچا نے کیا کیا تھا ماں، جو اُنہیں گھر سے نکال دیا تھا۔" میں نے ماں کے گلے میں جھولتے ہوئے کہا۔

"اُس کا نصیب ہی ایسا تھا کہ وہ گاؤں کا سب سے سجیلا آدمی سب سے جوان اور باہمت آدمی اُس میں سما نہیں سکا۔ کبھی جگہیں سُکڑ جاتی ہیں اور آدمی بڑا ہو جاتا ہے۔ پر تو اپنے سبق میں دھیان لگا بھول گذری باتوں کی ٹوہ لگانے کا فائدہ۔ ٹوہ لگانے والے کو تیرے نانا اچھا نہیں سمجھتے۔"

عجیب تھے نانا بھی مگر میں نے ماں سے کچھ نہ کہا اور کریما یاد کرنے لگی۔

شہر کی اُس بستی میں پانی بھرنے پر موہن سنگھ نوکر تھا۔ پُرانی بستیوں سے دُور اور کارخانوں کے قریب یہ دس بارہ گھر تھے اور درمیان میں بنے پکے کنوئیں کے ساتھ کوٹھڑی میں موہن سنگھ سارا وقت گنگناتا اور اپنی دکنی بولی میں کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ محنتی اور نرم خُو مضبوط کندھوں پر بڑی بڑی بالٹیاں لٹکائے وہ ساری بہوؤں اور بوڑھیوں کے دُکھ سُکھ میں بھی شریک رہتا ہر ڈیوڑھی میں اُس کے جوتے کی چرچر سنی جاتی۔

جن سردیوں کی یہ بات ہے اُس سال موہن سنگھ کے کنوئیں کی جگت پر ایک انوکھی سی رسیلی آواز چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔

"کون ہے وہ تیری" بڑی بوڑھیوں نے اور یہاں تک کہ کسی بات کی بھی ٹوہ نہ لینے والی ماں نے

موہن سنگھ سے پوچھا۔

"میری کون ہوتی جانے کہاں سے آئی ہے بس ایک دن آن کر بیٹھ گئی جگت پری سوتی ہے اور سارا وقت بھجن گاتی ہے۔ کہتی ہے میرا اس جگ میں کوئی نہیں اور میرا جی نہیں پڑتا کہ اُسے دھکا دوں۔"

"اُسے کہیں کسی گھر میں نوکر رکھوا دو"۔ چھوٹی بہو نے کہا۔

"نئیں بہو ماں میرا اس پر اتنا زور بھی نہیں کہ میں اُسے نوکری کرنے کا کہوں اور وہ کرلے اپنا کماتی ہے اور دھرتی تو بھگوان کی ہے"۔

"کیا وہ پاگل ہے"؟ بی بی نے پھر پوچھا۔

کانوں کی لوئیں چھو کر موہن سنگھ نے کہا "وہ باتیں ہی کب کرتی ہے کہ اس سے پوچھوں ہاں آواز کوئل کی سی ہے وہ تو آپ نے سنی ہوگی۔؟ جو کچھ گاتی ہے تو کہتی ہے میں اپنے مُرلی منوہر کو کھوجتی ہوں کنہیا مجھے چھوڑ گئے جانے کہاں نکل گئے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جانے کیا کھوجتی اور کیا دیکھتی ہیں وہ پاگل نہیں ہے بالکل نہیں ہے"۔

جب میں نے اُسے دیکھا تو سفید بالوں کے باوجود وہ نہایت خوب صورت تھی مگر اُس کے جسم میں سے لگتا تھا آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ شعلوں سے بنی ہوئی لگتی تھی۔ نازک سے ہاتھ رنگ میں ڈوبے سفید پاؤں وہ ایسی تصویر تھی جس پر سے وقت گزر گیا ہو۔ پھر اُس نے ہماری باہری چوکھٹ پر آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ رنگوں سے لکیریں کھینچتی اُن کو مٹاتی اور بناتی رہتی مگر پاگل وہ نہیں تھی۔ کبھی گھر کے اندر چلی آتی ہر طرف دیکھتی آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہتی اور پھر آپ ہی آپ باہر نکل جاتی۔ ہم اُس کے یوں آنے اور چلے جانے اور بیٹھے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

برسات اُس سال بہت گھن گرج سے آئی تھی طوفان اور جھکی ہوئی سیاہ گھٹائیں جو گھروں کے اندر گھسی چلی آتیں گاؤں کی طرف جانے والے سارے راستے بند ہو گئے اور ماں بولائی بولائی پھرتی اب کیا ہوگا ارے اُن دو بوڑھے آدمیوں کا کیا ہوگا جن کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ ماں بادلوں کو دیکھ کر ہاتھ ملتی۔

"ماں اگر چاچا امام علی ہوتے تو نانا کا کوئی تو ہوتا، انھوں نے یونہی انھیں گھر سے نکال دیا"۔ میں نے ایک دن بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"تجھے کیا پتہ لڑکی عزت کی خاطر اصولوں کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ محبت کی ایک انتہا ہوتی ہے کہ آدمی بھول نہیں سکتا معاف نہیں کر سکتا بھلا نہیں سکتا۔" ماں بہت ہی دکھی ہو گئی تھی اور میں نے سوچا اب میں ہرگز چاچا امام علی کا نام نہیں لوں گی۔ مگر ایسی برسات میں کون مسجد تک اُن کا کھانا لے کر جاتا ہو گا؟

کوئی ہو تو سہارا رہتا ہے یہ سوچتے ہوئے یونہی میں نے باہر کا دروازہ کھولا تو دروازے کے ساتھ لپٹی بیل کی طرح وہ کنہیا کی رادھا کواڑ کے ساتھ ساتھ اندر جھک گئی۔

"آؤ رادھے آؤ کئی دن سے تم دکھائی نہیں پڑیں۔"

"برسات میں کون گیت گا سکتا ہے بی بی بڑا دم گھونٹنے والا وقت ہوتا ہے، گاؤں کے راستے بند ہو جاتے ہیں کہیں کوئی آجا نہیں سکتا، سانس مشکل سے آتا جاتا ہے۔"

"تمہارا کونسا گاؤں ہے۔؟" میں نے فرش پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تھا ایک۔ جو میرا ہو سکتا تھا مگر نہیں ہوا۔" اُس نے بڑے دُکھ سے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکا تمہارا عجیب بات کہتی ہو گاؤں میں جا کر رہو تو گاؤں اپنا ہو ورنہ نہیں۔" میں نے جوش سے کہا۔ میرا جی چاہتا تھا وہ مجھ سے باتیں کرے مجھے بتلائے وہ کون تھی اور ایسی بہت سی باتیں جو کہانیوں کی طرح اُس کے گرد پھیلی تھیں۔ نانی نے ٹھیک کہا تھا وہ لینے کی میری عادت اب پکی ہو گئی تھی۔

"گاؤں نے مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ باہر پھینک دیا جیسے میں کوڑے کا ڈھیر تھی۔ اور اس میں کسی کا بھی کوئی دوش نہ تھا نہ اُس کا اور نہ میرا۔" اُس نے اپنے رنگے ہوئے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھا۔

"وہ دوسرا کون تھا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"دوسرا وہی جو دوسرا نہیں تھا۔ جو کبھی دوسرا نہیں تھا۔" اُس نے سر گھٹنوں پر رکھا اپنا سیندور کی دھار بالوں میں گہری تھی۔

ماں نے پوچھا "یہ یوں کیوں بیٹھی ہے۔"

"کہتی ہے اس کا کوئی گاؤں تھا۔ پتہ نہیں کون گاؤں تھا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بی بی جب گاؤں نے مجھے پھیر ہی دیا تو اُس کا کیا نام ہوگا، دنیا کا کوئی کونا۔" اُس نے سر اُٹھایا تو آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں وہ جانے کے لیے اُٹھی۔

"بیٹھو رادھا۔" ماں نے کہا۔ "چلو اور باتیں کریں۔"

وہ ہنسی ہے تو اُس کے دانتوں کی لڑیاں چمکیں باریک گلابی ہونٹ ہنسے سارا چہرہ ایک دم کھلا جیسے چاندنی میں شبنم بھرا پھول۔

"بھلا کیا باتیں کروگی؟ کیا کوئی بات مجھے خوش کرسکتی ہے وہ زندگی لوٹا سکتی ہے۔ جب وہ دن پھیرے نہیں جاسکتے تو بے فکری کے اُس کے ساتھ گزارے دن تو پرماتما بھی نہیں لوٹا سکتا۔ نہیں پرماتما بھی نہیں سمجھیں۔" اور اُس نے ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کے گرد گھیرا باندھ لیا جیسے سخت غصّے میں ہو اور لڑنے کی تیاری کر رہی ہو۔

"صرف تم ہی دُکھیا نہیں؟ رادھا دنیا میں اور لوگ بھی ہیں پریشان اور غموں میں ڈوبے۔" ماں نے کہا۔

پھر ہم تینوں نے طوفان کی گرج کو سُنا ہوا اپنی بھیگی اوڑھنی کو جھٹکاتی تیزی سے اندر آئی اور سب کو گیلا کرگئی۔

"میں چلوں گی۔" رادھا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسے میں تو کوئی کسی دشمن کو بھی گھر سے جانے کا نہیں کہتا۔ طوفان غصہ ور دیو کی طرح پھنکار رہا ہے۔ موہن سنگھ کے کنوئیں تک جاتے جاتے کہیں تم اُڑ ہی نہ جاؤ اتنی دھان پان ہو تم۔"

رادھا مُنہ کھولے آنکھیں کھولے حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی اور لگتا تھا سانس اُس کے گلے میں اٹک جائے گی پھر وہ دھم سے فرش پر یوں بیٹھی جیسے اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانا چاہتی ہو۔

"تم کون ہو۔" اُس نے ماں سے پوچھا۔ اور موہن سنگھ کہتا تھا وہ پاگل نہ تھی۔ وہ کیا تھی کیوں اتنی بے چین تھی۔ پھر اُس نے اپنے بالوں پر سے پلّو کو کھینچ کر ہٹا یا۔ "یہ دیکھتی ہو یہ سُہاگ رنگ میں اب بھی اُس کی راہ دیکھتی ہوں پتہ نہیں اُسے میں یاد ہوں کہ نہیں مگر مجھے لمحہ لمحہ رتی رتی سب یاد ہے۔ اُس کی نگاہوں کے لہریئے اُس کی سجیلی آواز وردی میں اُس کا دمکتا ہوا چہرہ چنچل، ہنسوڑ، مدھ بھری آنکھوں والا۔

میں اُس سے ملنے سے پہلے چمپا تھی بے فکر آزاد باپو کی پان کی دُکان کو چلانے والی۔ سگرٹ کی پنی میں لپیٹ کر جب پہلے پہل میں نے پان اُسے دیا تو وہ ہنسا تھا اور مجھے اچھا لگا تھا۔

"یہ تو کوئی بُری بات نہ تھی۔" ماں نے کچھ کہنے کے لئے کہا۔

"ارے یہ بُری بات ہی نہ تھی۔" وہ بہت خفا ہو گئی۔ "کوئی کسی کے جی کو اچھا لگے تو بہت بُرا ہوتا ہے بی بی اچھا لگنا بہت بُرا ہوتا ہے مگر اس میں اُس کا کیا دوش تھا۔ میں نے اُس سے کہا تھا تم روز آیا کرو تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ پھر اُس نے وہ راستہ چھوڑ دیا۔ میں پاگلوں کی طرح ہر آنے والے کی طرف دیکھتی میرا رنگ زرد ہو گیا۔ ایک آگ تھی جس سے میرے دن اور رات جلتے تھے میں باتیں بُھولنے لگی، گاہکوں کی بات دھیان سے نہ سُنتی جیسے میرا سارا جسم چتا بن گیا ہو، نیند اور بھوک مجھ سے بھاگ گئیں میرے ماں نہیں تھی گھر پر میرے اور باپو کے سوا کوئی نہ تھا، میرا سُننے والا کوئی نہ تھا کس سے اپنا دُکھ کہتی۔ ہائے میں تو کہیں کی نہ رہی تھی کچھ کر نہ سکتی تھی!

پھر ایک دن میں نے اُسے دیکھا۔ میں نے کہا "میں تمہارے ساتھ جاؤں گی میرا من تمہارے بنا نہیں لگتا۔ میرا من کہیں بھی نہیں لگتا۔ تم مجھے نہیں لے گئے تو میں جان دے دوں گی تمہیں نہیں دیکھتی تو جیوں گی کیسے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

اُس نے کہا۔ "رادھا تمہارے اور میرے درمیان یہ سب اتنا آسان نہیں میرے بھائی ہیں، ماں ہے اور بہت سی گھاٹیاں ہیں اڑچنیں ہیں۔ تم میرا پیچھا مت کرو سکھی رہو گی۔ وقت تمہاری مدد کرے گا، مجھے بھول جاؤ گی، کوئی کسی کو ایک سی شدت سے نہیں چاہا کرتا۔ تم میری زندگی میں مت آؤ کوشش کرو اور بھول جاؤ اسی میں سکھ ہے۔"

مجھے سُکھ نہیں چاہیئے تھا۔ مجھے سُکھ کی کب تلاش تھی میں تو بس اُسے دیکھتے رہنا چاہتی تھی اُس کے قدموں کی دُھول بن کر جینا چاہتی تھی۔

"رادھا مجھے بھی تو جینے کا حق ہے اور تمہارے ساتھ زندگی ناممکن ہے بہت ہی ناممکن۔" اُس نے کہا تھا مگر میں اُس کے پاؤں سے لپٹی رہی۔ میں سمجھنے اور سوچنے کی منزلوں سے آگے نکل گئی تھی مجھے اُس جلن سے بچنا تھا، جو اُس کے بنا میرے جی کو لپیٹ لیتی تھی میں اُس کے پیچھے چلی آئی ہائے اب یاد آتا ہے وہ کتنا دُکھی تھا مگر میں تو دیوانی تھی میں نے اُسے دیکھا ہی کب تھا میرا اپنا آپ ہی

میرے لئے سب کچھ تھا۔ راستے میں اُس نے مجھے ایک چادر خرید کر دی اور مسجد میں لے گیا۔ پھر ہم اسٹیشن آئے اور گاڑی میں بٹھا کر وہ بولا یا بولا یا بڑا گھبرایا ہوا سا جیسے ڈھے گیا ہو پلیٹ فارم پر پھرتا رہا۔ اور اُس گھڑی خوف سے میں کانپ رہی تھی۔ ہائے میں نے اُسے کتنا دُکھی کر دیا تھا۔۔ گاؤں کا راستہ لمبا تھا وہ خیالوں میں گم تھا نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا نہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا پتہ نہیں وہ کتنا خفا تھا جانے وہ کیوں اتنا خفا تھا؟

جب ہم نہر کے ساتھ سے گاؤں کی طرف اُترے ہیں تو پہلی بار اُس نے کہا "رادھا اب تم میری بیوی ہو میری عزت ہو اس چادر کو اچھی طرح لپیٹ لو تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی سارے سوالوں کے جواب میں دوں گا۔ تم چپ رہو گی مگر گھبرانا نہیں میں نمٹ لوں گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں مصیبتیں آئیں گی تو خود ہی لوٹ جائیں گی۔"

میرے جی کو بہت ڈھارس ہوئی وہ کتنا نرم مزاج تھا اور اجنبی ہونے پر بھی مجھے تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا دل ٹھہرے ہوئے پانی پر تیرتے کنول کی طرح کھلا ہوا اور دھوپ میں ڈولتا ہوا پیار کے سمندروں پر بہتا ہوا۔

گاؤں کے جس آنگن میں مجھے لے جایا گیا وہ خوب بڑا تھا۔ گھر میں ساس اور بہو کے سوا کوئی نہ تھا۔ ساس نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بٹھایا تو میرے بیٹے کے لئے آئی ہے نا مجھے سدا پیاری رہے گی۔ مگر دیکھ ابھی باہر مت نکلنا کسی سے کچھ مت کہنا جو بہوئیں اور بیٹیاں تم سے ملنے آئیں اُن سے زیادہ باتیں نہ کرنا۔ پھر اُس نے مجھے گہنے لا کر پہنائے ساڑھی اتروا کر گھاگرا پہنایا بالوں میں سونے کے پھول پروئے ماتھے پر ٹیکا لٹکایا۔ میں چمپا سے رادھا اور رادھا سے دلہن بن گئی۔

دس دن جو میں نے اُس گھر میں کاٹے میری زندگی کے درخت پر پھول ہیں۔ ساس مجھے کتنا چاہتی تھی اُس کی بھابی مجھے کتنا چاہتی تھی۔ گاؤں کی بہوئیں مجھے کتنا چاہتی تھیں اور وہ مجھ سے بندھا تھا میں اُس کی حفاظت میں تھی اپنا بوجھ اُس کے کندھوں پر رکھ کر میں کتنی سکھی ہو گئی تھی اور خوشی میں مکمل۔ ہائے وہ چاہتوں سے بھرا گھر خواب میں بنے محل کی طرح آنکھ کھلنے پر مجھ سے چھن گیا۔ جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا وہ اُسے اور مجھے سپاہیوں کے گھیرے میں شہر لے آئے۔ باپو نے میرے آگے ہاتھ جوڑے میرے پاؤں پر پگڑی رکھی انجانے لوگوں نے مجھے سمجھایا۔ مگر عدالت میں میں نے بیان دیا

کہ وہ مجھے اچھا لگتا تھا میں اُس کی بیوی تھی باپو سے میرا کوئی ناتہ نہ تھا۔ میں اُس گھر کی بہو تھی اور خوش تھی۔ میں خود اس کے پیچھے گئی تھی میں اُس کے بنا جی نہیں سکتی تھی۔ مگر میرے اس بیان سے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست دنگا ہوا کئی لوگ مارے گئے کئی جگہ آگ لگی پوری زندگی اُلٹ پلٹ ہوگئی۔ میں جو ایک معمولی پنواڑن تھی کہانیوں کی راج کماری بن گئی۔

مقدمہ چلا اور اُسے سزا ہوگئی۔ مجھے ایک دھرم شالہ میں رہنے کے لئے بھجوا دیا گیا۔ مگر میں وہاں سے بھاگ آئی۔ جیل کے گرد اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں نے چکر لگائے۔ دروازوں کے ساتھ سر کو ٹکرایا۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اُن دنوں میں سچ مچ دیوانی ہوگئی اور پھر میں گاؤں گئی۔

ایسی ہی برسات تھی ایسے ہی دن تھے سارے راستے بند تھے مجھے اُس آنگن تک پہنچنا تھا جس میں اُس کے پیچھے چاہت ہی چاہت ملی تھی۔ اُس کواڑ کو پکڑ کر میں بھکارن کی طرح کھڑی رہی کھڑی ہی رہی۔ اُس کی ماں نے میری طرف دیکھا تک نہیں جیسے میں وہاں تھی ہی نہیں میرا اس گھر سے کیا ناتا تھا؟

بارش میں بھیگتے دیکھ کر اُس کی بھابی نے کہا جو تو نے کرنا تھا سو کر دیا یہ گھر برباد ہوگیا۔ وہ اب کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آسکتا بھلا تو کیوں اپنا وقت برباد کر رہی ہے۔ جہاں سے آئی ہے وہیں لوٹ جا۔ اس گاؤں میں جب اُس کے لئے جگہ نہیں تو تو کہاں رہ سکتی ہے۔

وہ شام میری زندگی کی آخری شام تھی جب میں نے بادلوں کی سُرخی میں اُس آنگن سے اُٹھتا اُپلوں کا نیلا دھواں دیکھا اور چڑیوں کو اولوں کی طرح برس کر بیٹھتے اور ہوا کے جھونکوں کی طرح اُٹھتے دیکھا۔ وہی ایک آنگن جو میرا دل تھا وہ ایک آنگن پھر اندھیرے میں ڈوب گیا اور میں گم ہوگئی گم ہی ہوگئی۔

جب وہ جیل سے چھُٹا ہے تو جانے کہاں گیا۔ میں نے ساری عمر ایک ایک چہرے کو تکتے گزاری ہے غور سے دیکھتے اُسے کھوجتے مگر وہ تو دنیا کی بھیڑ میں رل مل گیا مجھے کہیں دکھائی نہیں پڑا۔

اور میں نہ پنواڑن چمپا رہی نہ اُس کی رادھا نہ ساس کی پیاری، میں کون ہوں بھلا میں کون ہوں اُس نے چوڑیوں سے بھری باہنوں کو پھیلایا اور چاروں طرف دیکھا۔

ماں نے اُٹھ کر رادھا کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دونوں چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

"گاؤں سے جو پہلی خبر آئی وہ اسی برسات میں مکمل تباہی کی تھی۔ نانا کا مکان ڈھے گیا تھا۔ نانی مامے دلاور کے گھر میں تھیں نانا مسجد میں بیمار تھے۔ ماں تڑپ تڑپ کر رو دی اور جب راہ ذرا خشک ہوئی پانی اُترا تو ہم گاؤں آئے۔

ہر طرف ویرانی اور اُداسی تھی لوگ اپنے گھر بڑے اَن منے دل سے اٹھا رہے تھے اور تھکے ہوئے ہارے ہوئے لگتے تھے۔ نانا کا گھر بنانے والا کوئی نہ تھا۔ ماں مٹی کے ڈھیروں کے پاس کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ نانی نے کہا "نشا مقدر سے کون لڑ سکتا ہے مگر کوئی صورت نکل آئے گی پریشان نہ ہو۔" مامے دلاور کا گھر مجھے پرایا پرایا سا لگا گھٹا گھٹا سا میں سونے کے لئے مودی کی طرف چلی گئی جہاں رات میا نے انھیں چاچا امام علی کی بیوی کی باتیں بتائیں ماں برکتے اور مودی کی ماں بھی ہمارے پاس بیٹھی رہیں۔

"بڑی بد قسمت لڑکی تھی وہ ساری زندگی اُس پرچھائیں کے لئے گزار دی۔ مانگ میں رنگ سجائے پھرتی ہے اور اُس کی راہ دیکھتی ہے، جو کبھی اُس کی راہوں سے نہیں گزرے گا۔"

"مگر آخر وہ کیوں نہیں آسکتا میری ماں کا چاچا امام علی۔" میں نے بڑے دُکھ سے پوچھا۔

"تمہارے نانا کا مزاج بالکل دوسرا ہے وہ قرآن پاک تو سمجھ سکتے ہیں مگر دل کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ امام علی بڑے دل گُردے کا جوان تھا ایک لڑکی کی بات پر اُس نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ مقدمے کے بعد تمہارے نانا نے اُسے گھر آنے سے منع کر دیا۔ جانے اب کہاں ہو گا۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں نہ کہیں تو ہو گا ہی۔" ماں برکتے بڑے افسوس سے یہ سب کہہ رہی تھی ہم چُپ چاپ بیٹھی رہیں، یہاں تک کہ گلی میں ہل لے کر جانے والے لوگوں کے قدموں کی چاپیں اُبھریں پھر مُرغ اذانیں دینے لگے چڑیاں چوں چوں کر کے درختوں پر جاگیں کُتے بھونکے اور سویرا ہونے لگا۔

پتہ نہیں دل کی بات کبھی کسی کی سمجھ میں آتی بھی ہے کہ نہیں اور مقدر بنانے والا جانے کیا بناتا اور کیوں بناتا ہے۔ دیوانگی اور فرزانگی میں کیا باریک فرق ہے۔ نانا ان باتوں کا جواب دے سکتے ہیں وہ مسائل کا حل جانتے ہیں مگر دل کی بات کیا سمجھیں گے کیا جانیں گے؟

نیا دور
کراچی
۴۳، ۴۴
قیمت تین روپے
شائع کردہ:۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

جمیلہ ہاشمی

اکیلا پھول

دریا کے ساتھ ساتھ چلتی یہ سڑک پہاڑوں کے دامن سے گزرتی اندھیرے میں ڈوبتی ہوئی لگتی ہے۔ دن کی روشنی بادلوں کی لالی میں بدل گئی ہے اور پانی میں گھلی سرخی شام کو لہو رنگ بنا دیتی ہے۔ لہریں اور آسمان کا رنگ اور مغرب کی طرف اکیلے تارے کی چمک ایک بے نام اداسی کے رشتے میں بندھے ہیں۔ سرکنڈوں کے جھنڈ میں رنگ برنگ چڑیاں بسیرا کرتی شور مچاتی ہیں اور ہوا کی سرسراہٹ میں ملی یہ آوازیں نیلے پن کا ایک تانا بانا سا بننے لگتی ہیں۔ پرندوں کے جھنڈ اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے ہیں اور ایک پُرہول سناٹا پتھروں اور دریا۔ سڑک پر اور فضا میں گونجتا ہے بہتا چلا جاتا ہے۔ سالوں کی طرف دیکھتے ہوئے دم گھٹنے لگا ہے رات سڑک کے کنارے کی جھاڑیوں اور سرخ پھولوں پانی اور ان ٹوٹی ہوئی برجیوں سے نکل رہی ہے جس کے نیچے سے دریا جانے کتنے زمانوں بہا ہے اور نکلا چلا گیا ہے۔ دم گھونٹنے والی خوشبوئیں آوارہ و پریشان خیالوں کی طرح ہر طرف سے یورش کر رہی ہیں۔ جنگل کی باس اندھیرے میں ملتی گھات سے نکل کر حملہ کرنے والے ڈاکو کی طرح ہے عین میں تمہاری خوشبو کی طرح عطیہ بیگم جو اچانک کہیں سے نکلتی اور مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ تمہاری شخصیت یہی باس تھی عطیہ بیگم جو مجھے آج تک مقید کئے ہوئے ہے اور مغرب میں اکیلے تارے کی طرح تمہارا وجود۔ یہ تمہارے وجود کا المیہ تھا عطیہ بیگم جو آدمی کو بے بس کر دیتا تھا اور تمہارا دیکھنے اور دیکھتے رہنے کا انداز جیسے دریا کے کنارے کی گھاس میں اکیلا پھول ہو کر جھانکے اور اپنے اکیلے پن کا احساس دلائے اور پھر بے چارگی کا لبادہ اوڑھے تمہاری تابناک

مسکراہٹ۔

یہی مسکراہٹ جس کے لئے میں گذر گیا عطیہ بیگم۔ تمہاری تابانی جو پلکوں کے نیچے سے نکل کر تمہارے چہرے پر پھیلتی تھی۔ میں نے ہمیشہ تم سے کہا تھا اور مجھے یہ احساس تھا کہ میں تمہاری شخصیت سے مرعوب ہو گیا ہوں غلط تھا میں نے تمہاری ہمت اور تمہارے باوقار انداز سے ہار نہیں مانی تھی۔ عطیہ بی بی یہ صرف تمہاری مسکراہٹ تھی جو کلی پر پھول بنتے ہیں گزرنے والی کیفیت کی طرح ہے اس میں حزن و الم کی ایک ایسی نسبت ہے جس کو تم لفظوں کے پیمانے میں نہیں ناپ سکتے اور پھر تم خود تشنۂ مضراب ساز کی طرح ہمیشہ منتظر۔ مجھے لگتا ہے تم قدیم دیومالا میں آسمانی قوتوں کی مظہر ہو۔ میرے اور اپنے المیہ میں اہم کردار ادا کرنے والی۔

زندگی کی ساری شامیں رنگ و نور نغمہ و کیف نہیں ہوتیں مگر ایسی شامیں جن میں کچھ ہونے والا ہو دل کو بری طرح دھڑکاتی ہیں جیسے کوئی ان جانی مصیبت نازل ہونے والی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔ اور اس شام بھی یہی ہوا تھا دفتر سے گھر آیا ہوں تو میرا جی اچھا نہیں تھا۔ میں باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ آج کی طرح سناٹے کی ایک بجتی ہوئی نوبت تھی جو رہ رہ کر دل کے ویرانے میں گونجتی تھی۔ اس محفل میں میری شرکت ضروری بھی تھی اور اس لئے جب میں دیر سے پہنچا ہوں تو سازندے اپنے ساز ملائے ہوئے تھے لوگ منتظر تھے۔ اگلی صفوں میں میرے نام کی کرسی خالی نہیں تھی۔ ہولے ہولے رات بھیگتی گئی۔ آوازیں جادو بھری وادی سے آنے والی صداؤں کی طرح آدمی کے اندر سوئی تانوں کو جگانے لگیں وہ یادگار رات جب لگ رہا تھا زمین و آسمان وجد میں آئے ہوئے ہیں ہر شے خاموش ہے اور چپ چاپ منتظر ہے۔ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا لگتا تھا۔ تم سمندر کے سامنے اپنے آپ کو جیسے بے بس اور حقیر ذرہ محسوس کرتے ہو ویسے ہی موسیقی میں اپنے آپ کو ناچیز اور فنا ہوتا پاتے ہو۔ لے اور سُر نے میں بول اور دنیا کی خوبصورتی بہتی ہوئی شوق بنتی ہوئی اور پھر یوں لگتا تھا ساز رد میں صدائیں سب مل کر بہہ رہے ہیں ایک دریا تھا جوش و روانی میں مستی کو سیال بناتا ہوا اور اپنے ساتھ

خس وخاشاک کی طرح تمام تمناؤں اور آرزوؤں کو بہا کرلے جاتا ہو امیں آنکھیں بند کئے تھا اور گانے والوں کے ہاتھوں کی لذت اور بھاؤ بتانے کے انداز سے بے خبر اس گھڑی میں دیوتا بنا ہوا تھا اور خیال کی ساری کثافتیں اور آلودگیاں دُھل چکی تھیں اپنے نکھرے ہوئے باطن کے ساتھ جب میں نے تمہیں دیکھا ہے تو تمہاری اس المیہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے یونانی دیومالا کا کوئی کردار لگیں۔

میں نے پوچھا تھا "تمہیں کہاں جانا ہے بی بی کہئے تو میں پہنچا آؤں۔"

"مجھے بہت دُور جانا ہے میری منزل قریب نہیں ہے' آپ کو ناحق تکلیف ہوگی۔"

میں نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا "میری تکلیف کا خیال نہ کریں آخر کسی طرح تو آپ کو پہنچنا ہوگا ہی نا۔"

تم نے گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اجنبی آدمی سے تم نے کبھی بات ہی نہ کی ہو۔ اور میں نے سوچا اگر تم ایک دو سال کم کی ہوتیں تو میری نوری کے برابر ہوتیں۔ مجھے اپنی بیٹی میں اور تم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا اور خدا گواہ ہے عطیہ بیگم تم جو میری ہستی کو اپنی روانی میں خس وخاشاک کی طرح بہانا چاہتی تھیں اگر تم کو میں نے نوری کی طرح کم عقل اور بے بس نہ جانا ہوتا تم سے تمہاری حفاظت نہ کی ہوتی اپنے سے تمہیں نہ بچایا ہوتا تو آج میں تمہاری اس مسکراہٹ کی بھینٹ نہ ہوتا تمہیں پاکر میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں مدتوں بیمار رہا ہوں اور اب روبصحت ہو کر پہلی بار ہواؤں کی نرمی اور رنگینیوں کو اپنے گرد محسوس کر رہا ہوں جیسے تم رات کا راگ ہو۔ اور میری ہستی پر سے بہہ رہی ہو اور بے نام خوشبو کی طرح تم نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تم چاندنی بن کر میرے سارے وجود پر پھیل گئیں مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔

تمہاری منزل آگئی تو تم نے پچھلی سیٹ پر سے اتر کر دروازہ بند کردیا اور بنا شکریہ کا ایک لفظ کہے اندر چلی گئیں۔ میں حیران تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ شاید اتنی کم عمری میں ایسی باتوں کا شعور نہیں ہوتا جی کو تسلی دی اور گھر چلا آیا ساری رات خواب

اور بیداری کی ایک عجیب سی حالت تھی جو مجھ پہ طاری رہی۔ تم موٹر میں اپنی جو خوشبو چھوڑ گئیں وہ مجھے پریشان کرتی رہی اور ساتھ ہی ٹرینیٹی کی تانیں جن پہ روح جھوم جھوم گئی تھی دماغ میں گونجا کیں۔

چار دن بعد جب میں دورے سے واپس آیا تو اپنی میز پر میں تے اجنبی تحریر میں جو مائل بہ پختگی تھی ایک خط اپنی میز پر پڑا دیکھا۔ آج بھی معلوم نہیں پڑتا شاید میں کبھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکوں گا کہ میں جس نے ایسے سینکڑوں خط اپنی میز پر دیکھے تھے۔ جنہیں کو کھولا تھا اور جن کے جواب لکھے تھے ایک خط کو پا کر کیوں ایسا بے قرار ہو گیا تھا۔ کھولنے سے پہلے میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی جیسے کوئی ان دیکھا ان جانا خوف ہو۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے جان پڑے تم دماغ کے پردوں پہ جانے کیسے آگئیں، یوں جیسے غلطی سے پردہ سیمیں پر کوئی غلط ریل چل جائے اور الٹے سیدھے عکس ظاہر ہوں اور مشین چلانے والا جی میں شرمندہ سا جلدی سے مشین بند کر دے۔ وہ لڑکی جس کو شکریہ تک ادا کرنے کا شعور نہیں۔ بھلا وہ کیوں لکھے گی۔ مگر میں نے اس خط کو اسی طرح رہنے دیا۔ اور کلرک سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ آدمی کئی ایسے کام کرتا ہے جس کی خود اسے بھی سمجھ نہیں آتی اس خط کو نہ کھولنے کی بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی مگر میں آنے والے لمحے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔

بغیر القاب کے بنا خطاب کے لکھا تھا۔

"تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

شکریہ

عطیہ بیگم

"لاحول ولاقوۃ" میں نے خط کو پھاڑتے ہوئے کہا۔ کیا بے وقوف سی لڑکی ہے بھلا یہ طریقہ شکریہ ادا کرنے کا کیا ہے اگر گھر کے دروازے پر مجھ سے کہہ دیتی تو لکھنے کی کیا ضرورت تھی مگر لڑکیاں اس عمر میں عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہیں۔ لڑکیاں بھی اور لڑکے بھی عمر کا یہ دور جس سے ان دنوں تم گذر رہی تھیں ایسا ہی تھا۔ شعر کے ٹکڑے

کو بھی میں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ کبھی کا پڑا ہوا یہ ٹکڑا تمہارے ذہن میں ہوگا خواہ مخواہ علمیت جتانے کے لئے تم نے لکھ دیا ہوگا۔ اپنے دل کی دھڑکن پر اور اپنی بے وقوفی پر مجھے بہت ہنسی آئی۔ اس دن میرا موڈ بہت خوشگوار رہا۔ گھر آکر میں نے نوری کو بہت غور سے دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ میری بیٹی بھی ایسی ہی حماقتیں کرتی ہو۔ کم از کم اس دن تو تمہارے ایک چھوٹے سے نوٹ کو میں نے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی جواب دینا ضروری سمجھا۔ گو تمہارا پتہ اس میں لکھا ہوا صاف موجود تھا بھلا میں عمر کے اس دور میں ذرا ذرا سی لڑکیوں کی حماقتوں پر غور کس طرح سے کر سکتا تھا، دنیا کے اور کام تھے۔ لکھنا پڑھنا ملنا ملانا، بیوی بچے میری اپنی پوسٹ مجھے بھلا کس شے کی کمی تھی۔ کلب دوست احباب۔

دو دن بعد پھر ایک اسی طرح کا نوٹ میری میز پر رکھا تھا لکھا تھا

"وال وہ بغرور غرور و ناز"

میں نے جھنجھلا کر کاغذ کو سینکڑوں پرزوں میں پھاڑا اور سوچتا رہا۔ یہ لڑکی کوئی سرپھری اور دیوانی معلوم پڑتی ہے بھلا میں اتنا مصروف انسان اس آنکھ مچولی کے لئے وقت کہاں سے لاؤں اور اگر وقت ہو بھی تو اس چکر میں کیوں پڑوں۔ پھر میں نے سوچا کم سن ہے اس کے شکریہ کرنے کا میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا نہ اس لئے اس نے غالب کے اس مصرعے کے ذریعہ مجھ سے گلہ کیا ہے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے بھلا۔ ایک کونے میں تمہیں فون نمبر بھی لکھا تھا۔

مگر میں نے دو دن اور نہ خط لکھا اور نہ فون کیا۔ عام طور پر میں نہ ایسا سست ہوں اور نہ ہی مغرور۔ لڑکیوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کروانے کی اپنی طرف سے میں نے بہت کم کوشش کی ہے اگر کروں بھی تو دلچسپی قائم رکھنے کی خاطر کو حد سے تجاوز نہیں کرتا مگر پھر بھی واجبی التفات کا قائل ہوں۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے تمہاری مسکراہٹ یاد آئی تمہارا سراپا اور دوپٹے سے ڈھکا تمہارا سر تمہاری جھکی ہوئی جھالر کی سی لمبی سیاہ پلکیں اور تمہارا وہ سہما سہما انداز یاد آیا۔ اور پھر میں نے سوچا کہ تم

ایسی بے بس جو اس رات لگ رہی تھیں۔ اصل میں کچھ اور ہو۔ تمہاری صورت کی بس گنی چنی لڑکیاں ہی سارے شہر میں ہو سکتی ہیں۔ پھر تم نے یہ نوازش و کرم کیوں شروع کیا سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کئی بار میں نے نمبر ملایا اور پھر فوراً ارادہ بدل دیا۔ یہ بات نہیں کہ میں تم کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتا تھا۔ یونہی جانے کیوں جی نہیں چاہتا تھا۔ کہ میں بات کروں پتہ نہیں کیا تھا جو راہ میں حائل تھا میں مشکل پسند بھی نہیں ہوں اور لڑکیوں کا تعاقب کرنا میری عادت بھی نہیں پھر بھی تمہیں فون کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ بھلا میں کیا کہوں گا یہ کہ آپ کے دو نوٹ ملے اور میں نے جواب نہیں دیا۔ بنا گناہ کے یہ عذر گناہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر میں نے فون نہیں کیا مگر وہ ساری شام عجیب طرح بے کلی میں گزری۔ سونے کے لئے لیٹا ہوں تو خیال ہوا اب تو تم سو گئی ہو گی۔

دوسری صبح میں دفتر کے کاموں میں لگا تھا کہ تمہارا نوٹ پھر آیا۔ اب میں اس یک طرفہ خط و کتابت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ زیر لب مسکراہٹ سے میں نے خط لیا لکھا تھا۔

"قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں۔"

چند لمحوں تک میں سن بیٹھا رہا اس خط میں نہ پتہ تھا اور نہ ٹیلی فون نمبر۔ پہلے والا نوٹ میں پھاڑ چکا تھا اس لئے اب کیا ہو سکتا تھا۔ سارا دن میں بیکار ہی فون کا انتظار کرتا رہا۔ شاید تم کہیں سے فون کرو۔ پھر میں سوچا یہ لڑکی مجھ سے محض کھیل رہی ہے اگلے ایک ہفتہ نہ تمہارا کوئی نوٹ ہی آیا اور نہ ہی فون۔ میں تمہارا فون نمبر اور پتہ یاد کرنے کی کوشش کرتا مگر کچھ یاد نہیں آیا۔ جھنجھلاہٹ اور عجیب بے چارگی کا احساس ہوا۔ رات کو سونے کی کوشش کرتا تو نیند نہ آتی۔ بیوی نے پوچھا "کیا ہے بے چین کیوں ہو کیا کوئی دفتری پریشانی ہے۔"

"نہیں بھئی کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے قطعاً اس کی ہمدردی کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ ذرا سا غصہ مجھے آیا اس پر نہیں اپنے آپ پر کہ ایک ذرا سی لڑکی نے

اپنی چوری پکڑی ہے تو شرمندگی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ حالت یہ ہو گئی کہ فون کی گھنٹی بجی اور میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں مایوس ہو کر تمہارا وجود بھولتا جا رہا تھا تم نے فون کیا مجھے خیال تک نہیں تھا کہ یہ تم ہو گی۔ میں نے رسیور اٹھایا ہے تو تم نے کہا تھا۔

"آپ کو لکھنا نہیں آتا کیا" تمہاری آواز میں عجیب طرح کی ملائمیت تھی الم سے بھری ہوئی اور رنجیدہ کرنے والی۔ میں نے کچھ لمحوں تک جواب نہیں دیا۔ میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ پھر میں نے کہا "میں مصروف ہوں بہتر ہو گا اگر آپ پندرہ منٹ بعد فون کریں۔

وہ سارا دن فون کا انتظار کرتا رہا دفتر میں دیر تک بیٹھا رہا یہ سوچ کر کہ شاید تم فون کرو۔ مضمحل سا اور اداس اداس گھر لوٹا۔ شام کو بادل تھے اور خاص چہل پہل تھی، رونق تھی اور دنیا بڑی حسین لگ رہی تھی۔ بچے مُصر ہوئے کہ انہیں سیر کرا لاؤں۔ بیوی نے کہا کہ کئی دنوں سے تم اتنے اداس ہو رہے ہو چلو آج باہر چلیں گھوم بھی آئیں گے اور مجھے ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے وہاں سے ہوتے ہوئے آئیں گے۔ با دل نخواستہ سب کو موٹر میں لاد کر چلا۔

جن صاحب کے ہاں جانا تھا وہاں کوئی پارٹی ہو رہی تھی۔ بہت لوگ جمع تھے صاحب خانہ مصروف تھیں ان کی لڑکی باہر آئی۔ تم میں اتنی ملتی ہوئی کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ جب اس نے کہا "انکل آپ نہیں اتریں گے" تو میں نے ہڑبڑا کر کہہ دیا کہ نہیں میں آگے جا رہا ہوں۔ واپسی میں بچوں کو لے لوں گا"۔ شام لہو رنگ ہو رہی تھی بادل چھٹ گئے تھے اور بڑے بڑے سرخ پہاڑوں کی طرح لگتے تھے لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ موسم کی ذرا سی تبدیلی طبیعت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ٹولیوں میں نوجوان لڑکے گٹار بجا رہے تھے۔ موٹروں میں بھر کر سمندر کی طرف جاتے ہوئے گاتے ہوئے عجیب ہنگامہ تھا" لاحول ولا قوۃ میں بھی کیا دیوانہ آدمی ہوں عطیہ بیگم" کی وجہ سے کوئی شے یعنی کہ اچھی ہی نہیں لگ رہی عجیب بے سنگم خیالات ہیں ذرا سا کسی نے توجہ

دی اور آپ بس گئے۔ یہی آپ کا کیریکٹر ہے جس کا ڈنکے کی چوٹ آپ اعلان کرتے ہیں
میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا رہا۔

دوسرے دن رات کی سرزنش کرنے کی وجہ سے طبیعت بہت حد تک ٹھیک تھی فون کی گھنٹی بجنے پر مجھے فون کا انتظار نہیں تھا عام حالات میں تم سے ملنے سے پہلے میں جیسا تھا ویسا ہی تھا۔ آرام سے کام کر رہا تھا۔

چپراسی نے چک اٹھائی اور تم اندر آئیں۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ میں نے اپنے آپ پر گرفت مضبوط کر کے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور تم بیٹھ گئیں تمہاری مسکراتی ہوئی آنکھیں آج بھی یاد آتی ہیں تو مجھے اپنی وہ اُس لمحے کی گھبراہٹ یاد آتی ہے۔ بظاہر میں کام میں مصروف تھا مگر اندر اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہا تھا آخر میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا تھا کمزور اور بے وقوف اور پاگل۔ کسی کا فون آیا جس سے مجھے خاص تقویت ہوئی۔ میں نے سوچ لیا کہ میں تمہیں کسی ریسٹوران میں لے چلتا ہوں چائے پلاؤں گا اور سمجھاؤں گا کہ ذرا ذرا سی لڑکیاں غالب کے اشعار کا غلط استعمال نہیں کیا کرتیں۔ عجیب سرپرستانہ انداز سے میں نے کہا "چلو بی بی تم کو کسی کیفے میں چائے پلائیں۔" اور یہی میری غلطی تھی اگر اس گھڑی تم سے دفتر میں بات کر کے تم کو رخصت کر دیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ چپراسی سے میں نے کہا کام سے جا رہا ہوں آدھ گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ تمہارے لئے کھول دیا اور خود ڈرائیور جا بیٹھا موٹر چلی ہے تو تم نے کہا

"کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا۔"

میں اس قدر تیزی سے کسی تو تو میں میں کرنے کے لئے تیار نہیں تھا میں ناصح نہیں ہوں مگر پھر بھی میں نے کہا۔

"لگتا ہے غالب کے اشعار آپ کو خوب یاد ہیں۔"

تم نے موٹر چلاتے ہوئے میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا اور کہا

"آپ مجھے بچہ کیوں سمجھتے ہیں میں اٹھارہ سال کی کب سے ہو چکی ہوں اور بی اے

میں پڑھتی ہوں آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے کہ میرے خطوں کے جواب نہیں دیتے مجھے فون پر بات نہیں کرتے آپ کون ہوتے ہیں اس طرح میری بے عزتی کرنے والے۔"

لاحول ولاقوۃ۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اور بظاہر تم سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے کہا تھا۔

"بی بی تم میری بیٹیوں کے برابر ہو اور پھر خطوں میں ایسی کون سی بات تھی جس کا جواب میں ضرور دیتا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو قطعًا نہیں جانتا۔ میں فون پہ آپ سے کیا کہتا۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ کو دلنوں میرے فون کا انتظار رہا ہو گا۔ اور خط کا بھی۔ میں آپ کی بیٹیوں کے برابر ضرور ہوں مگر آپ کی بیٹی نہیں۔ آپ مجھ سے یہ بزرگانہ مشفقانہ برتاؤ نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ آج میں شکست دینے یا ہار ماننے آئی ہوں۔ اور میں آپ کے ساتھ کسی ریسٹوران میں نہیں جارہی مجھے کلفٹن یا کسی اور جگہ لے چلئے۔ مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے سمجھے آپ۔"

میں نے موٹر کلفٹن کی طرف موڑ لی۔

سارا راستہ تم نے کوئی بات نہیں کی۔ تمہارے سانس لینے سے پتہ چلتا تھا کہ تم ہانپ رہی ہو جیسے بہت دور کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ میں پنجرے میں بند پرندے کی طرح محسوس کر رہا تھا جیسے بھاگ کر تھک کر کوئی صیاد کے آگے اپنے آپ کو بے بس پائے۔ میں نے جی میں کہا کیا زوردار لڑکی ہے اور کس قدر جرأت مند۔ میں تمہاری ہمت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

ہم سمندر کے کنارے تک ایک دوسرے سے کچھ کہے بنا چلتے گئے۔ جیسے تمہیں مجھ سے کچھ نہ کہنا ہو۔

میں نے کہا۔ "عطیہ بیگم میرا خیال ہے یہی آپ کا نام ہے کہئے آپ کو مجھ سے کیا کہنا ہے۔"

تم پھر بھی چپ رہیں۔
میں نے کہا بھائی آخر کب تک سمندر کے کنارے ٹہلیں گے آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کو مجھ سے بہت کچھ کہنا ہے بولئے تو سہی۔
تم نے میری طرف دیکھ کر کہا
"پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں"
میں نے کہا" عطیہ بی بی آپ میرے لئے بالکل اجنبی ہیں میں بال بچوں والا آدمی ہوں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ بتا دیں تو مہربانی ہوگی۔
تھوڑی دور تک اور ہم ایسے ہی چلتے گئے میں حیران تھا کہ اب جانے آگے یہ لڑکی کیا کرے مگر تم نے پلٹ کر اپنے بازو میری کمر کے گرد حمائل کر دیئے اور اپنا سر میرے سینے پہ رکھ کر رونے لگیں تمہاری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا تھا اور میں نے نہایت آہستگی سے تم کو اپنے سے علیحدہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر تم اور مضبوطی سے اپنی باہوں کا حلقہ میرے گرد تنگ کرتی گئیں۔ میں نے تمہارے سر پہ ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی تو تم نے اُس طرح سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا " میں اٹھارہ سال کی جوان عورت ہوں بچہ نہیں میرے سر پہ ہاتھ مت پھیریں"۔
بخدا زندگی میں اس گھڑی سے زیادہ میں نے کبھی اپنے آپ کو خالی الذہن نہیں پایا۔ میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں جو ایک ذمہ دار شہری ذمہ دار افسر اور ذمہ دار باپ تھا جس کی شوہر پرستی مشہور تھی اور جس کی آنکھ مچولی بھی اس قدر بے ضرر ہوتی تھی کہ قصے نہیں بن سکتے تھے۔
میں نے دیکھا دور دور تک ساحل پر کسی آدمی کا پتہ نہیں تھا ہو سکتا ہے شرم کے مارے میرا بُرا حال ہو جاتا۔ میں نے کہا نا کہ تم میری زندگی میں پہلی لڑکی نہیں تھیں مگر پھر بھی تمہاری نسائیت کہاں گئی تھی اور میں کس طرح سے گرفتار تھا۔
تمہارے اور میرے قدموں کے نشانات پہ جانے کتنے لوگ انہی راہوں پر چلے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے میں ہی پہلا آدمی تھا جو اس طرح سے پکڑا گیا۔

تمہاری سب حرکات میں نہ تو بناوٹ تھی اور نہ ہی وہ سادگی جو پاگل پن کہلاتی ہے پھر میرے سینے سے لگی لگی تم مسکرائیں۔ تمہاری آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ جس میں نہ ریا تھی اور نہ شوخی سیدھی سادہ سی ایک بے بس لڑکی کی بے چارگی کی الم زدہ ہنسی۔ اور یہی تمہاری الم زدہ ہنسی تھی جس نے مجھے جیت لیا۔

اس شام میں گھر آیا ہوں تو بیوی نے کہا " آج تم کہاں تھے بچے کو چوٹ آئی تھی میں نے بار بار دفتر فون کیا پتہ چلا تم آدھ گھنٹے کا نوٹس دے کر چلے گئے ہو اور لوٹ کر نہیں آئے میں حیران تھی کہ تمہیں کہاں تلاش کیا جائے۔"

" یونہی ایک پرانے دوست مل گئے اُن سے باتیں کرتے رہے پرانے دنوں کی باتیں دل کو عجیب طرح اپنے شکنجے میں لیتی ہیں۔" مگر میں نے آنکھ اٹھا کر بیوی کی طرف نہیں دیکھا۔ سونے کے لئے لیٹا ہوں تو جی چاہتا چپ نہ ہوں کسی سے باتیں کئے چلا جاؤں۔ مگر احساسِ گناہ بھی کہیں دور دل کے گوشے میں تھا بھلا بچے کو چوٹ آئی ہوئی ہو اور میں کیسا باپ تھا جو ساحلِ سمندر پہ بیٹھا تھا۔

کچھ دنوں پھر نہ تمہارا فون آیا اور نہ ہی کوئی خط۔ میں مضطرب بے چین تمہاری خوشبو کو اپنے سینے میں امانت کے بوجھ کی طرح چھپائے اپنے کاموں میں لگ گیا۔ تم سے ملنے کا طریقہ کوئی نہیں تھا اور تم سے بات کہیں ہو نہیں سکتی تھی۔ تم جانے کون مخلوق تھیں کہ غائب ہو گئی تھیں۔

پندرہ دن اضطراب اُمید و بیم کے پندرہ دن تمہاری کسی خبر کی بنا پندرہ دن گزر گئے تو تمہارا فون آیا۔

" میرا ایک کزن آیا ہوا ہے اس کی وجہ سے نہ آنا ہو سکا ہے اور نہ ہی فون۔"

میں نے شکایتاً کہا " کم از کم تم فون تو کر سکتی تھیں۔"

اور تم نے کہا تھا " انتظار کا المیہ یہ ہے کہ وہ سب کو یونہی پریشان کرتا ہے اگر آپ کہیں تو میں آپ سے ملنے آؤں اور کزن کو بھی ساتھ لاؤں۔ خیر میں آؤں گی۔" اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

میں ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھا ہوا ایک ایسے اُلو کی طرح لگ رہا تھا جس پر ساری دنیا ہنستی ہو۔ مجھے خود اپنے اوپر رحم آیا۔ ان پندرہ دنوں کی پندرہ بے آرام راتوں میں مجھ پر کیا کچھ نہیں بیتا تھا۔ میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میرے عزم میرے ارادے ایک اٹھارہ سال کی نوخیز لڑکی کے ہاتھوں برباد ہو گئے۔ اُس کا وجود میرے اخلاقی نظریوں اور خود داری کا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں ایک زر خرید غلام کی طرح اسکے فون اور اس کی آواز کے ترنم کو سننے کے لئے ترستا تھا وہ چھلاوے کی طرح جب چاہتی تھی۔ غائب ہو جاتی تھی اور جب چاہتی تھی دکھائی دیتی تھی۔ مثنویوں کے شہزادوں کیطرح میں بھٹک رہا تھا اور وہ عفصہ درجادو گرنی جب جی چاہتا تھا مجھے جدائی کے کنوئیں سے باہر نکالتی کھلاتی پلاتی اور پھر مجھے اُسی کنوئیں میں پھینک دیتی تھی۔

جس دن تم کزن کو لے کر آنے والی تھیں میں صبح سے دوپہر تک دفتر میں ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا تھا جب چک اٹھتی اور چپراسی آتا میں سوچتا یہ تم ہو۔ پھر تمہارا فون آیا کہ تم کالج میں ہو کسی ڈرامہ کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ اگر میں آسکوں تو تمہیں وہاں سے لے لوں۔ جزبز تو میں ہوا مگر چونکہ تم فون بند کر چکی تھیں اس لئے کالج کی طرف چلا۔ تم آئیں بال بکھرے ہوئے ایک المیہ کردار کی صورت اور آکر میرے پہلو میں بیٹھ گئیں تمہاری پلکوں کے نیچے سے مسکراہٹ تمہارے رُخساروں پر پھیل رہی تھی، تمہارے لمبے سیاہ بال لبادے کی طرح تمہارے گرد پھیلے تھے تم نے نہایت خوبصورت رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اُس کا عکس تمہارے چہرے کو بھی رنگے دیتا تھا جیسے یہ تم نہیں ہو زہر کا رنگ ہو سبز رنگ مجھے لگا جیسے تم نے زہر پی رکھا ہے اور اب کوئی دم میں گرنے والی ہو پھر ہوتے ہوتے یہ زہر میرے رگ وپے میں بھی سرایت کر گیا۔

تم نے اتنے دنوں کی غیر حاضری کی معذرت نہیں کی کچھ نہیں کہا۔ میرے سینے پر سر رکھے سسکتی رہیں۔ میرا نام لے کر پکارتیں اور میرے سینے سے لگ جاتیں۔ جیسے یہ بھی تمہارے ہاں ہونے والے ڈرامے کا ایک حصہ ہوا در میں بھی اُس ڈرامے میں کوئی کردار ہوں نہایت غیر اہم سا۔ اصل میں مجھے معلوم نہیں عطیہ بیگم کہ تمہارے اس ڈرامے میں جس کو

میں تمہاری ذات کا المیہ کہوں گا میں نے کونسا کردار ادا کیا بیتے وقتوں کے بائیسکوپ میں کردار صرف حرکتوں سے اپنا آپ واضح کرتے تھے مگر میری سب حرکتوں پہ تو تمہارا اختیار تھا صرف تمہارا اور اب میں تمہارے چپ چاپ اندھیرے میں سے آنے اور اپنے ساتھ لگ کر رونے رہنے کا عادی ہو چلا تھا۔ خالی الذہن میں اگر چاہتا کہ اپنے آپ تمہارے سر پہ ہاتھ پھیروں تمہارے بالوں کی خوشبو سونگھوں، تمہارا کھٹی میں جلتا آنچ دیتا جسم چھو لوں تو یہ ناممکن تھا میں معمول تھا اور تم عامل تھیں۔ جب تم مجھے چھوڑ دیتیں تو میں تمہارا ہاتھ تھام لیتا۔ ہم سامنے سمندر کو دیکھتے رہتے۔ میں بات کرتا تو تم میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیتیں اور میں خاموش گم سم اسی طرح بیٹھا رہتا۔ آج جب تمہیں دیکھے اور تم سے ملے زمانے ہو گئے ہیں اور میں تمہاری طرف سے کچھ مایوس بھی ہو چلا ہوں۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ تم کیا ہو۔ تمہاری ملاقاتوں میں اتنا موقع ہی کب ملتا تھا کہ تم سے کچھ پوچھا جاتا۔

تمہارے کالج کا ڈرامہ ہم بھی دیکھنے گئے تھے۔ اصل میں میرے دوست مجھے کھینچ کر لے گئے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر چلا گیا۔ جب جب تم اسٹیج پہ آئیں ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھتا لوگ کس اشتیاق سے تمہیں دیکھتے تھے میرے دوست نے کہا۔

" ریاض یار دیکھو یہ کیسی لڑکی ہے اس کردار کے لئے کتنی موزوں ہے تم اگر یہ جانتے کہ وہ کون ہے تو اس ڈرامے کا لطف دوبالا ہو جاتا۔"

میں نے کہا تم اسے جانتے ہو کیا؟

میری آواز کا اضطراب محسوس کر کے میرے دوست نے سر ہلا دیا مگر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس بے چینی کی تھاہ لینا چاہتا ہو۔

میں شرمندہ سا ہو کر پھر اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ عطیہ بیگم میرے دل میں شک نے سر اٹھایا۔

اس دن میں نے خاص طور پہ بہت دن پہلے سے کسی غیر ملک میں جانے والے

دوست سے ہاکس بے پر اس کے ہٹ کی چابی مانگ لی تھی۔ میں کئی دنوں سے تمہارا منتظر تھا۔ تم نے جلدی میں گھبراہٹ میں ویسے ہی فون کیا کہ تم آنے والی ہو اور مجھے دفتر میں نہیں ملو گی۔ بلکہ کسی بس اسٹاپ سے میں تمہیں لے لوں۔ وہ اسٹاپ میرے راہ سے بہت دور تھا میں نے وہاں کے کئی چکر لگائے مگر تم نظر نہیں آئیں۔ جب میں مایوس ہو کر جانے والا تھا اور لوگ مجھے یوں موٹر میں گھڑی گھڑی اس جگہ کے چکر لگاتے دیکھ کر شک و شبہ سے دیکھ رہے تھے تم آئیں جیسے دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو اور دروازہ کھول کر میرے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ موٹر میں بیٹھتے ہی میں نے پوچھا۔

"عطیہ بیگم میرے علاوہ اور کتنے لوگ آپ کو جانتے ہیں"۔

"آپ کے علاوہ بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں مگر یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔"

میں نے سوال جس طرح سے میں چاہتا تھا تم سے نہیں پوچھا تھا اور پھر ہاکس بے کے اس ہٹ میں شام ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔ ابھی ہمیں بہت طویل مسافت طے کرنا تھی اور میں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

ہاکس بے پر پہنچتے ہی تم نے کہا "بس ذرا سمندر کے کنارے ٹہلیں گے پھر میں گھر جاؤں گی۔ میری امی کا جی اچھا نہیں ہے۔ ہوا زوروں میں چل رہی تھی بادلوں کی سیاہی میں سمندر جھاگ اگلتے پانی کا ابلتا ہوا کنواں تھا۔ ہم دیر تک کنارے کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلتے رہے۔ ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ بیچ بیچ میں تم میرا ہاتھ پکڑ کر دبا تیں۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے بازوؤں میں جکڑ لیتیں اور میرے سینے پر سر رکھ دیتیں۔ اور ہر دفعہ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ تمہاری گرفت آج کی طرح اس وقت مجھ پر اتنی گہری ہوتی اور میں سوچتا تھا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تمہیں کتنے لوگ جانتے ہیں اس ایک لمحے تو تم صرف میری ہو تمہارا وجود اس روز لہروں کے شور اور ہوا کی تندی میں مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ لگا۔ اور پھر اب کہ میرے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی تم مجھے ایسے سچے گلاب کی طرح لگیں جو میرے ذرا سا چھونے اور ہاتھ لگانے سے اپنا رنگ اور خوشبو

کھو دے گا۔ تمہاری محبت نے میری زندگی کو نئی جلا اور میرے جینے کو نئی امنگ بخشی تھی تمہارے گلابوں کا اثر مجھ پر ہو رہا تھا۔ میں اُن دنوں خوشی اور سرشاری کی نئی لذت کے ساتھ ساتھ تلخی اور بے لبی کے نئے دوراہے پر تھا۔ تم ہوا کی طرح میرے آس پاس اور گرد میرے وجود کا احاطہ کئے تھیں اور میری پہنچ سے باہر تھی۔

جب میں نے واپس جانے کے لئے موٹر کا دروازہ کھولا ہے تو تمہارا اپنی امی کے جی کے لئے سارا اضطراب رخصت ہو گیا تم اسی طرح میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں اگر میں چاہتا تو ہم ہاکس بے کی اس ہٹ میں رات سمندر کے کنارے گذار سکتے تھے مگر میں نے بہت دنوں سے پہلی گھڑی سے سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا تھا۔ مجھے آج بھی معلوم ہے اگر میں تمہیں آسرا دیتا تو تم اس ہٹ تک پہنچ سکتیں مگر میں تمہاری نگاہوں کے عزم سے آج اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہاری خود سپردگی میرے اشارے کی منتظر ہے مگر میں تمہیں تمہارے سپرد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں تمہیں واپس لے آیا۔

واپسی میں تم باتیں کرتی رہیں جیسے میری بیاہتا بیوی میرے ساتھ کرتی تھی سیاست کی دنیا کی موسم کی۔ چند لمحوں پہلے کی ساحل سمندر کی عطیہ میں اور تم میں کتنا فرق تھا۔ جب میں تمہیں تمہارے گھر کے سامنے پہنچا کر واپس آ رہا تھا تو تم نے ایسی زخمی نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے تمہیں بہت ہی ٹھیس پہنچائی ہو تمہاری بے عزتی کی ہو۔

اس کے بعد بہت دنوں تمہارا فون نہیں آیا۔ میں نے تمہارے گھر کے کئی چکر لگائے یونہی سامنے سے گذر جانا ایک بار تم دکھائی دیں پائنچے اٹھائے ٹیوب لئے اس انہماک سے پھولوں کو پانی دیتی ہوئیں کہ میں نے سوچا یہ تم نہیں ہو کوئی اور ہے مگر تم نے آنکھ اٹھا کر باہر کی طرف نہیں دیکھا۔ بس ایک جھلک اور کچھ نہیں۔ امتحانوں کا زمانہ بیت گیا۔ میں نے تمہارے کالج کی لڑکیوں کو یوں گھور گھور کر دیکھا کہ شاید تمہیں دیکھ سکوں مگر مہینوں گذر گئے۔ اور تم نہیں آئیں۔ میرے جذبات کی پُرشور ندی میں وقت نے نرم روی پیدا کر دی جانے کتنے موسم بیت گئے۔ ہاں عطیہ بیگم کتنے ہی موسم بیت گئے۔ دل کی دنیا میں موسم روز تو نہیں بدلتے

اور تمہارے لئے میرے جذبات میں جو ٹھہراؤ پیدا ہوا ہے وہ زمانوں کے گزرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ بہت چلا ہوں اتنی دور تک کہ میرے پاؤں میں اب اور آگے جانے کی سکت نہیں ہے۔ مگر تم نے مجھے آگے چلایا ہی کہاں ہے۔ جب تم سے ملاقات ہوئی ہے تو تم زرد زرد اور دبلی ہو رہی تھیں تمہارے آنکھوں میں گھائل ہرنی کی سی المناک بے بسی تھی اور وہ مسکراہٹ جس نے میرا سب کچھ ہر لیا تھا۔ تم نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔ تم نے مجھے کوئی اطلاع آنے کی نہیں دی تھی۔ صرف ایک نوٹ لکھا تھا۔

"داغِ فراق وصحبتِ شب کی جلی ہوئی۔"

میرا دل اسکو دیکھ کر دھڑکا نہیں میں نے سارے خطوں سے الگ اُسے اپنے سامنے رکھ لیا اور بہت دیر اُسے پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ حروف میری آنکھوں میں دھبوں کی طرح ابھرنے لگے مجھے اپنے چہرے پر نمی محسوس ہوئی کیا میں رو رہا تھا؟ تمہارے فراق کی مدت اتنی طویل اور تمہارے وصل کی گھڑی اتنی مختصر ہوا کرتی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ کیا میں تمہارے لئے پریشان تھا۔

دفتر کے سامنے نکلتے ہی تم مجھے مل گئیں۔ بیٹھتے ہی تم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں بھیڑ میں موٹر چلاتا رہا اور تم اپنے سامنے دیکھتی ہوئی چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں۔ تم نے میرے سینے پر کتنے آنسو بہائے ہیں مگر وہ کیفیت ونشاط کے آنسو تھے دو گھڑی مل بیٹھنے کی خوشی کے آنسو، جانے کیوں مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا لگا۔ ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ ہاکس بے ہم سے بہت پیچھے رہ گیا اور سامنے گہرا نیلا بے پایاں بے کراں سمندر کروٹیں لے رہا تھا لہریں غصہ در دیو کی طرح پھنکار رہی تھیں۔ اگلی ملاقاتوں کی طرح تم نے اپنا سر میرے سینے سے نہیں لگایا آج شاید تم نے کچھ بھی نہ کہنے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔ اور میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تمہارے قرب سے سرشار، آخر میرا کیا حق تھا تم پر۔ تمہارا وجود مجھے خوشی دیتا تھا میرے لئے یہی کافی تھا۔ میں نے تم سے اس طویل خاموشی کی وجہ نہیں پوچھی۔ میں نے اتنے دنوں میں قدرت کی طرح تمہارے بدلتے رنگوں سے مطابقت پیدا کر لی تھی اور مجھے نہ تمہاری محبت پر یقین تھا اور نہ ہی بے یقینی تم نے

پلٹ کر مجھ سے کہا تھا" دنیا میں ہاکس بے کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں سمندر سے مجھے اب خوف آنے لگا ہے کیا ہم اور کہیں نہیں جا سکتے۔ مجھے اس شہر کی نگاہیں پیس کر رکھ دیں گی میں یہاں ایک لمحہ نہیں رکنا چاہتی۔"

"یہ تم میں خود کلامی کی عادت کب سے پیدا ہو گئی تم تو بات کرنے کو وقت کی توہین خیال کرتی ہو۔" میں نے پتھر سے اٹھ کر تمہاری طرف آتے ہوئے کہا۔

تم میری ٹانگوں میں لپٹ گئیں تمہارے بازوؤں کے حلقے میں میں کانپ گیا۔

"مجھے یہاں سے لے چلو کہیں دور جہاں یہ جان کو پینے والا موسم نہ ہو یہ سمندر کی نمی سے بھری ہوا نہ ہو یہ حیا دو جگاتی ہوئی لہریں نہ ہوں۔ تم مجھ پر اتنا احسان نہیں کر سکتے۔"

"مگر کیوں عطیہ بیگم۔" میں نے بہت ہمت سے کام لے کر کہا" سمندر کو شروع سے تم نے منتخب کیا ہے اور میں سوچتا ہوں یہ ٹھیک ہی ہے۔"

"تم سوچتے ہو! تم سوچتے ہو! تم کچھ نہیں سوچ سکتے۔ تم نے سوچا ایک جوان عورت تمہاری جھولی میں آ گری ہے تم نے کبھی مجھ سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر نہیں کیا میں آؤں یا نہ آؤں تمہیں اس سے کیا۔ تمہیں میرا وجود پتھر کے ٹکڑے کی طرح لگتا ہے غیر اہم اور لایعنی بیکار سچ کہنا میری غالب پسندی تم کو کھیل نہیں لگتی تم کو کیا پتہ خونِ جگر ہونے تک آدمی پر کیا بیت جاتی ہے۔"

تم بیٹھے سے کھڑی ہو گئیں۔

"میرا تو ایسا تم کو ستانے کا کوئی کام نہیں کیا عطیہ بیگم۔ میں تو چراغ کا جن ہوں جب جب تم نے مجھے پکارا ہے تمہاری آواز پر لبیک کہا ہے۔ یہ تمہاری مجھ سے غالباً چوتھی ملاقات ہے اور میں خود بھی سوچتا ہوں کہ یہ حالت زیادہ دنوں نہیں چل سکتی۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو مجھے بتا دو تو شاید راہ آسان اور زندگی میں کچھ سکون ہو۔ اور اب حالت یہ ہے کہ تم میری اور اپنی دونوں کی مالک و مختار ہو۔

اور عطیہ تم نے کہا تھا" یہ راہ ہم دونوں نے چنی ہے تم کو مجھ سے شکایت

کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

ہم برسوں سے ساتھ رہنے والے دوستوں کی طرح ایک دوسرے پر الزام دھر رہے تھے۔ عطیہ تم اٹھارہ سال کی جوان عورت تھیں اور میں تمہارے قدموں کے نشانوں پر کتنی دُور نکل آیا تھا۔ یہ تمہارے قدموں کے نشان ہی تھے ورنہ تم میری منزل نہ تھیں میں تمہارا سہارا نہ تھا۔

ٹھیک ہے میں نے کہا میں شکایت نہیں کر رہا ہیں صرف اس صورتِ حال کی بات کرتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے ؟"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی تم نے کہا تھا" مجھے سہارے کی ضرورت تھی اور تم میرا سہارا بننا نہیں چاہتے تم کو مجھ سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے۔ میں نے تمہیں دل وجان سے چاہا ہے تم مجھے نہیں چاہ سکے یہ میری بد قسمتی ہے اور میں کیا کہوں ؟

پھر تم مجھ سے منہ موڑ کر موٹر میں جا بیٹھیں اور میں تمہیں واپس لے آیا عطیہ بیگم میں آج اس اکیلی رات میں جب نہ کہکشاں ہے اور نہ تارے اقرار کرتا ہوں عطیہ بیگم کہ میں نے تمہیں چاہا تھا۔ اور میرا دل تمہیں دیکھ دیکھ کر بہت جلا ہے جب مجھ سے روٹھ جانے کے بعد بظاہر تم کبھی مجھے نہیں ملیں مگر اکثر تم دوسروں کے پہلوؤں میں اوروں کی موٹروں میں غیروں کے ساتھ مجھے دکھائی دی ہو۔

جانتے تم نے مجھ سے کیا چاہا تھا ؟

مگر عطیہ میں تمہاری ہمت کی وجہ سے تمہاری عزت کرتا ہوں اور تمہاری جرأت نے کبھی مجھے آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ نہیں دیا۔ میں نے سدا تم سے تمہیں بچانا چاہا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے بھی تمہیں بچایا ہے تم میری امانت ہو عطیہ جو میں نے دنیا کو سونپی ہے تم کو کیا معلوم میں نے ان گھڑیوں کو جب تم میرے سینے سے لگ کر سسکتی تھیں کیا سنبھال کر رکھا ہے اس الوہیت کو میں برباد نہیں کر سکتا تھا اُن لمحوں کی قیمت نہ تم ہو اور نہ میں۔ ہو سکتا ہے ہم کچھ دُور ساتھ چلتے میرا مطلب ہے کچھ دُور

اور میں تمہارے قدموں کے نشانوں پر چلنا مگر چاہتیں منزل نہیں بن سکتیں عطیہ بیگم۔ یہ تو زندگی کی راہ پر چلنے والے دیئے ہیں جن کی روشنی میں راہ طے ہوتی ہے بھلا میں اس بیچ بسنے بے رحم دنیا میں تمہارے وجود کی روشنی میں کتنی دور چل سکتا تھا؟ اور کون جانتا ہے اس کی منزل کہاں ہے؟

مگر جب بھی نامعلوم خوشبوئیں مجھے گھیر لیتی ہیں میں اکیلا ہوتا ہوں تو مجھے یاد آتی ہو عطیہ بیگم گھاس میں سے جھانکتے اکیلے پھول کی طرح مغرب کے آسمان پر چمکتے ہوئے تارے کی طرح۔

۲۳ — ۲۴

قیمت

۴ روپے

شائع کردہ :- پاکستان کلچرل سوسائٹی ۔ کراچی ۵

جمیلہ ہاشمی

ایک پرانی کہانی

مندر کی گھنٹیاں ایک سار بجے جا رہی تھیں اور نیچے نیچے جھکتے آتے بادلوں میں شام کا اندھیرا ہوا کے ساتھ گھل رہا ہے۔ کھڑکی کے سامنے آم کی ڈالیوں میں بڑی مدھم سائیں سائیں ہو رہی ہے جیسے مندر کی پوجا میں پتوں کی پرارتھنا بھی ملنا چاہتی ہو۔ دُور کسی درخت پر کوئل بول رہی ہے۔ اُس کی کوہو کوہو کی گونج جب تھم جاتی ہے۔ تو شام اور بھی سنسان لگنے لگتی ہے۔ بھیگے پتوں پر بوندیں ٹپ ٹپ ہولے ہولے یوں گر رہی ہیں جیسا اندھیرے میں قدم اٹھاتا کوئی راہ تلاش کرنا چاہتا ہو۔ بھلا راہیں ڈھونڈنے سے کبھی کبھی ملی ہیں اور پھر اندھیکار میں راہ تلاش کرنا تو یوں ہے جیسے کوئی الجھے تاگوں کو الگ الگ کرنا چاہے۔

"بٹیا"

"کیا ہے موہن دادا"

"کچھ نہیں یونہی تمہیں دیکھنے چلا آیا تھا کتنا اندھیرا ہے اور ٹھنڈ ہے۔ چائے نہیں پیو گی"

"نہیں دادا"

جب میں مڑے بنا اس کی طرف دیکھے بنا اسے موہن دادا کہہ دیتی ہوں تو اُسے پتہ چل جاتا ہے کہ میرے من پر اداسی کا، اکیلے پن کا، اپنی غلطیوں کا اور جانے کاہے کاہے کا بوجھ ہے۔ مجھے معلوم ہے اب اپنے کمرے میں جا کر وہ لمبی سی مالا پر اوم شانتی شانتی کا جاپ کرے گا۔ کھاٹ پر بیٹھ کر وہ آہیں بھرے گا اور اُن سب شکتیوں کو بُرا بھلا کہے گا جنہیں میں نے وقت پر ٹھوکر ماری تھی۔ پر پریم کی شکتی کیا اتنی بڑی شکتی ہے؟ اور ہوتا یوں ہے کہ جب تم اپنے گرد سارے محلوں کو ایک ہی ٹھوکر مار کر گرا دو اور تمہیں اپنی شکتی پر مان ہو اور تمہارے گرد ہر طرف ویرانی ہو تو پھر تمہیں پتہ چلتا ہے کہ . . . . . نہیں کچھ نہیں کچھ پتہ نہیں چلتا تم یہ کچھ پتہ چلانے کی شکتی رہتی ہی کب ہے۔ کل سپنے میں میں نے دیکھا کہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی

ہوں اور مجھ سے دُور نیچے سورگ ہے لوگوں کے جہپ کر ہنستے ہوئے اور خوش ہیں بھیڑ بھاڑ اور میلہ ہے چہل
پہل اور رونق ہے۔ بچے رنگ برنگ کپڑے پہنے ماؤں کے ساتھ اچھلتے کودتے چلے جا رہے ہیں۔ مرد اپنی عورتوں
کو لئے گھوم رہے ہیں عورتیں جن کے چہروں پر سکون ہے پھیلی ہوئی زندگی کا احساس ہے جن کی آنکھوں میں سپنے
ہیں جن کے گرد چمک ہے۔ گھروں میں روشنیاں ہیں اور خوشی ہے۔ کوئی سپنے میں مجھ سے کہتا ہے تم اوپر ہی اوپر
کس سورگ کو ڈھونڈنے جا رہی ہو سورگ تو بہت نیچے ہے وہ جہاں سے تم آگے نکل آئی ہو۔ اور میں چوٹی سے
اترنے اور اس سورگ کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہوں تو گر جاتی ہوں۔ نیچے ہی نیچے۔ جب مجھے ہوش آیا تو
موہن دادا مجھے بلا کر کہہ رہا تھا "بیٹا سوتے میں ڈر گئی ہو بھگوان کا نام لو۔ پانی پیو۔ پھر وہ بہت دیر تک
بیٹھا منتر پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتا رہا اور جانے مجھے کب نیند آ گئی۔

سویرے جائے پر موہن دادا نے مجھ سے کہا "بھیانک سپنے دیکھ کر آدمی کا من کیسا سکڑتا ہے۔ آج
مندر میں جاؤ اور بھگوان سے شکتی مانگو پرارتھنا کرو۔"

اسے اچھی طرح پتہ ہے کہ مجھے نہ بھگوان پر یقین ہے اور نہ کسی شکتی پر میں نہ کبھی مندر میں گئی ہوں اور
نہ پرارتھنا کروں گی۔ مجھے بھگوان سے کچھ نہیں لینا۔ مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ مندر کی گھنٹیوں کو بجنے
دو کیرتن کے سمے سادھوؤں کو گانے دو۔ ان دیکھی ان جانی شکتیوں کو بلایا جانے دو۔

بادلوں میں اندھیرا گھس گیا ہے کوئل کی کوک ختم گئی ہے۔ ہوا ڈالیوں میں سے بین کرتی گذر رہی ہے
بھیگے پتوں پر بہار کے بوندیں پڑ رہی ہیں دھرتی کی کنواری باس ہولے ہولے بوندوں میں مل بہتی جا رہی ہے۔

"ساوتری۔"

مجھے کس نے پکارا ہے یہ پکار تو بہت دور سے آتی جان پڑتی ہے۔ سالوں کے اوپر سے بہت پیچھے
سے اور بہت نیچے سے یہ آوازیں اور چاپیں جو میرا پیچھا کر رہی ہیں اصل میں میرا وہم ہیں۔ ان کا اور میرا
کوئی رشتہ نہیں میرا تو کسی شے سے بھی کوئی رشتہ نہیں۔

سردیوں کی شاموں کو جب بادلوں میں سے کوئی تارہ دکھائی نہ دیتا اور ماں رسوئی میں لگی ہوتی تو
موہن دادا اپنی کوٹھری میں آگ کے پاس بٹھا کر ہمیں کہانیاں سناتا۔ مجھ سے کہتا بٹیا آگ میں دیکھو بڑے
ہو کر تمہیں اگنی کی پوجا کرنا ہو گی دھیان لگا کر آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر۔ اگنی شکتی ہے اگنی دیوی ہے
اسے پرنام کرو۔ اگنی پوتر کرتی ہے۔ اور ہم سب کہانی سننے کے لالچ میں اگنی کو پرنام کرتے۔

میں تو خود اگنی ہوں جس نے اپنے گرد ہر رشتے کو جلا دیا ہے میں نے اپنی ساری کمزوریوں کو راکھ کر دیا ہے اور اب میں اس راکھ میں دبی اکیلی چنگاری ہوں جس سے نہ کسی کو گرمی پہنچ سکتی ہے۔ اور نہ ہی روشنی۔ میں تو اپنے گرد کے اندھیکار کو بھی روشن نہیں کر سکتی۔

* موہن دادا:

مگر وہ اپنے کمرے میں جاپ کر رہا ہوگا اور یہ پکار میرے ہونٹوں کو کہاں چھو سکتی ہے۔ میں کسی کو بھی نہیں پکار سکتی۔

موہن دادا سدا کی طرح کہانی سنانے لگے گا۔ دیکھو بیٹا تم ساوتری اس لئے ہو کہ تم دیوتاؤں سے بھی لڑ سکتی ہو۔ تم تو موت کے دیوتا یم کا پیچھا کر سکتی ہو تم اندھیرے راہوں اور موت کی وادیوں میں یم سے اپنی بات منوا سکتی ہے۔ دھن دھن ساوتری۔

کاش میں اس کی کوٹھری میں بیٹھ کر پرانے دنوں کی طرح اپنے ساوتری ہونے پر یقین کر سکتی۔ ؟ مگر وقت بیت چکا ہے۔ وقت اور زمانہ پانی کی لہروں کی طرح میرے اوپر سے گذر گئے اور مجھے معلوم ہے میں ساوتری نہیں ہوں۔ کیونکہ کوئی ستیہ وان میری راہوں سے نہیں گذرا اور میں سدا کی بزدل سدا کی ڈرپوک میں کسی ستیہ وان کو تو ڈھونڈنے نکل نہ سکی بھلا یم کے پیچھے کیا جاتی۔

عشق موت کی مانند زبردست ہے۔

کہانی سنتے سنتے میں پوچھا کرتی کیوں دادا بھلا ساوتری اتنے اندھیرے میں بادلوں کے اوپر سے گذر کر دیوتا کے پیچھے کیسے گئی تھی۔

اور موہن دادا بالکل میرے کان میں کہتا۔ ستیہ وان کو جو دوت لے گئے تھے اور وہ اس کا پتی تھا اس کی مانگ کا سیندور، اس کی دنیا کی روشنی اس کا سہاگ" اتنا کہنے کے بعد موہن دادا کے نتھنے پھول جاتے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے وہ اشلوک پڑھنے لگتا جو اس قصے کا اصل حصہ تھے آخر میں اس کے ہاتھ کھل کر ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ انہیں گھٹنوں پر رکھ کر کہتا۔ ساوتری دھنیہ تھی دیوتاؤں نے بھی اس کے سامنے ہار مان لی۔ جب مجھے اپنی طاقت کو آزمانے کے لئے کوئی دیوتا نہ ملے تو میں نے ستیہ وان سے ہی مقابلے کی دل میں سوچ لی میں ساوتری جو تھی۔

جب پہلے پہل مرلی دھر مجھے ملا تو ایسا لگا جیسے میرے اندر کی گرہیں کھل رہی ہیں میری آتما پھیل رہی ہے

میں ہوا کے گیتوں اور پتوں کی سرسراہٹ میں مل رہی ہوں میں اگر اپنے بازو بڑھاؤں تو ساری شکیتاں سکڑ کر میرے بازوؤں میں آجائیں گی۔ ماں اُن دنوں رسوئی گھر سے لمبے دالانوں میں پھرتی میری طرف بڑی حیرت اور تعجب سے دیکھتی۔ بابا کے مرنے کے بعد اسنے مجھ سے صرف ایک بار کہا تھا "ساوتری اس گھر کا مان اور شان تمہارے دم سے ہے۔ تمہارے بھائی تو بُرا بھلا جو کریں میں ذمہ دار نہیں، پر تم لڑکی ہو۔ آزادی سے جو جی چاہے کرو پر میرا خیال رکھنا۔" میرے انگ انگ میں ایک گیت رچ رہا تھا۔ مُرلی دھر سے بات کرتے میں مجھے لگتا جیسے کوئی مجھے ستاروں کے ہنڈولے میں جھلا رہا ہے۔ میرا راز سیپ کی طرح میرے اندر پڑا رہا تھا ایسے موتی کی طرح جسے میں نے ہر ایک کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی ہے۔

جانے آج مُرلی دھر کہاں ہوگا۔ اپنے بال بچوں میں گھرا اپنی دنیا میں لگا اُسے کیا معلوم کہ ایک اکیلے گھر کے اندھیرے میں جب بہت سی چاہیں اور سائے اور وہم میرا پیچھا کر رہے ہیں مجھے صرف وہی یاد آرہا ہوگا۔ کیونکہ مرلی دھر کو بھی میں نے ستیہ وان نہیں سمجھا۔

مجھے اپنے ذہن پر اپنی لیاقت پر ناز تھا۔ کالج کے بحث مباحثوں میں ہمیشہ میں نے مُرلی دھر کی مخالفت کی ہے۔ ہمیشہ اسکے خلاف کھڑی ہوئی ہوں۔ جوش سے علم سے طاقت سے میں نے اُسے ہرانے کی کوشش کی ہے۔ اور آخر میں ہار کون گیا ہے؟

مُرلی دھر کی وہ مسکراہٹ جس میں دھیرج تھا اور یقین تھا مجھے اس کے چہرے میں سب سے زیادہ مسکراہٹ ہی بھاتی تھی اور اسی کو میں نے مارنا چاہا ہے۔ آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے مرد تو بچہ ہوتا ہے جس کی بات مان جاؤ تو اُسے تسلی ہوتی ہے۔ وہ اپنی برتری کو ٹوٹتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ محبت میں مار کھا سکتا ہے مگر اُس کا غرور نہ رہے تو اُسے پریم اور چاہتوں ہر ایک شے سے یقین اٹھ جاتا ہے۔

میں اپنی فتح میں مگن مُرلی دھر کو اپنا حق سمجھتی رہی۔

پھر جب کالج کا زمانہ ختم ہوگیا اور میں ہر دن یہ انتظار کرتی تھی کہ وہ آئے گا اور کہے گا ساوتری اب ہم اور تم سدا کے لئے اکٹھے اور ایک ہی راہ پر چلیں گے تو یوں ہوا کہ اُسنے کہا "ساوتری تم میری بہترین دوست اور ساتھی ہو تمہیں یہ سنکر خوشی ہوگی کہ میں کملا سے شادی کر رہا ہوں۔ بولو تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔ کملا تو تمہاری بھی دوست تھی وہ بہت پڑھی لکھی نہیں، تمہاری طرح بے تحاشا بحث مباحثوں میں نہیں بول سکتی۔ پر رسوئی گھر میں لگ سکتی ہے اور اس دھیرج اور محبت کے ساتھ بال بچوں کو پال سکتی ہے جس سے میری

ماں نے مجھے پالا ہے۔ کیوں کیا میں نے غلط لڑکی چُنی ہے۔

میں اندھیرے میں تھی اور وہ لیمپ کی روشنی میں تھا، شام گہری تھی اور گھر میں ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور وہ اندھیرے میں میرے اڑتے ہوئے رنگ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔

مجھے بہت دیر چپ دیکھ کر اس نے کہا۔ ہاں تو بتاؤ ساوتری، کملا کیسی رہے گی۔ میں اس معاملے میں تمہاری رائے کو اپنی ماں کی، اپنی بہنوں کی اور باقی دوستوں کی رائے سے اہم سمجھتا ہوں۔ تمہاری ہاں اور نہ پر ہی ساری بات طے کروں گا۔ بتاؤ نا۔

تب میں نے اپنے آپ کو سمیٹا۔ اپنے ٹوٹے غرور کے ٹکڑے، اپنے دل کی کرچیں، اپنے دماغ کا پھیلا ہوا کوڑا کرکٹ، اور ایسی آوازیں جو مجھے اپنی نہیں پرائی اور کسی اور دنیا سے آتی لگتی تھی کہا "تمہارے لئے کملا سے موزوں اور کون لڑکی ہو سکتی ہے۔ مجھے تو خود کملا بہت اچھی لگتی ہے۔ پرماتما تمہیں کامیاب کرے"

مُرلی دھر نے ایسی ٹھنڈی سانس بھری جیسے اطمینان اور سکون کی آخری حدوں پر کھڑا ہو کر سور گ کو پا کر آدمی بھرتا ہے اور کہنے لگا۔ سچ پوچھو تو مجھے کملا سدا سے بہت اچھی لگتی رہی ہے۔ ایک طرح کا پریم ہی کہہ لو۔ پر یہ احساس ہی تھا کملا کی آنکھیں بہت بڑی بڑی نہیں ہیں پر ان میں حیا ہے۔ اس کی آواز میں جھجک ہے۔ مجھے ایسی عورتیں شروع سے ہی بہت پسند ہیں۔ دھیمی دھیمی رُکی رُکی سی۔

وہ بہت دیر کملا کی باتیں کرتا رہا اور پھر چلا گیا۔ وہ اپنی باتوں میں اتنا محو تھا کہ اسے میرے کم بولنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

اُس رات میں نے رو دھو کر اپنے دل کو تسلی نہیں دینی چاہی۔ میں نے کچھ سوچا بھی نہیں، پر میں ساری رات جاگتی رہی اور میں نے اپنے آپ کو بہت لعنت ملامت کی اور اپنی ساری طاقتوں کو پھر سے اکٹھا کیا۔ زندگی آخر جنگ ہی تو ہے چاہے دیوتاؤں سے ہو اور چاہے عام آدمیوں سے چاہے اپنے آپ سے۔

مُرلی دھر ایک بڑے محکمے میں ملازم ہو گیا۔ کملا جب کبھی اُس کے ساتھ مجھے اور ماں کو ملنے آتی تو مجھے یوں لگتا جیسے دونوں مجھے ٹوٹا ہوا دیکھنے آئے ہوں۔ مُرلی دھر نے آخر مجھ سے کن شکستوں کا بدلا لیا

تھا۔ آخر یہ جیت آدمی کی ہوتی ہے؟

آج اپنے ساتھ حساب کتاب کرتی ہوں تو لگتا ہے مجھ میں دھیرج نہیں تھا مجھ میں اپنی ہار مان لینے کی شکتی نہیں تھی نہ مجھے اپنے کو کسی بھی مرد سے کم جاننے کا مان نہیں تھا۔

آم کے بور کی خوشبو میرے بالوں میں، میرے سانس میں، میرے کمرے میں ہر طرف پھیلی ہے۔ ہاتھ بڑھاتی ہوں تو انگلیاں چپکیلے پتوں سے چھو جاتی ہیں اور ایک بوند ٹپ سے میرے ہاتھ پر آن پڑی ہے یہ کس کا آنسو ہے؟ میں جو آپ شکتی ہوں، آپ چپ اور آپ نپ ہوں، آپ رادھا اور آپ بھگوان ہوں میں جب ہر شے سے زیادہ اپنے آپ پر یقین رہا ہے۔

مگر نہیں یہ جھوٹ ہے بھگوان تو جانتا ہے یہ جھوٹ ہے۔

جب مُرلی دھر کا بیاہ ہوا تو میں نے پھر دیکھا ماں میری طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھتی تھی اس کے لہجے میں دکھ کے ساتھ ساتھ ایک تسلی سی ہوتی۔ اُن دنوں میری چھوٹی بہن کنتی نے ہائی اسکول پاس کیا تھا اور ہمارے رشتے کے ایک بھائی کے دوست سے اس کا بیاہ بھی ہونے والا تھا۔ ماں دبی زبان سے کہتی "میرا تو جی چاہتا تھا پہلے تیرے ہاتھ پیلے کرتی تیری بار، آئی پر اپنا اپنا نصیب ہے۔ تو اتنی پڑھی لکھی ہے میں تو تجھ سے زبردستی بھی نہیں کر سکتی اور پھر تیری طرف سے تو یوں بھی مجھے کوئی فکر نہیں"۔ کنتی کے جوڑوں میں کناری ٹانکتے وہ ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتی اور باتیں کرتی جاتی۔ میں ان دنوں اپنے آپ سے بیزار زیادہ سے زیادہ خوش ہونے اور خوش رہنے کی کوشش کرتی۔ کنتی تو مجھ سے بہت چھوٹی تھی، گڑیا سی جیسے چھوئی موئی کا پودا ہو جب وہ دلہن بنی تو اس کی آنکھیں اور بھی بڑی بڑی لگتی تھیں اس کے چہرے پر خوشی کی ایک چمک تھی جو اندر سے پیدا ہوتی ہے جب اس کو وداع کرایا جانے لگا تو وہ ہولے ہولے رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا کاجل اُس کے چہرے پر بہتا جا رہا تھا اور ماں اس سے کہہ رہی تھی "کنتی دیکھ اس سے سنگھار بگڑتا ہے تو کوئی انوکھی جا رہی ہے سبھی کو تو وداع ہو کر جانا پڑتا ہے دیکھ رو نہیں۔ میں اس سارے میلے میں جیسے بھٹکی ہوئی آتما ہوں۔ برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ لگ کر منہ چھپائے کھڑی تھی۔ دلہا بڑا خوش خوش ہاروں اور پھولوں میں دکھائی بھی نہیں دیتا تھا اور پھر کنتی پر سے روپوں کی بارش کرتے وہ لوگ اُسے اپنے ساتھ لے گئے اور کانٹک کے ہوا کے ساتھ سناٹا ہمارے گھر میں گھومتا رہا۔ یہ ویرانی باہر نہیں میرے دل کے اندر تھی۔ ساری چاہیں

جو میں نے بھلادی تھیں میرے پیچھے ایک جگہ تک آتیں اور پھر باہر ہی سے لوٹ جاتیں ۔ اور آتے قدموں کی چاپ سے یہ لوٹتے، دور ہٹتے قدموں کی چاپ زیادہ اداس کرتی تھی ۔

مگر میں نے کہا میں تو آپ شکتی ہوں ۔ میں تو دیوتاؤں سے بھی اپنی بات منوا سکتی ہوں ۔

سارے دیوتا جو میری مانگ کا سیندور تھے اور جن کے پاؤں کی دھول میں اپنے ماتھے پر چڑھاتی اور جن کا انتظار میں ان کے گھر میں کرتی ۔ کم بولنے اور دھیرج سے بات کرنے والی لڑکیوں کی تلاش میں آکاش کی دوسری طرف نکل گئے ۔ ایک ایسے ہیرے کی طرح جسے خریدنے کی طاقت کسی میں نہ ہو سب نے میری طرف دیکھا ہے اور پھر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں ۔

"موہن دادا"

"کیا ہے بیٹیا"

تم نے مجھے یہ کبھی کیوں نہیں بتایا کہ ستیہ وان کون تھا جس پر ساوتری مرمٹی تھی ۔

ارے ارے بیٹیا بچپنے سے آج تک تو تمہیں کہانی سناتا آیا ہوں اور ابھی تک تمہیں یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ تو بڑا معمولی آدمی تھا لکڑیاں کاٹنے والا ۔

پریم کی شکتی مہان ہے بیٹیا ۔ یہ پریم کی شکتی تھی ساوتری میں جس سے اس نے دیوتاؤں سے بھی اپنی بات منوالی ۔

اور یوں ہوا کہ جب بھگوان نے ساری شکتیاں دیں تو پریم کی شکتی دینا بھول گیا اور اب میں ایک ایسا ہیرا ہوں جو پرانی چیزوں کے ساتھ طاق میں سجایا جائے گا اور لوگ کہیں گے یہ ایک ہیرا ہے جس کی قیمت کوئی نہ دے سکا ۔

پت جھڑ بیت گیا ہے سارے درختوں پر نئی کونپلیں اور نئے پتے نکلے ہیں ۔ میرے دل کے دکھ کو کون جانے گا ۔ میں ایک ایسی دھرتی ہوں جس پر نہ کبھی پھول کھلیں گے اور نہ کونپلیں ۔ بھگوان عورت کی شکتی اور اس کا دھرم کس شے میں ہے ۔

ویران گھر میں جہاں ماں بھی نہیں ہے روشنی بھی نہیں ہے ۔ میں موہن دادا کے قدموں کی چاپ سن رہی ہوں وہ اب ہولے ہولے میری طرف آئے گا اور کہے گا بیٹیا اندھیرے سے روشنی میں واپس آؤ ۔ سردی سے گھر کے سکون میں چلو ۔ اکیلے پن سے تو اچھا ہے باتیں کریں ۔ آؤ میں تمہیں کہانی سناؤں مگر میں

اب اس کی کہانیاں نہیں سنوں گی۔ میں تو آپ کہانی ہوں۔ پر اس کا انت کون جانے کیا ہو۔ آنے والے دن کی بات کون جانتا ہے؟

مندر کی گھنٹیاں ابھی جاری ہیں لوگوں کو بھگوان سے بہت کچھ مانگنا ہوتا ہے نا۔ میں کیا مانگوں کیوں موہن دادا میں بھگوان سے کیا مانگوں۔

اور موہن دادا بھی سوچنے لگ گیا ہے کہ میں بھگوان سے کیا مانگوں؟

جمیلہ ہاشمی

ہیرا پھول

ساز بجانے والے ایک ہی دُھن بار بار بجا رہے تھے اور رات ہوئے ہوئے بیت رہی تھی ہم چاروں اس میز کے گرد بیٹھے تھے جس کی چمکیلی سطح بوتلوں اور گلاسوں کے عکس کو سہارے کے لئے پکڑے تھی۔ ذرا پرے نیم تاریک کونے میں بیٹھا آدمی ایک سارا اس جوڑے کو تکے جاتا تھا جو شام سے مسلسل رقص کر رہا تھا۔ تھک کر جب مرد رُکتا تو وہ لڑکی .... نہیں بھائی وہ لڑکی نہیں تھی وہ لڑکی کیسے ہوسکتی ہے الھڑپنا اور ذراسی بے یقینی جو جوان ہوتی یا ہوئی لڑکیوں میں ہوتی ہے اس کی جگہ نازو ادا اور خود اعتمادی تھی۔ سر پیچھے پھینک کر ہنسنے والی وہ خاتون اپنے لمبے سیاہ بالوں کو ہر لحظہ جھٹکتی تھی۔ چہرے سے پیچھے ہٹ جانے والی زلفوں کو سنوارتی تھی۔ اور اس کے ساتھی کے جام میں سیال مدھم روشنی میں یوں آگ پکڑتا تھا جیسے ذرا سی دیر کے لئے ماچس کی تیلی۔ پہلے پہل محبت میں گرفتار ہونے والوں کی طرح ان دونوں نے باقی دنیا کو اپنے سے باہر دھکیل رکھا تھا، ان کے ناچ اُن کے اُٹھتے اُٹھتے قدموں میں لہروں پر بہتے ان کے جسموں سے، یہاں تک کہ ان کے لباس کے چھوتے ہوئے کناروں میں بھی ایک پکار سی تھی اور قریب اور قریب کی صدا۔

میرے انہماک کو دیکھ کر کرنل مرزا نے کہا حسن یہ تماشا تو یہاں روز ہوتا ہے۔ ان سیڑھیوں سے کتنی ہی گزری شاموں نے لاتعداد جوڑوں کو آتے گزرتے بیٹھتے جلتی آنکھوں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے اور باہوں کے گھیرے کو تنگ ہوتے دیکھا ہوگا۔ پھر مُراد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مگر یہ محبتیں ماچس کی تیلی ہیں کہ روشن ہو کر بجھ جاتی ہیں پھلجھڑی کی طرح یہ جذبۂ شوق وقت گزرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مصلحتوں کے پردے کے باہر کا رنگ۔"

"کرنل تم زیادتی کر رہے ہو۔ یہ بے چارے گھنٹوں سے ناچ رہے ہیں رقص کی یہ دھن ان کی کائنات ہے۔"

مراد نے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا۔

"جیسے بجلی کے ننگے تار سے انگلی چھو جائے تو سارا جسم جھٹکے کی شدت کو محسوس کرتا ہے یوں ہی یہ اس دھن

کی سرشاری سے ناچنے پر مجبور ہیں:" میں نے کرنل کا جام بھرا۔" اور پھر تم نے ساری عمر تو صحراؤں کی خاک چھانی ہے، سرحدوں کی حفاظت کا کام کیا ہے تمہیں کیا معلوم کہ آنکھوں کے جادو اور بازوؤں کے نیم دائرے کیا ہوتے ہیں۔"

"یار دہت سی اور چیزیں بھی ہیں جن کا جادو ہوتا ہے۔ باہنوں اور آنکھوں کے پرے نہ اترنے والا نشہ رکھنے والے اس حسن کی گرد کو بھی یہ سارے ہنگامے نہیں پہنچتے۔ پتلیوں کے تماشے کی طرح بے جان لگتا ہے یہ سارا رقص۔ جب طوفان تمہیں اڑائے لئے جاتا ہو، تمہارے خون میں آگ گھلی ہو، تمہارا لہو شرارے بن کر آنکھوں میں اتر آئے تو محبتیں اور نفرتیں بکواس لگنے لگتی ہیں۔ اس گھڑی تو آدمی کو اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔" کرنل نے سردی کو محسوس کرکے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسی باتیں کرتے ہوئے کرنل۔" مراد نے آگے جھک کر میز کی چمک میں اپنا سراپا ڈھونڈا، "اپنی جان کی پرواہ نہیں ہوتی تو آدمی بھاگتا کیوں ہے وہ اوٹ کی تلاش میں کیوں رہتا ہے؟"

"تم نہیں سمجھوگے بھائی تم نہیں سمجھ سکتے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہر بات ہر کسی کے لئے نہیں بنی، تم اس ماحول کو دیکھتے ہو انہی روشنیوں اور اندھیروں کے عادی ہو، طوفان کی شدت کا اندازہ کیسے کرسکتے ہو۔ تم یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ آدمی جب جان بچا سکے تو مرنا قبول کرے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ذرا سی اوٹ میں ہو کر زندگی کی طرف جا سکتا ہے دوڑ کر موت کو گلے لگا لے۔" وہ چپ ہو گیا اور اس نے سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔

"عجیب بات ہے نا وہ جوان تھا اور بچ کر نکل سکتا تھا مگر پھر بھی وہ اکیلا زندگی کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ زندگی کے مقابلے میں اور موت کے ساتھ ہو کر اس کے پہلو بہ پہلو وہ زندگی سے ہار ماننے والا نہیں تھا جب اس کے باقی ساتھی بھاگ رہے تھے پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے، کسی بہتر لمحے کی کھوج میں کسی اور گھڑی کے منتظر کسی اچھے وقت کو ڈھونڈتے ہوئے تو وہ جان بوجھ کر ان سے جدا ہو گیا کیا محض دس راؤنڈ اس کے گرد تنگ ہوتے گھیرے کو توڑ سکتے تھے کیا وہ اپنے کو بچا سکتا تھا۔ کیا اُسے امید تھی؟"

پھر اس نے میرے چہرے پر لکھی بے یقینی کو دیکھ کر کہا "تمہیں یہ بات عجیب لگتی ہے نا؟"

"نہیں میں صرف تمہاری بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں میں اس کے دل کے اندر جھانکنے کی کوشش میں بھی ہوں۔"

کرنل نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور پھر کہا۔ "تم نہیں سمجھوگے۔"

"آخر اس میں کون سا راز ہے خود مرنا چاہنے اور خودکشی کرنے میں کیا بہادری ہے۔"

"کیوں شیراز" مراد نے اس کے سر کی پشت کو چھوا۔

شیراز ایک دم یوں اُچھلا جیسے اُسے سوتے میں جگا دیا گیا ہو "کیا ہے؟" اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "میں اس کھوج میں ہوں کہ ناچنے والی اس خاتون کو کہاں اور کب دیکھا ہے۔ اتنی آشنا صورت لگتی ہے۔"

"ساری صورتیں میک اپ کے بعد ایک سی لگتی ہیں" کرنل نے کہا "آشنا اور پھر بھی نہ پہچانی جانے والی، فرق تو نگاہ کا ہوتا ہے۔ صرف اگنی اور سکھا کی صورتیں کبھی ہجوم میں گڈمڈ نہیں ہو سکتیں" پھر وہ لائٹر سے اپنا سگریٹ سلگانے میں لگ گیا۔

شیراز نے جھک کر میرے کان میں کہا "مرزا کو آج سے پہلے میں نے کبھی بہکتے نہیں دیکھا"

"مگر یار بات تو اس نے ٹھیک کہی ہے۔ میک اپ کی وجہ سے وہ مجھے کبھی روزی لگتی ہے اور کبھی زری۔"

"اصل میں یہاں آنے والی ساری عورتوں کے سراپے ایک سے ہوتے ہیں" مراد نے ہنس کر کہا "نہایت نازک اور اسمارٹ ساڑھیوں کے پُرشور سہاؤں میں جسم کے دل آویز خطوط مصنوعی آرائشِ جمال چہرے پر حُسن تو پیدا کرتا ہے مگر انفرادیت نہیں۔"

"مرزا کیا تم ہماری باتیں سُن رہے ہو۔ کرنل کیا تم اگنی کو یاد کر رہے ہو۔"

"اگر کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔" میں نے میز پر پڑے بڑے جلتے ہوئے گلوبوں کے عکس کو دیکھا، چمکتے فرش میں ڈوبی روشنیوں کی جھلملاہٹ کے اوپر بیٹھے یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی ہون کنڈ میں سلگ رہے ہوں۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا میں تمہیں کیا بتاؤں، اگنی کا کونسا روپ تاکہ تمہیں وہ اُسی طرح دکھائی دے جیسے مجھے دی تھی تم اسے اسی طرح جان سکو اس کے دُکھ اس کے جی کے روگ اس کی فکرمندیاں۔" خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد وہ بولا۔

"اس رات جب میں پوسٹیں چیک کر کے سالم سر پہنچا ہوں تو سخت تھکا ہوا تھا کسی سے بات کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ ہوا کی مخالف سمت میں سفر کرتے رہنے کی وجہ سے اور ریت کے تھپیڑوں سے چہرہ جھل گیا تھا۔ دانتوں تلے ذروں کی کچکچاہٹ کپکپا دیتی تھی اور مسلسل صاف کرتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں جلتی تھیں۔ اور کھُل نہیں رہی تھیں۔ اردلی ٹوبے کا گدلا پانی میرے ہاتھوں میں انڈیل رہا تھا کہ میں منہ پر چھپکا ماروں ذرا دم لوں۔ یہ مہینے ریت چلنے کے نہیں تھے مگر موسم جانے اتنے کیوں بدل گئے ہیں ہر کام بے وقت ہونے لگا ہے۔ جب بارش پڑنے کے دن ہوتے ہیں تو گرد برستی ہے اور جب گرد اڑنا چاہیے آسمان صاف اور بے داغ ہوتا ہے اپنی معصومیت کی گواہی دیتا ہوا۔"

حوالدار نے گوپے کے کھڑکی نما دروازے میں کھڑے ہو کر کہا" حضور دوسری طرف والوں کی پوسٹ سے آدمی ایک عورت کو لائے ہیں اور حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں" ان دنوں حالات اچھے تھے مطلب یہ ہے کہ ہم حالتِ جنگ میں نہیں تھے اور میں نے اس خلافِ قانون بات کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کے علاوہ چند دن پہلے ہم نے ڈاکوؤں کے خطرناک گروہ کو مل کر ختم کیا تھا دونوں طرف سے انہیں گھیرا تھا اور سرحدوں کے رکھ رکھاؤ کے باوجود دوستی کا رشتہ ٹوٹا نہیں تھا۔

" اچھا چائے کے بعد" میں نے مختصر جواب دیا۔

چلئے پی کر میں یونہی بیٹھا رہا سوچتا ہوا کہ یہ عورت کیوں آئی ہے اُسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ بھلا سالم سر سے اُن کی پوسٹ تک کا فاصلہ کبھی زیادہ نہیں تھا" حوالدار دوبارہ آیا تو میں نے کہا چلو بلاؤ۔

ایک ذرا سا ڈیوٹ گوپے کے اندر جل رہا تھا مٹی کے تیل کی بُو پھیلی تھی اور تیز ہوا روشنی کو باہر نکلنے نہیں دیتی تھی اس لئے کافی اجالا تھا۔

" مہاراج یہ ٹھاکر تیج سنگھ آف اچے سر کی دائی ماں ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے ہم نے اس سے بہت پوچھا کہ ہمیں بتا دے مگر وہ صرف آپ سے ہی بات کرے گی۔ جو کہنا ہے آپ سے ہی کہے گی"۔

خُوب تو یہ اس مہم جُو صحرا میں پھرنے والے آوارہ گردوں کے گروہ کی نائب سردار تیج سنگھ آف اچے سر کی دائی ماں ہے۔ میں نے بڑی لاپروائی سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے بھاری گھاگرے کو سمیٹ کر اور جُھک کر دو آدمیوں کے سہارے جو عورت اندر داخل ہوئی اُس کے جھریوں سے بھرے چہرے میں لگتا تھا جیسے صدیاں منجمد ہو گئی ہوں۔ وہ کانپ رہی تھی جیسے زمانوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو، اس کے پرنام کے لئے اُٹھے جُھرّیوں بھرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

گوپے میں بیٹھنے کے لئے اس ایک کھاٹ کے علاوہ کچھ نہ تھا میں اپنی جگہ بہت بے چین ہوا۔ اور پھر میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

" کہو ادھے پہلے تم ہی کہو" اس کی آواز مجھے زندگی سے پُر تازہ اور اس کیف جسم کے ہیں با ۔ ۔ آتی لگی۔

مہاراج ہم سکھا کے لئے آئے ہیں"

" کیوں" مجھے لگا یہ قصہ اب ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہے گا۔

"تم لوگ سکھما کا کیا کرو گے اس کے لئے کیوں آئے ہو؟" میں نے ذرا تیزی سے کہا۔

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے بیٹے وہ میری بہو ہے میرے چھوٹے ٹھاکر کی پسند، اس کا ٹھکانہ بھلا میرے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے؟"

میں اسے کیا جواب دیتا۔ پکڑے جانے پر جگمل سنگھ کے ساتھ ہی سکھما نے جو بیان دیا تھا وہ اس بڑھیا کے یقین کے چوکھٹے میں کہاں سجایا جا سکتا تھا؟

میری خاموشی لمبی ہوتی گئی۔

باہر ہوا بڑے زور اور تندی سے چلنے لگی تھی پاگل تھنی کی طرح وہ چنگھاڑتی لگتی تھی۔ اور پھر بالکل ساکت ہو جاتی جیسے گھات میں ہو اس کے ساتھ ہی صحرا بھی چیختا لگتا تھا۔ گھوم کر آنے والی صدائے بازگشت کی طرح۔ تم نے زیادہ سے زیادہ عمارتوں کے کھنڈر دیکھے ہوں گے جو بے جان ہوتے ہیں۔ مگر سمندر کی طرح مواج پر ہیبت غصے سے سیاہ ہوتا ابھرا کہاں دیکھا ہوگا۔ ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوا کے ساتھ اڑتے ہوئے۔ پر شکوہ خیال ذرے، بگولے ہر ایک زندہ و تابندہ پرشور اور پھر ریشم کی طرح ملائم ریت۔ گھور کر سے چلتی ہوئی ماتم کرتی عورتوں کے مجموں کی طرح آندھیاں، غم ناک صداؤں سے بھری دل کو مسلنے والی لمبی راتوں کے قافلوں کی سی ہوائیں۔ اور اس کے جو رودھیں اس جادو میں گرفتار ہو جاتی ہیں وہ ماضی سے ناطہ توڑ لیتی ہیں۔ ان کے لئے حال محض چلتے رہنے اور ٹھکانے بدلتے رہنے کا نام ہوتا ہے۔ موسموں کی شدت کا مقابلہ کرتے رہنا اور زندہ رہنا ان کا مقدر ہے۔ بے رحم عناصر کا مقابلہ کرنا، ڈٹے رہنا، اپنے آپ کو مٹنے نہ دینا۔ تیج سنگھ نے جب اس زندگی کو قبول کیا تھا تو وہ اجے سر کی گدی کا مالک تھا۔ اور جے پور کے راجکماروں کے اسکول میں انگریز استادوں سے برسوں پڑھتا رہا تھا۔

"میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی بیٹے" بیٹھنے کی آگیا دو اور وہ وہیں ریت پر بیٹھ گئی۔

"میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں سکھما کے لئے سوال کا جواب دینے سے پہلے؟"

"میرا نام اگنی ہے بیٹے۔ تم ٹھاکر کی طرح مجھے اگنی دا کہہ سکتے ہو تم بھی مجھے اس نام سے پکار سکتے ہو اور ہاں تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے، بیٹھ جاؤ کھڑے رہنے سے تھک جاؤ گے۔"

اس کی آواز نے جانے کہاں اندر کہیں دل کے قریب بہت آہستگی سے مجھے چھوا، بے چین کرنے والی یہ آواز جو حکم نہ دینے پر بھی حکم دیتی لگتی تھی۔ میں بنا کچھ کہے کھاٹ کے کنارے ٹک گیا۔

"کیا پوچھنا چاہو گے کیا کہو گے؟" اگنی دا نے بہت ہولے سے کہا۔ دیئے کی روشنی سیدھی اس کی آنکھوں

یں پڑ رہی تھی اور لو کے گھٹنے بڑھنے سے وہ آنکھیں سمندر کی طرح گہری لگتی تھیں۔ اور پُر شور موجیں ساحل کے بندھن توڑنا چاہتی تھیں وہ بے پناہ زندگی سے بھری نگاہیں جو اپنی معصومیت سے حیران اور اپنی گمبھیرتا سے بے چین کرتی تھیں۔ بیکراں نور کے چشمے کی طرح لگتا تھا وہ جس شے کو بھی چھو لیں گی اسے روشن اور جاندار بنا دیں گی۔

"مجھے پوچھنے کا تو کوئی حق نہیں اگنی دا مگر یونہی میں پوچھنا چاہتا ہوں تمہارے ٹھاکر نے اچے سر کیوں چھوڑا وہ اس گدی کا مالک تھا نا؟" آخر اس کا نام میں نے لے ہی لیا تھا۔ اور وہ دیوار سی جو ہمارے درمیان تھی وہ اوٹ اٹھ سی گئی جو اجنبی دلوں کو چھپائے ہوتی ہے۔

"ملتھے کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے بیٹے۔" اس کی آنکھیں۔ مجھے لگا دھند سی اتر آئی ہے اور وہ اب بین کرنے لگے گی مگر وہ تو زمانوں پرانی چٹان کی طرح بیٹھی تھی نہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کھڑکھڑائے نہ اس کے ہونٹ کپکپائے اور نہ ہی کوئی موتی ان سفید پلکوں پر کانپا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں اگنی دا" میں نے بہت بے چینی سے پہلو بدلا۔

"سوالوں کے جواب کون دیتا ہے۔ میں نے ساری عمر سوال کئے ہیں کسی پکار کا کبھی کوئی جواب نہیں آیا، گونگی مورتیوں کے سامنے اندھیکارے بھرے مندروں میں بھٹکتی پھری ہوں۔ اور مجھے آج تک یہی پتا نہیں چلا بھگوان ہے بھی کہ نہیں، بنلائے اور اپنائے میں کیا فرق ہے۔"

"میں تمہیں دکھی کرنا نہیں چاہتا۔"

"دکھ نہ دینے کی بات تو یوں کہہ رہے ہو جیسے میں کبھی دکھی نہیں ہوئی۔" زخمی ہنسی نے اس کے آنکھوں کے کونوں کو چھو لیا۔ سر جھکا کر وہ چپ ہو گئی۔

گو پے کے باہر ہوا مدھم سروں میں کسی بڑے راگ کی اٹھان کی طرح تھی اور دے اور اگنی پوجا کرنے والے جھکے ہوئے سر سہاگن کے آسن سے نیچے اترنے کے منتظر تھے پر اگنی کے جی میں کون آس تھی؟

"لوٹ کر دیکھتی ہوں تو کتنا عجیب لگتا ہے۔ امر کو میری گود میں دے کر مہارانی پھول کی طرح گرم ہوا کے جھونکے سے مرجھا را اور ریچھ نجھے دے کر اس کی ماں اسے بھول گئی۔ اور میری گود دونوں سے خالی ہو گئی۔ میں کتنی ابھاگی ہوں وہ جو میرا مان تھے وہ نہ رہے اور میں ان کے نہ ہونے پر بھی سانس لے رہی ہوں۔"

"مہوراج رانی آئی محل میں سہاگن کے پائل چھم سے بجے، رنگوں کی اس دھارا میں میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے غرور سے میں سر اونچا کر کے چلتی تھی۔ داسی ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے کھلی آنکھوں سے جھوٹے سپنے

دیکھے۔ امر میرا بہت مان کرتا تھا اور میں ماں کی طرح ہی اس کا خیال رکھتی تھی میرا بڑا ٹھاکر بڑے جوش سے اور بہت محنت سے اپنا راج پاٹ کر رہا تھا۔ میں سوچتی کبھی کسی داسی کا اتنا مان کاہے ہوا ہوگا اتنی بہت سی خوشیاں جیسے گلال کا پہاڑ ہو، بھگوان کسی کو بھی پوری ثابت ڈھیری خوشی سدا کے لئے نہیں دیتا بیٹے"۔ وہ جیسے کانپ کر چپ ہو گئی۔

"وجے چھوٹی رانی کا بیٹا جب ہمارے آنگن میں آتا تو اس کے قدم پروں کی طرح ہوتے وہ ہوا پر تیرتا لگتا اور بہو کی آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھتے تب مجھے پتا چلا داسی داسی ہی ہوتی ہے ماں نہیں ہوتی، میں اپنے امر کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتی۔ کرنا چاہنے پر بھی کچھ ہو نہیں سکتا۔ سوچنے پر بھی سوچنا نہیں چاہیے۔ دیوانی بنی میں دالانوں میں گھومتی رہتی اور کچھ کہہ نہ سکتی۔ امر نے محسوس کیا میرا رنگ اڑتا جاتا ہے۔ میں ہنستی ہوں تو بہت دکھی لگتی ہوں گی شاید کہ ایک دن اس نے پوچھا۔

"اگنی دا تم اکھڑی اکھڑی سی کیوں رہتی ہو تمہارے من میں کیا ہے؟"

بہو نے اپنی مدھ ماتی بڑی بڑی کالی آنکھیں اٹھا کر گہری نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے مجھے ٹٹول رہی ہو اس کی نگاہ میں میرا مذاق اڑاتی ہنسی تھی۔

میں چپ رہی تو اس نے بہو سے کہا: رانی دا کا خیال رکھا کرو اس نے ہمیں پالا ہے یہ تو میری ماں کے سمان ہے تمہیں کوئی تکلیف ہو تو اپنی بہو سے کہا کرو نا؟"

ٹھنڈی سانس کو سینے میں دبا کر میں نے سر جھکا کر کہا" تم بہت دن جیو اور سکھی رہو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے میرے لال، میں تو صرف تمہاری داسی ہوں، میرا تو سب کچھ تم ہو میں تو اپنا آپ تم پر سے وار سکتی ہوں۔ بھگوان کرے تمہیں کوئی دکھ نہ ہو"

بہو نے پھر میری طرف دیکھا اس کی نگاہ کا اندھیرا گھنگھور گھٹا میں بجلی کے ہر یئے کی طرح تھا۔ میرا دل ہل گیا۔

"رانی اپنے سپنوں میں مگن تھی اور تیج کو بھی بھولی رہتی تھی۔ گھڑی گھڑی گالوں پر امنڈ آنے والی سرخی کو چھپانے کی کوشش کرتی وہ باغ کے اندھیرے ٹھنڈے اور گہرے سایوں میں ہوتی باندیاں اس سے دور تالاب کے کنارے بیٹھی اور پانی میں پاؤں ڈالے اکتارہ بجاتی رہتیں وہ ان دنوں رادھیکا تھی اور اسے کنہیا کا انتظار رہتا۔"

"وجے اور امر اب اکثر اکٹھے شکار کھیلنے جاتے، بہو رانی کنول کی طرح کھل اٹھتی اور میرا دل ڈوبتا رہتا نیہہ کی طرف تیز تیز جانے والے پتھر کی طرح نیچے اور نیچے، اور پھر اس پتھر نے نیہہ کو چھو لیا۔ امر کو شکار کھیلنے میں

گولی لگ گئی۔ میرا سورج گھنیرے بادلوں میں چھپ گیا بیٹے جیسے وہ نیا تیل کا دیا ہو جسے ہوا کا ایک مگر در جھونکا بجھا دے"۔

"تیج چھوٹا تھا اس کے بڑے ہونے تک راج گدی دیجے کے حصے میں آئی اور اس کی چادر نے بھورانی کو ستاروں بھری چنری بن کر ڈھک لیا۔ خاندان کے رواج کے ناطے اُسے یہ چادر اوڑھنا ہی تھی۔ وہ میرے امر کی گدی پر بیٹھا وہ میری بہو کا مالک بنا۔ وہ اس کے گھر کا مالک بھی بن گیا"۔

"مجھے اب اپنے ہوش کو سنبھال کر رکھنا تھا میں اب دیوانی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ سامنے چھوٹا ٹھاکر تھا اور اس کی آنے والی پوری زندگی سنسان دل میں آندھیاں چلتیں پر میں اسے گرم ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ لگنے دیتی اور دیکھا تم نے وہ کتنے سالوں اس صحرا میں رہا اس تپتے ظالم بے رحم صحرا میں جو نہ کسی سے محبت کرتا ہے اور نہ اسے کسی سے لگاؤ ہے دوست دشمن سے ایک سا سلوک کرتا ہے"۔

"دیجے کے بیٹے پیدا ہوئے ہیں تو میرا دل کانپا، سارا وقت انگاروں پر جلتی، میں طاق میں رکھی مورتی سے پوچھتی مجھے کیا کرنا ہے۔ آنسوؤں کے دھارے کو جو میرے اندر سے بہنے اور اُبلنے کے لئے مچلتا تھا روکے سوچتی مجھے اب کیا کرنا ہے کیا کرنا ہے۔ بھگوان کو پکارتی مگر کسی پکار کا کوئی جواب کبھی نہیں ملا"۔

"بیٹیوں کے مونڈن کے دن خوشی کی چہکار میں اور رنگوں کی چھوٹ میں دیجے نے مجھے پالنے کے پاس بلایا، ہم دونوں پتا نہیں کیسے اکیلے ہو گئے۔ "اگنی دیکھو تو کتنے سندر اور کیسے منوہر ہیں میرے بیٹے تمہارے تیج سے اچھے 'در جاگران' اب مہتاب ہی راج گدی کا مالک ہوگا"۔ چیخ کو دبانے کے لئے میں نے زبان اپنے دانتوں سے کاٹ لی۔

بہو دلہن بنی داسیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی دیجے کی آنکھوں میں میرے سپنوں کو چور چور ہوتے دیکھ کر خوشی ناچ رہی تھی۔

"تو اگنی یہ اچھا رہے گا؟" دیجے نے پھر مجھ سے پوچھا۔

"جو بھگوان چاہے گا وہی ہوگا"۔

دیجے کی ہنسی بڑی خوفناک تھی

"تم پتا نہیں کن زمانوں رہتی ہو بھگوان کو کیا ضرورت ہے دخل دینے کی جو میں چاہوں گا وہی ہوگا"۔ اب مجھے لگتا ہے جو اس کی مرضی کے بنا چل پڑے وہ اسے چلنے دیتا ہے روکتا ہی نہیں، دیجے کو بھی اس نے نہیں روکا۔ میں نے رانی سے کہا "بہو تم تیج کا کیوں نہیں سوچتیں وہ بھی تو تمہارا بیٹا ہے"۔

"اگنی تم کچھ زیادہ ہی سوچتی ہو۔ میں اس کی ماں ہوں۔

ماں ہو تم اس کی؟" میں نے پوچھا تھا۔

"ہاں آکاش کیچ میں اترے پر بھی آکاش ہی رہتا ہے۔ بس ہی اس کی ماں ہوں تم تو صرف داسی ہو۔"

دروازہ کھلا وجے اندر آیا، میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ پتا نہیں اس نے میری بات سن لی تھی کہ نہیں۔ اس دن میں سوچتی رہی کہ میں داسی ہوں صرف داسی، پر اندر سے کوئی کہتا، نہیں تم اس بے سہارا بچے کی ماں بھی ہو، میں جو آکاش نہیں کیچ ہوں میں ہی اس بچے کی سب کچھ ہوں۔ میں نے اُسے دودھ پلایا تھا میرے انتر میں اس کے لئے ہُوک اٹھتی تھی۔ اور وہ دوسری عورت وہ وجے کے بچوں کی ماں تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم پر پہرہ کٹھن ہو گیا۔ میں اور میرا ٹھاکر محل کے اس حصے میں جہاں رانی تھی نہیں آسکتے تھے بنا اس کے کسی کو مل نہیں سکتے تھے۔ میں کہیں باہر نہ جا سکتی تھی۔ پہلے ہی باہر کی دنیا سے ہمارے کون سے ناتے تھے جن کے ٹوٹنے اور راہ رکنے کا مجھے غم ہوتا۔

جب میں کہتی "میرا ٹھاکر بڑا ہو گا۔ راج گدی کا مالک بنے گا اپنی ماں کو بھلا تو نہیں دوگے بیٹا" تو وہ بانہیں ڈال کر میرے گلے میں جھول جاتا تو مجھے پتا تھا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ وجے کے ہوتے اس کے بیٹوں کے ہوتے بھلا یہ کیونکر ممکن تھا؟ اسے تو سرے سے اس بات سے ہی انکار تھا کہ امر بھی تھا اور تیج بھی ہے۔

"اگنی میں تمہیں راج بھون سے باہر پھنکوا دوں تو کیسا لگے" اس دن میرے ٹھاکر نے اونچے اڑتے ہوئے وجے کے باز کو نشانہ بنا لیا تھا میں نہ نہ کرتی رہی وہ بچہ ہی تھا اس نے ایک نہ سنی پھر یوں لگا جیسے طوفان آ گیا ہو میں تھر تھر کانپتی ہوئی منتیں کرتی رہی وہ ننھا سا جسم دیواروں کے ساتھ ٹھوکروں سے اڑایا جانے لگا تو میں اس سے لپٹی ہوئی تھی۔

اس دن پہلی بار میں نے اُسے کہا۔ "مہاراج ایسی بھول کبھی نہیں ہو گی۔"

دنوں ہم ماں بیٹا بے ہوش رہے پتا نہیں مجھ میں کچھ ہے جو گرتا نہیں ٹوٹتا نہیں مرتا نہیں۔ ورنہ بیٹے اس بے عزتی کے بعد زندہ رہنے کا کوئی خیال سانس لینے کی کوئی آس میرے جی میں نہ تھی۔ اس نے کوڑوں سے میری کھال ادھیڑ دی تھی۔ زمانوں بعد مجھے لگا زمانے ہی بیت گئے تھے جب وجے کے شکار پر جانے کے بعد ایک رات وہ ہمیں دیکھنے آئی۔ میں نے اُٹھ کر اس کے چرن چھوئے اور چپ چاپ کھڑی رہی ہاتھ باندھے سر کو جھکائے۔

وہ سوئے ہوئے تیج کی پائنتی کھڑی تھی۔ "اگنی اس کا کیا حال ہے؟

"اچھا ہے رانی ماں" میں نے اور داسیوں کی طرح ہولے سے جواب دیا۔

"اگنی" اس نے اُٹھ کر مجھے بازوؤں سے پکڑ کر ہلایا۔ "تم مجھے رانی ماں کہتی ہو میں تو تمہاری بہو ہوں"۔

"میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی بہت سی باتیں مگر میں نے کہا، "کیا حکم ہے سرکار"۔

"اگنی بھگوان کے لئے کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں بھگوان کے لئے"۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ رانی ماں داسیوں سے یوں بات نہیں کرتے، میں نے آنکھیں اٹھائے بنا کہا۔

دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے وہ یوں جھکی جیسے گر گئی ہو۔ اور اس نے پلنگ کے پاؤں پر اپنا چہرہ رکھ دیا، سسکیوں سے اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔

"بچہ بہت دنوں بعد سویا ہے رانی ماں" میں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ ویسے آپ مالک ہیں۔

"اگنی میں پاگل ہو جاؤں گی"۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

پاگل تو مجھے ہونا ہے بہو تم دیجے کے بچوں کی ماں اس کی ماں کیوں نہ بن سکیں۔ تم نے اسے جنم کیوں دیا تھا۔ جب یہ بڑا ہو گا تو اپنے سر کی گلیوں میں کیسے گھوم سکے گا۔ وہ یہاں کا کیا ہو گا۔ تم اس کے لئے عزت سے جینے کی راہ کیوں نہ ڈھونڈ سکیں۔ میری زبان نہ کھلواؤ۔ مجھے زیادہ باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ بس جو ایک داسی ہی تو ہوں جس کے جی میں صرف آگ بھری ہے۔

وہ ایک دم پیچھے ہٹی جیسے ڈر گئی ہو۔

"میرے ہاتھ میں تو کچھ نہیں"۔ وہ بڑی بے بس لگ رہی تھی۔

"تم دیجے کے من پر قابو رکھتی ہو اس کے بیٹوں کی ماں ہو۔" میں اُسے وہ سب باتیں کہنا چاہتی تھی جو اسے بے چین کر دیں اُسے گھرا دیں۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سولہ سنگھار کئے سیندور سے بھری مانگ کے ساتھ سیس پھول پہنے اپنی ساری آن بان کے باوجود وہ ایک معمولی عورت کی طرح زرد ہوئی جاتی تھی جسے اپنے کچھ نہ ہونے کا پورا احساس تھا۔

میں نے پھر کہا "تم نے دیجے کو بہت ہی مہنگا خریدا تھا تم نے بھگوان کو بیچا اور اسے مول لیا آخر کس لئے؟"

وہ گم سم کھڑی تھی جیسے اس میں مجھے جھٹلانے کی بھی ہمت نہ ہو۔ اور پھر اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

"بس اگنی اب اور نہیں"۔

آج تمہیں سننا پڑے گا رانی اگر تم نے اُسے اپنے سر کی چار دیواری سے نہیں نکالا تو وہ سب باتیں جو تم نہیں

چاہئیں اسے پتا چلیں چل جائیں گی میں اپنی زبان کو روک سکتی ہوں دوسروں کی ذمہ دار نہیں پھر جو کچھ چند دن پہلے ہوا ہے روز دہرایا جائے گا۔ اور تم کتنی کٹھور ہو۔

اگنی بھگوان کے لئے رک جاؤ کچھ مت کہو وہ ہاتھوں سے منہ چھپائے تھی اور آنسو انگلیوں میں سے بہہ کر بادلے کی اوڑھنی پر رُک کے تھے چھوٹے موتیوں کی طرح وہ دیکھنے والے کو رجھا سکتے تھے۔

ٹھاکر کا داخلہ جب پورا اسکول میں ہو گیا تو میرا دل ڈوبا ڈوبا سا رہتا پتا نہیں کیا ہو جائے۔ ہر گھڑی پرائے دگوں کے درمیان میرے بنا وہ اداس نہ ہو جائے اور پھر مجھے وجے کی وہ نگاہیں یاد آجاتیں۔

دیکھا بیٹے تم نے میں سدا یہ سمجھتی رہی کہ ٹھاکر کی حفاظت صرف میں کر سکتی ہوں۔ میں اس کے اور دنیا کے درمیان ڈھال بن کر رہی اسے دکھوں کی ہوا سے بچانے کے لئے میں نے سوچا میں ہی خیمہ ہوں میں نے یوں اپنا آپ اس پر پھیلانا چاہا میں نے دھڑکتے دل سے ہمیشہ اسے بچا لینا چاہا۔ پاگل ہوں میں بھی، کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔

جب ساری شکتیاں مل کر اگنی داکے خلاف ہوں تو بھلا میں کیا کر سکتی تھی۔ وہ اسکول گیا ہے تو مجھے صرف ایک ہی خوشی تھی وہ جنگلی جانوروں کی سی عادتیں رکھنے والے چاچا سے تو دور چلا گیا تھا پر کیا وجے کے ہاتھ اتنے لمبے نہ تھے اور اسکول کی چار دیواری میں بھی اسے سرکار اجکمار وجے کا بھتیجا تھا۔ میرا تو وہ کوئی بھی نہ تھا میں اس کی کوئی نہ تھی اور وہ میرا سب کچھ تھا۔

جاتے سمے میں نے اس سے کہا تھا "ٹھاکر مورتی کے سامنے سوگند اٹھاؤ تم اپنے بابا کا بدلہ لو گے۔"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے دا کیسی باتیں کرتی ہو میں بدلہ کس سے لوں اور کیوں لوں، میں تو روز ہی ان چرنوں میں ماتھا ٹیکتا ہوں جو کہتی ہو کرتا ہوں پر آج یہ نئی بات کیوں کہہ رہی ہو۔"

بھولے میرے بھولے میں نے من ہی من کہا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر میں نے اس سے کہا، "ٹھاکر جو میں کہتی ہوں اُسے کرنے میں تمہارا کیا جاتا ہے۔"

اچھا کہوں گا پہلے یہ بتاؤ تمہیں معلوم ہے نا میں موتی کو قابو میں کر سکتا ہوں جب چھٹیوں میں اسکول سے واپس آؤں گا تو پھر مجھے اس پر چڑھنے دو گی نا؟ اور وہ چار سال تک اسکول سے لوٹ کر نہیں آیا۔ اسے آنے ہی نہیں دیا جاتا تھا میں نے چوری چوری ادوے کو بھیجا تو جواب ملا اسے یہاں روکنے کا حکم ہے۔ دوسرے بچوں سے بڑا ہے ناپچھلی کمی پوری کرنی ضروری ہے ہر سال لمبی چھٹیوں میں جب باقی لوگ گھروں کو لوٹتے وہ پرایوں کے ساتھ پہاڑ بھجوا دیا جاتا۔ پتا نہیں میں اسے یاد نہیں آئی اس نے گھر آنے کے لئے ضد نہیں کی۔ آج بھی یاد کرتی ہوں تو ہول جاتی ہوں۔ اس کا چھوٹا سا

دل یہ کیسے سمجھ گیا کہ اجے سر میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اس کا کوئی گھر نہ تھا میں تو بھلا ئی ہوئی نراش باندی تھی دیجے کے بچّوں کی ماں نے کبھی تیج کا سوچا کیوں نہیں۔

میں تو کسی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے میں اس کی ماں نہیں تھی۔

انگریز ریذیڈنٹ کی شکار پارٹیوں کے ہنگامے میں جب بڑی پوجا اور دیوالی آتی تو جانے کسی کو دھیان کیوں نہ آتا کہ اجے سر کا گدی کا مالک کہیں نہیں دکھائی دیتا اور لکشمی کس کے لئے مانگتی ہیں۔

محل کے اس کمرے سے جس میں نیں ٹھاکر کے جانے کے بعد سے رہ رہی تھی نکل کر ایک دن میں نے ہمت کی۔

"رانی میرا ٹھاکر کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

وہ یوں پلٹی جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔

"اچھا ارے یہ تم ہو اگنی کتنی کمزور ہو گئی ہو کتنی بوڑھی ایک دم دھوپ کے سے بال، میں نے پہلی نظر میں تو تمہیں پہچانا ہی نہیں۔"

رانی کی مانگ میں سیندور کی کٹاری میرے دل کے پار اتر گئی اس کی کاٹ بڑی گہری تھی۔ چہرے پر سپنے سجائے وہ اپنے تیسرے بیٹے کے پالنے کے پاس کھڑی اس کے گال کو چھیڑ رہی تھی۔

اگنی اس نے اپنے بیٹے پر جھک کر کہا تو نے دیکھا نہیں شتاب کتنا سندر ہے۔

"ہاں رانی ماں پہلے مہتاب سندر تھا اب یہ ہے راج گدی اب شاید اسے ملے۔"

وہ پالنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اگنی یہ تم کیا کہہ رہی ہو کیسی باتیں کرتی ہو۔

"اگر میں بھولتی نہیں تو تمہارے ایک اور بیٹا بھی تھا سو کیا تمہیں اس کا نام یاد ہے۔ اس کی شکل تمہیں بھول تو نہیں گئی؟

"اگنی" اس نے اتنے زور سے کہا کہ دالانوں میں اِدھر اُدھر آتی باندیاں ڈر کر چھپ گئیں۔ اس چیخ کو سن کر پالنے میں لیٹا بچہ ڈر کر رونے لگا۔

"کیا ہے رانی ماں"۔ میں نے جھک کر کہا۔

"مہاراج اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہی ہو گا میں کسی کو دوش تو نہیں دے رہی۔" اور میں چلی آئی۔

یوں چار سال بعد وہ لوٹا تو میں اسے پہچان ہی نہ سکی۔ اترسے نکلتے قد کا اور اس کی طرح سُندر، چہرے پر

دہی موہنی اور بھولپن ، میں کھڑی اسے تکتی رہی آنکھیں جھپکائے بنا۔

"اگنی دا تم مجھے پیار نہیں کرو گی اس نے جھک کر اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ رات اپنے پرانے کمرے میں لیٹے اس نے کہا دیکھو تم سے چھپاؤ گی کچھ نہیں۔ بھگوان میں نے من ہی من میں مورتی کے چرنوں کو چھوا پتا نہیں وہ بے چلنا اور بولنا میں نے سکھایا تھا اب مجھ سے کیا کہنے والا تھا کون سے راز تھے۔

"بولتی نہیں ہو دا، تجھے بتاؤ گی باتیں جھوٹ بھی ہو سکتی ہیں نا لوگ جھوٹی باتیں بھی تو بنا لیتے ہیں۔"

"بڑے گیان وان ہو تمہیں تو معلوم ہو گا۔"

"مگر میں کہتا ہوں تم تو جھوٹ نہیں بولو گی نا؟"

"ارے ٹھاکر بیٹے کتنے ہوشیار ہو گئے ہو تم کیا گھیرا ہے مجھے؟"

"جو پوچھوں بتاؤ گی نا!"

کانپتے دل کو پکڑتے ہوئے میں نے کہا بھلا تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں۔

تمہیں میری سوگند دا ٹھیک کہنا پھر وہ چپ ہو گیا جیسے لفظ ڈھونڈ رہا ہو۔ اندھیرے میں ٹھیک جگہ نشانہ لگانے کا سوچ رہا ہو۔ پھر وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ سردیوں کی اس کالی رات میں جب سوائے ستاروں کے اور کچھ بھی نہ تھا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا جیسے اندر اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"میں نے کہا ٹھاکر پوچھتے نہیں ہو کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"دا وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا: تم جھوٹ نہیں کہو گی اور میں وہ سچ برداشت بھی نہیں کر سکوں گا؟"

"میرے بیٹے میرے ٹھاکر میں نے کچھ نہ کہا صرف اس کے بازو پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

کہنے سے بچنے کے لئے اس نے کہا "تمہیں پتا ہے دا میں کیا پوچھوں گا؟"

مجھے کیا پتا لگنا چاہیے، میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کھاٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"دا دا بولتی کیوں نہیں ہو؟ وہ پھر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھاکر ساری باتوں کو جاننے کا سمے ابھی نہیں آیا ابھی وہ گھڑی نہیں آئی میرے چندا!"

"نہیں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ابھی اسی گھڑی یا پھر سمے نہیں ہو گا۔"

سمے نے آپ سے آپ میرے دوار کھٹکھٹائے تھے مجھے کچھ تو کرنا تھا۔

"تم کیسی دائی ماں ہو اگنی دا پھر وہ بے حال سا ہو کر پاس پڑی کرسی پر گر گیا جیسے چار سال پیدل چلتا رہا ہو۔

مجھے اسے جواب دینا تھا مجھے کچھ تو سوچنا تھا میں اکیلی اتنا بڑا بوجھ کیسے برداشت کر سکتی تھی میرے کندھے بہت ہی کمزور تھے۔

"جانتی ہو یاد ہے تم نے جاتے ہوئے مجھ سے سوگند اٹھوائی تھی کسی سے بدلہ لینے کی بات کی تھی۔ وہ بدلہ کیا تھا۔ کس سے تھا تم نے کیا کہا تھا تمہارے من میں کیا تھا دا ؟"

ہم ساری رات جاگتے رہے دونوں ایک دوسرے کو چمٹے بیٹھے رہے جیسے تیز آندھی میں کھلے آسمان تلے بیٹھے ہوں۔ ہمارے چاروں طرف گھور اندھیارا تھا اور جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کا انجام سوچ کر ہی میں کانپ جاتی تھی۔ اسے ہر حال میں اس گدی کا مالک بننا چاہیے۔ اسے اپنی آنے والی زندگی کا خیال نہیں تھا۔ وہ اب میرے بس میں کہاں تھا۔

جاسوس باندیوں کی نظروں سے بچتی بچاتی جب میں وجے کے بیٹوں کی ماں کے پاس پہنچی تو وہ اکیلی تھی مجھے دیکھ کر اس کا رنگ سفید ہو گیا جیسے یقین ہی نہ آیا ہو۔

بہو اگر تم اب بھی نہ آئیں تو پھر کبھی بھی اس تک پہنچ نہ پاؤ گی۔ اس کے اور تمہارے درمیان اس سے بھی بڑی دیواریں بن جائیں گی جنہیں تم کبھی پھلانگ نہ سکو گی وہ ان دیواروں کے اندر بند ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ نیند سے ماتی آنکھیں کھول کر اس نے کہا۔

"جانے تم کیا کچھ کہتی رہتی ہو جانے کیوں کہتی ہو۔"

اندھیری راہ داریوں سنسان دالانوں پچھلے آنگنوں اور چور دروازوں سے ہوتی ہوئی جب ہم آئی ہیں تو وہ ریوالور کو الٹ پلٹ کرتا ابھی تک کھڑا تھا دیے کی روشنی میں وہ بدلا ہوا اور کوئی اجنبی جان پڑا۔

دہلیز کے پار وہ رک گئی جیسے ڈر کے مارے اس کے قدم اٹھ نہ رہے ہوں۔

"بہو کیا کرتی ہو آتی کیوں نہیں ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے سے کہا۔

اس نے سر گھما کر ہماری طرف دیکھا، پتا نہیں میرے جانے اور آنے کے بیچ کیا ہوا تھا وہ میرے کندھے پر ٹکا ہوا پیار کے لئے جھکا ہوا۔ اگنی داکھ کر چمک سی پکڑنے والا چہرہ کہاں گم ہو گیا تھا ؟

ریوالور پھینک کر وہ ادھر آیا جدھر ہم دونوں کھڑی تھیں۔

"دا تم میری بات کا جواب دیئے بنا کہاں چلی گئی تھیں ؟"

"میں جواب نہیں دے سکتی تھی چندا میں تو صرف داسی ہوں اور داسیاں ایسی بہت سی باتیں نہیں کہہ سکتیں

بہت سے بوجھ نہیں اُٹھا سکتیں"۔

وہ ہنسا تو مجھے لگا کتنی دکھی تھی اس کی مسکراہٹ۔

"تم داسی تو ہو نا ہیں تو وہ بھی نہیں، ٹھکانے کے بنا آسرے کے بنا، ماں آخر میں ایسا کیوں ہو گیا ہوں"!

بہو نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں کو چھوا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ نہیں یوں نہیں پہلے تمہیں میری بات کا جواب دینا ہوگا۔

"میں ہی جو ایک کمزور عورت ہوں جس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں"۔ رانی کے ہاتھ اس کے پہلوؤں پر گر گئے "میں جو خود کہیں نہیں ہوں"۔

"ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہے تمہارے اختیار میں میرے بابا کو زہر کھلانا تو تھا نا"!

"ٹھاکر ریچ" وہ چیخ کر وہیں گر گئی۔

مجھ میں تو اُسے اٹھانے کی ہمت نہ تھی امر کا بیٹا بھی وہیں کھڑا رہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے، یہ سب جھوٹ ہے"۔ اس نے سر کو زمین پر مارتے ہوئے کہا: میں ایسا نہیں کر سکتی تھی نہیں بیٹے میں ایسا نہیں کر سکتی تھی"۔

"مورتی کے چرن چھو کر ایسا کہہ سکتی ہو"۔ مجھے لگا وہ بڑا کٹھور اور بہت ہی ظالم حاکم ہے۔ اس کی آواز میں نہ منت تھی اور نہ نرمی، اجے سنگھ یہ راجکمار میری گود میں کہاں پلا تھا؟ جے پور اسکول سے آنے والے اس راجہ کو میں نہیں پہچانتی تھی۔

وہ اٹھی تو اس سے چلا نہیں جاتا تھا ٹانگوں کو گھسیٹتی وہ مورتی کے طاق سے سر ٹکا کر کھڑی رہی، کھڑی رہی۔

گوپے کے باہر ہوا چپ تھی جیسے دم سادھے اگنی دا کی بات سن رہی ہو۔ اسے مجھ سے جدا ہوئے دس سال ہو گئے ہیں بیٹا۔ بن باس کے یہ دس سال جس کے آخر میں کوئی امید نہیں جب وہ گیا ہے تو بچہ ہی تھا۔ وقت کیسے گزر جاتا ہے۔

امر کا گھوڑا بہت بے چین تھا اور طوفان میں مخالف سمت دوڑنے کے لئے بے قرار، دریا چپ تھی اور سوئے ہوئے اجے سنگھ پر پھر کبھی دن نہیں نکلا اور یوں میں اس کی اگنی دا بگولوں کی راہ میں دریا جلانے کا سوچتی رہی اور میں نے ٹھاکر کو کھو دیا، لگا میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں نے باہر جھانکا ڈھلے ہوئے نہایت سیاہی مائل، نیلے آسمان میں لاتعداد ستاروں کے کارواں تھے اور کہکشاں میرے سر کے اوپر سے نور کا غبار لئے کہیں دور پرے آبشار کی طرح

صحرا کے پار گر رہی تھی۔ فضا میں ذرا سی گرد نہیں تھی۔ ہوا ٹیوبوں کے اوپر کی نمی سے بھرے گھاگرے کو سنبھالتی زیورں سے لدی رانی کی طرح سہج سہج قدم اٹھا رہی تھی۔

کرنل بیٹے میری بات کا جواب بھی تو دو۔

"سکھا اپنے باپ کے گھر چلی گئی میرے یہاں آنے سے بھی پہلے پوسٹیں چیک کرنے سے بھی پہلے، اس کا کوئی ٹھکانہ بھی تو نہ تھا وہ سدا میرے گھر میں تو نہیں رہ سکتی تھی۔"

پھر میں نے اگنی داکی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا اب بھی اور میں نے اندھیرے میں الٹکل سے ہاتھ مار کر روشنی کا بٹن دبانے والے کی طرح اس کی نگاہوں کی اتھاہ تاریکی سے ڈر کر کہا۔

سکھا کو ٹھاکر سے بہت لگاؤ تھا اگنی دا ابھاگن کی طرح وہ اداس تھی اس نے ٹھاکر کے بعد اپنی مانگ دھو ڈالی تھی اور چوڑیاں توڑ دی تھیں۔

"پتا نہیں ان برمے کی طرح چھید کر دل کے اندر اتر جانے والی اور زمانوں کے پار جھانک لینے والی نگاہوں نے میرا جھوٹ پا لیا کہ نہیں؟"

جمیلہ ہاشمی

کیسری

ہوا آج بھی گرم اور جھلسا دینے والی ہے تیزی سے چلتی ہوئی گرد کے طوفان کو اپنے پیچھے اٹھائے ایسی عورت کی طرح کانپ رہی ہے جسے ضرورت سے زیادہ بوجھا ٹھا رکھا ہو اور جس کا کوئی بچہ اسکی مدد کرنے کیلئے زندہ باقی نہ رہا ہو۔ میں بوجھل دل سے ہولے ہولے قدم اٹھاتا عدالت کے کمرے سے اٹھ کر موٹر تک جانے کی کوشش کر رہا ہوں جہاں میرا شوفر میرا منتظر ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے میں کبھی اس تک پہنچ نہیں پاؤں گا۔ میرے قدم پاتال کی طرف اٹھ رہے ہیں میں نیچے گر رہا ہوں اور زمین کے اندر کی ساری آفتیں میرا سواگت کرنے کو موت کے کئی روپ بنکر میری طرف آ رہی ہیں۔ یہ گرمی کا اثر ہے۔

کیسری کی حیرت سے کھلی آنکھیں ہر گھڑی میری راہ میں آتی ہیں میری طرف غور سے دیکھتی ہوئیں مگر اُن آنکھوں میں رحم کی التجا نہیں ہے خوف نہیں ہے افسوس نہیں ہے صرف حیرت سا ہے جیسے کھیتوں سے آتے ہوئے کسی موڑ پر اُسے روپ سنگھ نے پکارا ہو۔ وہ پکار جس سے مایوس ہو کر اُسنے روپ سنگھ کو مار دیا تھا۔

گوندوال سے شہر جانے والے راہ پر آج بھی وہی رونق ہو گی۔ ہوا کے ساتھ پتے اڑ رہے ہوں گے نہر کا پانی اُسی طرح لہروں کے بل کھاتا آگے ہی آگے جا رہا ہو گا۔ نہر کی پٹڑی پر عورتیں جوتے بلوؤں میں باندھے بچوں کو اٹھائے ننگے پاؤں تیز تیز گاؤں کی طرف آ رہی ہوں گی۔ سائیکل سوار سروں کو دھوپ سے بچانے کے لئے صافے لپیٹے ٹانگیں چلاتے اترتے جاتے ہوں گے۔ سبھی کچھ وہی ہو گا پر کیسری نہ ہو گی کیسری جس کی اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے آج میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی جیسے اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔

کیسری کی کہانی وہی عام کہانی تھی جو اس دنیا میں لاکھوں بار دہرائی گئی ہے عورت نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ پریم کی چوکھٹ پر تج دیا اور جب اس دوار سے اسے دھتکار ملی تو بدلے میں اُسنے اس مندر کو ہی اجاڑ دیا مورتی بنانے والے ہاتھوں نے فیصلے کی گھڑی میں مورتی کو آسن سے گرا دیا۔ زندگی کی کہانی عجیب ہے کیونکہ ہر آدمی اسکو اپنے خیال کے مطابق ڈھال لیتا ہے کوئی ایسا بندھا ٹکا اصول نہیں جو اسکو ترتیب دے سکے۔ جانے کتنی صدیوں سے یہ دنیا آباد ہے اور پھر بھی ہر کوئی دنیا میں پہلی بار آتا ہے دُنیا کے نئے پن سے حیران ہوتا ہے اور اپنے خون سے اس کہانی کا انجام لکھتا ہے اور چپکے سے مندر میں اپنے دل کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ تب ہی تو ایسی ایسی باتیں جن کو اچھا یا بُرا نہیں کہا جا سکتا دشمنی کا سبب بن جاتی ہیں ننھی ذرا سی رقابتیں چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہولے ہولے تناور درختوں کی طرح زندگی کی راہ پر چھا جاتی ہیں۔ تو کیسری بھی دنیا میں آئی مورتیاں بنا کر مندر کو سجاتی رہی اور یہاں سے ہی اُس کی کہانی عام کہانیوں سے ذرا مختلف ہے کم از کم مجھے تو وہ ایسی ہی لگی تھی کیونکہ میں کیسری کو بچپن سے جانتا تھا۔

گوردوارے کے گیان جی کی بیٹیاں میری بہن رُکمن کے ساتھ جب آنگن میں کھیلنے آتیں اور پینگ پر جھولتی ہوئی گیت گاتیں تو کیسری اپنی دیوار پر سے ہمارے آنگن میں جھانکتی وہ اُن دنوں ذرا سی بچی تھی یہی کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ رُکمن یوں بھی اس سے بڑی تھی اور جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں ٹانگ برابر لڑکیوں کو کب اپنے ساتھ کھلاتی ہیں۔ میں ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا اور لڑکیوں کی طرف بہت حقارت سے دیکھتا۔ جب میری بہنیں دیر کہہ کر مجھے اپنا کوئی کام کہتیں تو میں بہت منتیں کروانے کے بعد بھی ان کا کام کر کے نہ دیتا۔ رکمن کی سہیلیاں گلی کی لڑکیاں سب مل کر آنگن میں خوب شور مچاتیں اور کیسری کو میں دیکھتا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیوار کے پار سے چمکتیں جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔ پھر اس کی ماں آواز دیتی اور وہ یوں غائب ہو جاتی جیسے کسی نے نہر کے بہتے پانی میں ڈبکی لگائی ہو۔ ہوا میں بلبلے سے پھوٹنے لگتے اور دیوار کا وہ ٹکڑا سات رنگوں میں نہا جاتا جیسے آکاش پر سے پینگ کے رنگ دھرتی پر آن براجے ہوں۔

مجھے کیسری کی اُن دنوں کی صورت یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ صرف نیم کے پتوں میں جھولتے

جھونکے یاد ہیں اور گیانی جی کی وہ بیٹیاں جو رکمن کے پہلے یا پیچھے بیاہی گئیں اور جب بچوں کے ساتھ رکمن سے ملنے ہمارے گھر آئی ہیں تو عورتیں لگتی تھیں۔ میں نے اسکول ختم کیا تو باپو نے مجھے کالج میں پڑھنے امرت سر بھیج دیا۔ گوندوال میرے لئے ایک ایسا ماضی بن گیا جس کو فارغ گھڑیوں میں رات کو بستر میں گھس کر یا گنوں کے رس کی باس کو سونگھ کر یاد کیا جا سکے۔ اور میں بہت ہی مصروف رہا ہوں۔ آج تک مجھے کیسری کو یاد کرنے کی فرصت کب ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب کبھی میں چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو وہاں میرا دل ہی کب لگتا تھا۔ میرے ماما کا گھر شہر میں تھا اور میں اکثر چھٹیاں شہر میں گزارتا پڑھنے میں لگا رہتا اور میڈیکل کالج کی لڑکیوں کو پریاں سمجھتا جو ہاتھ نہیں آ سکتیں۔ اوہ پر بات تو کیسری کی ہو رہی۔۔۔ جب میں مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور بڑا بننے کے سپنے دیکھنے تک کی فرصت نہ تھی مجھے باپو کی چٹھی ملی کہ ماں بہت بیمار ہے اور میں گھر آؤں گاڑی جنتی پور کے اسٹیشن رکی ہے تو شام کا دھندلکا گنوں کے کھیتوں پہ نیلا ہو رہا تھا اور گاؤں تک چلنا مجھے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پھر ان سارے سالوں جو میں ماں سے دُور رہا تھا مجھے دکھ ہو رہا تھا اور مجھے ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ گھر یاد آ رہا تھا اور جانے کیوں میں اتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا شاید کوئی سواری باپو نے بھیجی ہو مگر کوئی نہیں تھا اور اسٹیشن کی عمارت سے پرے کھیتوں پر رات ہولے ہولے اُتر رہی تھی ہوا میں تازہ رس کی باس تھی اور گڑ کی مہک تھی پانی کی بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے میرے سر پر سے گزر رہے تھے میں جانے بوجھے راہ پر اجنبیوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ آنگن جس میں نیم کا درخت تھا مجھے بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔

پھر لال رنگ کے بادلوں سے پرے سورج کا گول تھال سرک گیا اور درختوں پر چڑیاں زور زور سے بولنے لگیں۔ میرے سر پر سے کوے اور بگلے قطاریں باندھے گزر گئے۔ شام کی ہوا چلی عورتیں سروں پر چارے کے گٹھے لئے راہ کی بستیوں میں گم ہوتی گئیں اور گڑ کے کڑاؤ کے نیچے جلنے والی آگ زیادہ روشن ہو گئی نہر کی پٹڑی پر چڑھا ہوں تو پانی اندھیرے میں چمکنے لگا اور لہریں ہولے ہولے مجھے سوتی ہوئی لگیں۔ آم کے باغ کے پاس مجھے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور پھر لگام ہاتھ میں پکڑے ویروال سے اپنے گاؤں کی طرف مڑنے والے راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔

مجھے دیکھ کر آج کی طرح اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"ویرو تم کہاں سے آرہے ہو" اسنے اپنے سر پر پلو کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"شہر سے" میں نے اسکے برابر چلتے ہوئے کہا۔ "ماں کا کیا حال ہے؟ مجھے تو آج ہی باپو کی چھٹی ملی تھی کہ ماں بہت بیمار ہے۔"

"چاچی اب تو اچھی ہے۔ پرسوں اس کا جی بہت خراب ہو گیا تھا۔ رکمن بھی آئی ہوئی ہے۔" اسنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لگام گھوڑی پر ڈال دی۔ گھوڑی سر جھکائے آگے آگے چل رہی تھی۔ میرے جی پر سے ماں کے اچھے ہونے کا سنکر بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اکا دکا تارے گلی میں کھیلنے والے بچوں کی طرح آکاش پر اکٹھا ہو رہے تھے اور حویلیوں میں دیئے ٹمٹما رہے تھے اور کیسری کی آنکھوں میں جوت بہت گہری تھی۔ جیسے اسکے اندر کہیں دیوالی ہو رہی ہو۔ اپنے پاس چلتے ہوئے میں نے ایک عجیب سی سوگند اس میں پائی جو نہ کھیتوں کی تھی نہ مٹھاس کی نہ شام کی ہوا کی تھی اور نہ پانی کی۔ گھاس کی میٹھی سی باس بھی نہ تھی اور گوردوارے میں جلنے والی بتیوں سے بھی نہیں تھی۔ اکیلی نرالی انوکھی سی۔

میرا دل اُس باس کے ساتھ ساتھ بھٹک رہا تھا اور ہم دونوں گھوڑی کے پیچھے چل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ ساری چاچیوں، ماسیوں اور بہنوں کی باتیں۔ میں دل ہی دل میں حیران تھا کیسری کا بیاہ اب تک کیوں نہیں ہوا۔ اسکے ساتھ کی ساری کنواریاں بیاہی جا چکی تھیں۔ ہمارے آنگن میں نیم تلے ہوئے ہوئے نئی جوان ہوتی لڑکیوں نے رکمن کی سہیلیوں کی جگہ اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔

جب گوندوال دکھائی دینے لگا تو میں نے پوچھا "تم کہاں سے آرہی تھیں"۔ ویرووال کسی کام سے گئی تھیں؟"

مدھم پڑتی روشنی میں جو اجالے سے زیادہ اندھیرا لگتی ہے جس میں چیزوں کی شبیہ مٹ نہیں سکتی میں نے نیلاہٹ کی پرچھائیں میں جو رات اور شام کچھ نہ تھی کیسری کی طرف دیکھا اس کا منہ تپ گیا تھا اور لمبی لمبی پلکیں اُن بڑی بڑی آنکھوں پر یوں جھکی تھیں جیسے وہ نئی دلہن ہو۔ اسنے میری طرف دیکھے بنا جواب دیا "روپ سنگھ ولایت جا رہا ہے"۔

"کون روپ سنگھ" میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لمبڑوں کا پوت" اسنے یوں جھنجلا کر جواب دیا جیسے اُسے میرے بھول جانے کی کوشش پر غصہ آرہا ہو۔

"اچھا ویروال والے لمبڑوں کا روپ سنگھ ۔ سنے اسکول ختم کرلیا ہے۔" میں نے اپنے یاد کرنے کی قوت پر خوش ہوتے ہوئے سر ہلا کر کہا " وہ ولایت کیوں جا رہا ہے اس کا باپو تو پڑھنے والے لوگوں کے خلاف ہے۔ وہ روپ سنگھ کو کیسے اتنی دور بھیج رہا ہے۔"

میں نے ایک سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

"روپ سنگھ کہتا ہے ولایت سے آکر وہ اپنے باپ کی زمینوں سے بے فکر ہو جائے گا اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو جائے گا۔" کیسری نے بہت دھیرے سے یوں کہا جیسے وہ رس کے گھونٹ پی رہی ہو اور مٹھاس سے اسکے ہونٹ چپک رہے ہوں۔ شام کی ہواؤں میں میں نے اسکی لمبی چوٹی کو اسکے پیچھے لہراتے دیکھا جب وہ اپنی حویلی کی طرف جانے کے لئے گھوڑی کی باگ پکڑ کر مڑ گئی ہے میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا کمن سے نکلتے ہوئے قد کی جیسے درخت کی ٹہنی میں سے نئی پھوٹی ہوئی لمبی شاخ ہو سرخ پتوں سے بھری ہوئی اور زندگی کے رس سے چمکتی ہوئی۔

آج بھی جب وہ عدالت میں کھڑی تھی زندگی کا رس اس کے انگوں سے ٹپکتا تھا سیدھی نئی نویلی شاخ کی طرح چمکتی ہوئی وہی کیسری جو اس شام گوند وال کی گلیوں میں لمبڑوں کے روپ سنگھ کا سوچتی ہوئی گھوڑی کی باگ پکڑے ہولے ہولے جا رہی تھی اور جسکے ہونٹ ایک نام کی مٹھاس سے چپک رہے تھے۔

میں حیران ہوں اور سوچ نہیں سکتا کہ مٹھاس زہر بھی بن سکتی ہے؟

گوند وال میں میں بہت کم ٹھہرا۔ ماں کا جی اچھا تھا وہ میرے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ رکمن کے آدھ درجن بچوں نے شور مچا کر میرا سر کھا لیا۔ ملنے والوں نے مجھے پریشان کر دیا اور آنے والے مقابلے کے امتحان کی یاد نے میرا دو دن وہاں ٹھہرنا مشکل کر دیا۔ تیسرے دن جب میں شہر آ رہا تھا تو جنتی پور تک باپو مجھے چھوڑنے آیا۔ گاڑی کے آنے تک وہ مجھ سے گھر، کھیتوں، محصول اور لوگوں کی باتیں کرتا رہا۔ پھر دبی زبان سے اسنے لمبڑوں کا ذکر کیا جو چاہتے تھے کہ اپنی بیٹی مجھے دیں مگر یہ بات خود کہنا نہ چاہتے تھے۔ تب اس گھڑی مجھے کیسری یاد آئی اور میں نے باپو سے پوچھا "میں نے سنا ہے روپ سنگھ ولایت جا رہا ہے؟"

"ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی۔" باپو نے حیران ہو کر پوچھا "تجھے کون یہ بات

بتا گیا ہے؟

تب میں نے یونہی کسی وفا کی خاطر نہیں بس ایسے ہی کیسری کا نام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور باپو سے کہا "مجھے ملنے والوں میں سے کسی نے بتایا ہے۔"

باپو نے ہولے سے کہا "ہمارے گاؤں میں سے تو کسی کو معلوم نہیں شاید جیت سنگھ کے گھر سے بات نکلی ہو۔ تمہیں نہیں پتہ لوگ کیسری اور روپ سنگھ کے لئے کیا کیا کہتے ہیں؟"

میں پھر بھی چپ رہا تو باپو نے کہا "ایک طرح سے تو اچھا ہی ہے وہ ولایت چلا جائے گا تو کیسری کے جادو سے نکل جائے گا وہاں اس کا دل کسی اور میں لگے گا۔ واہ گرو کسی کو ایسی لڑکی نہ دے کیسری تو ڈائن ہے گاؤں بھر سے کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔" پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگا "توبہ توبہ میں بھی بیٹیوں والا ہوں کس کی باتیں کیوں کروں۔ ہو سکتا ہے لوگ جھوٹ کہتے ہوں کیسری ذرا دلیر سی لڑکی ہے۔" اور تب مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جو ہمارے ہمارے آنگن میں دیوار کے اوپر سے جھانکتی تھیں اور ایسی لگتی تھیں جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔

گوندوال بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ میں مقابلے کے امتحان میں اول آیا اور اکیڈیمی میں ٹریننگ کے لئے چلا گیا۔ ایک سال کے بعد جہاں میری پوسٹنگ ہوئی ماں بھی وہیں پر آگئی۔ اصل میں وہ مجھ سے میری شادی کی بات کرنے آئی تھی۔ پر اُن دنوں میں گورداسپور کے لشن سنگھ کے گھر میں بہت آتا جاتا تھا اور اس کی تیج کور سے جو کی کہلاتی تھی انگریزی تیزی سے بولتی تھی اور ولایتی میموں کے سے بال بناتی تھی زبردستی عشق کر رہا تھا۔ ویر وال اور ملبٹروں کا قصہ میرے لئے پرانا ہو چکا تھا میرے طور طریقے دیکھ کر میری بہت ہی دھیرج والی ماں نے شادی کی بات نہ کی۔ جب شام کو ہم سب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو وہ گاؤں اور ہمسایوں کی باتیں کرتی رہی۔

میں نے پوچھا "ماں کیسری کا بیاہ ہو گیا کیا۔"

اور ماں نے بہت ہی دکھی دل سے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا "کہاں اس کا بیاہ ہو گا۔ وہ کسی کو پسند بھی کرے۔ اُسنے جیت سنگھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک روپ سنگھ نہ آئے گا وہ انتظار کرے گی؟ بتاؤ تو۔ تم تو ملبٹروں کی لڑکی سے بیاہ نہیں کرنا چاہتے اور تمی کے پیچھے پھرتے ہو وہ جو ولایت گیا ہے بھلا آ کر اسکو پوچھے گا بھی؟ پھر بہت آہستہ سے کہنے لگی۔ یوں بھی اب کون

اسکو قبول کرے گا۔ وہ کسی سے کوئی بات چھپاتی تھوڑا ہے۔ جانے کس مٹی سے بنی ہے اتنی بے شرم لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ واہ گرو کرے اُسے تو موت آجائے اسکی ماں نے تو اب طعنوں کے ڈر سے گلی محلے میں آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

جب ماں نے بات ختم کرلی تو میں نے کہا "ماں تجھ سے کس نے کہا ہے میں نمی کے پیچھے پھرتا ہوں۔ وہ تو بشن سنگھ کمشنر ہے نا۔ اور آدمی کو اپنی آئیندہ ترقی کے لئے کسی کسی سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ تو جہاں بھی میرا بیاہ کرے مجھے منظور ہوگا۔ بھلا میں اب ایسا بھی کیا نالائق ہوں کہ تیری بات نہ مانوں گا۔ میں کوئی کیسری ہوں۔"

ماں نے خوش ہو کر میرا منہ چوم لیا۔ میرے سر کو پیار کیا اور بولی "بس بیٹیا تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ لمبٹروں کی جگجیت بڑی سندر اور کم زبان ہے تو ایک ہی تو میرا پوت ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں ایسی بہو آئے جو کم از کم میرے ساتھ مل کر تو رہ سکے۔"

اپنے بیاہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جوت ویسی ہی تھی جیسے اندر دیئے جل رہے ہوں۔ وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی سب سے الگ جان پڑتی تھی اور اسکی آواز سب سے اونچی اور میٹھی تھی۔ آج وہ دیوار کے پار سے ہمارے گھر آگئی تھی اور رکمن کے ساتھ کام کرتی سرخ کپڑے پہنے چھم چھم کرتی پھرتی تھی جہاں اور لڑکیاں باتیں کرتی اور ہنستی پھر رہی تھیں وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی جگجیت کو دیکھ رہی تھی جو ہاتھ بھر کا گھونگٹ کاڑھے گیتوں کے درمیان اٹھتی جاتی تھی۔ کیسری کے چہرے پر ایک سایہ سا تھا جیسے دیوں کی لو کے اوپر سے کوئی گذر رہا ہو اسکی آنکھوں پر نہیں پلکوں پر میں نے یادوں اور بیتی گھڑیوں راہ دیکھتے رہنے کی تھکن کو دیکھا مگر وہ ہنس رہی تھی اور نہال ہو رہی تھی

جگجیت کو شہر لے جانے سے ایک دن پہلے میں یونہی شام کو کھیتوں کی طرف نکل گیا سردیوں کی شام گاؤں کو ذرا جلد آلیتی ہے دُور تک آکاش اور زمین کھیتوں کے اوپر سے ملنے کے لئے جھکتے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گلیاں سونی ہو جاتی ہیں آوارہ کتے چوں چوں کرتے بھبھوبل کی راکھ میں سر چھپانے کو ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ گائیں بھینسیں تھانوں پر بندھی اپنے گلے میں پڑی گھنٹیوں کو سر کی حرکت سے بجاتی ہیں۔ گھروں کے اندر دیئے جلتے ہیں۔ اپلوں کی آگ

بھڑکتی نہیں بس جلتی ہے۔ کوٹھڑیوں میں بچے تل شکر کھاتے ہیں۔ عورتیں چرخے کاتتی ہیں اور جوان لڑکیاں گیت کے بول اٹھاتی ہیں۔ بند دروازوں کے پیچھے کھیتوں اور فصلوں کی باتیں کرتے کسان اپنے لڑکوں کو موسم کی باتیں بتلاتے ہیں۔ کہانیاں نیلے دھوئیں کے دھندلکے میں سہانی لگتی ہیں اور دیئے کی لَو ہولے ہولے اندھیرے کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ حویلیوں میں گھوڑیاں ہنہناتی ہیں اور شراب پی کر مدہوش ہوتے جوان اپنے اپنے عشق کے قصے کہتے ہیں۔ پرائی بہنوں کی باتیں کرتے ہیں اور گندے گیت گاتے ہیں۔

وہ رات چاندنی تھی اور روشنی میں گندم کے کھیت لہلہاتے ہوئے بھلے لگتے تھے میں دل میں سوچ رہا تھا۔ نمی کیا کہے گی۔ کیا وہ اسی طرح میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کلب میں گھومے گی۔ کیا وہ اُسی دل جمعی کے ساتھ ٹینس کھیلے گی۔ اسنے آج تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے میں کتنا عزیز ہوں مگر دوسروں کو چھوڑ کر میرے ساتھ پھرنے اور ہر مجمع میں میرے ساتھ دیکھے جانے کی آخر کوئی تو تسلی ہوگی۔ میں نے بشن سنگھ کو بتایا تھا کہ کسی کام سے گاؤں جا رہا ہوں۔ اب جب کہ اُسے پتہ چل چکا ہوگا وہ کیا کہے گا۔ اس کی لڑکی؟۔ مگر جگجیت کی آنکھوں میں کاجل کی دھار بہت تیز تھی اسکے جسم کی سوگند نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں جیت کی سادگی پر فدا ہو گیا تھا۔ اسپر صرف میرا حق تھا وہ صرف میری تھی نمی اس رات سے پہلے مجھے کبھی یاد بھی نہ آئی تھی۔

پھر میں نے کیسری کو دیکھا۔

اسنے بنا کچھ کہے مجھ سے پوچھا "ویر کیا ولایت کی عورتیں مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں؟"

وہ میرے سامنے راہ پر کھڑی تھی اور چاند کی کرنوں کا دھارا اس کی آنکھوں اور پلکوں پر کانپ رہا تھا میں نے پاؤں سے سر تک اُسے دیکھا خاموشی سے جیسے میں اس کی خوبصورتی کا جائزہ لے رہا ہوں۔ اُسے پیمانے میں ناپ رہا ہوں۔ اُسے ترازو میں تول رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اس کے چہرے کی موہنی جیسے موتی کی چمک ہو۔ وہ میرے سامنے سانس روکے کھڑی تھی اور میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے اُس رات پہلی بار دیکھا کہ کیسری کا حسن اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اس کی سادگی کا مقابلہ دنیا میں کوئی شئے کر سکتی تھی وہ دنیا کی ساری عورتوں سے اونچی تھی آج تک جتنی کہانیاں

میں نے کتابوں میں پڑھی تھیں جتنی عورتوں کی سندرتا کو میں نے محسوس کیا تھا وہ سب کچھ اس کے سامنے دھول تھا۔ کیسری جیسا آج تک بھگوان نے کوئی پیدا کیا تھا۔ اس کی آن بان رانیوں سے بڑھ کر تھی۔ اُن آنکھوں میں کاجل نہیں تھا۔ ان باہنوں میں چوڑیاں نہ تھیں مگر پھر بھی اس کا سنگار گزری صدیوں کی عورتوں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ کنوار پنے کی نرمی اس اداسی کو جانے کیا بنا رہی تھی مگر میں چپ تھا۔

کیسری نے پھر کہا "کیوں دیر کچھ کہتے کیوں نہیں ہو۔ میں گوندوال کی لڑکی ہوں جانے روپ سنگھ کو پسند بھی آؤں کہ نہیں؟"

میں نے کہا کیسری ایسی رات میں یوں گھومنا اچھا نہیں واپس جاؤ۔ اور یقین کر سکتی ہو تو کرلو کہ دنیا نے ایسا ہیرا پیدا نہیں کیا جو اب تک تمہارے مقابلے پر رکھا جا سکے وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور بولی "دیر یہاں پر کوئی ایسا نہیں جو میری بات سمجھ سکے میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ پر کیا کروں لمبڑوں کا لڑکا مجھے جانے کیوں اچھا لگتا ہے اور میں ساری عمر اس کا انتظار کر سکتی ہوں کیونکہ اسنے کہا تھا کہ میں اسکی راہ دیکھوں۔ تم مجھے بتاؤ ولایت کیسا دیس ہے؟"

شک اور بے یقینی سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

میں نے اس سے بہت اچھی اچھی باتیں کیں۔ اگلے دن میں جگجیت کو لے کر گاؤں سے چلا آیا۔ اور پھر بشن سنگھ نے میرا تبادلہ بہت دور کروا دیا۔ نوکری کا بھی ایک جادو ہے۔ طاقت کا ایک نشہ ہے اور پھر زندگی غیر معلوم طور پر روز کے چکر میں چلتی ہے تو وقت کا پتہ نہیں چلتا پانچ سال کے بعد میرا تبادلہ پھر امرتسر کا ہو گیا۔

نمی ایک شام مجھے کلب میں مل گئی ان پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گئی تھی اسکی شادی میری غیر حاضری میں ایک کپتان سے ہو گئی تھی جو شراب پی کر اسے مارتا اور بہک کر پنجابی گیت انگریزی دھنوں میں گانے کی کوشش کرتا تھا۔ بشن سنگھ کی پنشن ہو چکی تھی اور وہ نہر کے کنارے اپنی بہت بڑی کوٹھی میں رہتا تھا جس کی چوکیداری بھی وہ خود ہی کرتا تھا۔ کتوں، کبوتروں کا چڑیا گھر سا اسنے بنا رکھا تھا اور دنیا سے اپنے حالوں مست کر وہ اپنی اس بنائی ہوئی جنت میں خوش تھا اور کسی کے دکھ کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ نمی کی حالت پر وہ اکثر کہتا تھا کہ اس نے وہی

کیا ہے جو اسنے چاہا ہے کپتان کو گالیاں دیتا اور نمی کو اپنے گھر آنے نہ دیتا۔ میں کلب کے ایک کونے میں بہت دیر تک نمی سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کا تیز انگریزی بولنے کا لہجہ اب بدل گیا تھا میدان میں بہنے والی ندی کی طرح کی روانی اور ٹھہراؤ اس میں پیدا ہو گیا تھا وہ کپتان سے چھٹکارا پانے کے لئے پرانے دوستوں کو ملنے کبھی کبھار کلب چلی آتی تھی جہاں وہ شراب پیتی اور اپنی حالت پر روتی رہتی تھی میں اس سے مل کر بہت اُداس ہو گیا۔ مجھے بیتے دن بُری طرح یاد آئے۔ نمی کا باپ اگر کوشش کرتا تو اس شرابی کپتان سے اچھا کوئی آدمی اس کی بیٹی سے شادی کر لیتا مگر کوشش سے نصیب بدل سکتے ہیں بھلا؟

گھر لوٹتا ہوں تو جگ جیت اور بچے گھر کو سجا رہے تھے روپ سنگھ کا خط آیا تھا وہ کل واپس آنے والا تھا۔ بچے پہلی بار اپنے ماما کو دیکھنے والے تھے۔ جیت کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ بار بار مجھ سے کہتی۔

"جب دیر گیا ہے تو میرا بیاہ نہیں ہوا تھا اب آکر بچوں کو دیکھے گا تو کیا کہے گا اسے کیسا لگے گا۔ وہ خوشی سے سرخ ہو رہی تھی شام تک اس کا باپو بھی آگیا اور گھر یوں جگ جگ کرنے لگا جیسے دیوالی ہو۔

میں اس ساری تیاری کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جگ جیت کا لمبڑ باپ مستقل باتیں کر رہا تھا کہ وہ کس طرح روپ سنگھ کو کسی بہت اچھے گھر میں بیاہے گا اور اتنی خوشی کریگا کہ ساری پچھلی خوشیاں لوگوں کو بھول جائیں اس شام بہت سالوں کے بعد مجھے کیسری یاد آئی اور گوندوال یاد آیا۔ میرا جی چاہا میں گاؤں جاؤں اور اس سے ملوں۔ ولایت کی عورتوں کے حسن کا چرچا اب تو جھوٹا لگنے لگا تھا میں دل ہی دل میں لمبڑ کی باتیں سنکر ہنس رہا تھا۔ بھلا روپ سنگھ کیسری کو بھول سکتا ہے کیسری بھولنے کی چیز نہیں تھی۔

دو چار ماہ کی مصروفیت میٹنگیں اور کانفرنسیں مجھے پھر اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں مگر گاؤں جا کر کیسری اور روپ سنگھ کے حالات معلوم کرنے کی خواہش برابر دل کے ساتھ رہی۔ میں انتظار کرتا رہا کہ کب چھٹیاں ہوں عدالتیں بند ہوں اور میں گوندوال جاؤں۔ جیت اور اس کا باپو تو روز روپ سنگھ کے لئے نئی لڑکیاں دیکھنے کی اسکیمیں بناتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

جفتی پور کے اسٹیشن پر کوئی سواری نہ تھی کیونکہ میں بنا اطلاع کئے آیا تھا۔ شام کو چلتے ہوئے گھر تک جانا اور ماں کو حیران کرنا مجھے سوچ کر ہی بھلا معلوم دیا۔ میں بہت پہلے کی ایک شام کو یاد کر رہا تھا۔ جب ویرووال سے گوندوال کی طرف آنے والی راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا تھا۔ میرا ذہن خالی بھی تھا اور ہلکا بھی جیسے خوشی کا سرور نشے کی طرح ابھی سے چھایا جا رہا ہو۔ اماوس کے لئے نہانے جانے والوں کی ٹولیاں کھیتوں کی منڈیروں اور پگڈنڈیوں پر سے شور مچاتی گزر رہی تھیں شراب پی کر بہکے ہوئے دیہاتی گالیاں بکتے بھاگتے جاتے تھے اونچی آواز میں ماہیا گاتے ہوئے۔ جیدر۔ ڈاکو گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے ایک میلہ سا کھیتوں کے کناروں سے تالاب کی طرف جا رہا تھا۔

ویرووال سے لوگ شام ہو جانے کے باوجود آ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں شام چڑھی ڈلیاں اٹھیں تھیں اور داڑھیوں کے بال ہواہیں لہرا رہے تھے عورتیں روتے بچوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتی لاتی تھیں اور نہانے کے شوق میں اپنے جوڑوں سے بھبکے سر کھجا رہی تھیں۔ میں ناقابل یقین کشش محسوس کر رہا تھا یوں جیسے اگر زمین کے بازو ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہے تو میں اس کے سینے سے لگ کر ایک ٹھنڈک محسوس کروں گا۔

روپ سنگھ کی شادی کی باتیں جو جگ جیت اور اس کا باپو کرتے رہے تھے اور پھر روپ سنگھ کا ان پڑھ لڑکیوں کے ذکر سے ہی چکرانا مجھے یاد آ رہا تھا۔ اصل میں میں کیسری کا انجام دیکھنے کے لئے گاؤں جا رہا تھا۔

لوگ تالاب کی طرف چلے گئے راستہ سنسان ہو گیا اور دور ہوتے ہوئے گیتوں کے بول مجھے شمشان میں گائے جانے والے منتروں کی جاپ کی طرح لگنے لگے اور تاروں کے جھرمٹ اندھیری رات میں ڈرتے ہوئے بچوں کی طرح ٹولیاں سی بنا کر آکاش پر آنے لگے۔ ہر شے تاریکی میں چھپی ہوئی تھی۔ ٹڈوں کے چرچرانے کی آواز ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سُر کی طرح درختوں اور راہوں ٹہنیوں اور پتوں۔ کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر سے بہتی جاتی تھی۔

پھر میں نے تیز بھاگتے گھوڑے کی ٹاپوں کو سنا اور وہ شور قریب آتا گیا اور قریب آ گیا اب میں اس موڑ پر تھا جہاں سے نہر دوسری طرف مڑتی ہے اور گوندوال کا راہ نیچے اتر جاتا ہے سرکنڈوں سے بنے اونچے نالے کے کنارے کو اندھیرے نے ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ اماوس کی رات کو قتل ہوتے ہیں اور

پھر ایسے ایسے واقعات جس کا کوئی کھوج کبھی نہیں مل سکتا۔ میں ڈر نہیں رہا تھا پھر آنے والا اس کالی رات میں گھوڑا دوڑاتا ہوا کون ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تھیلے میں ٹارچ تھی میں نے اُسے نکال کر ہاتھ میں لیا اور خود سرکنڈوں والے کنارے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

روشنی گھوڑی کی آنکھوں پر پڑی ہے تو وہ الف ہو گئی اور ہنہنا کر اسنے سوار کو جو اس مصیبت کے لئے تیار نہیں تھا گرا دیا۔ میں بھاگ کر آگے آیا اور سوار کو اٹھانے کیلئے جھکا ہوں تو وہ کیسری تھی۔

"روپ سنگھ واپس آگیا ہے کیسری" میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا تم ویرا اس سے ملکر آرہی ہو؟"

"ہاں ویر میں اُسے مل کر آرہی ہوں۔ روز روز ملنے کے لئے جانے کی مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی اس لئے میں اسے اپنے ساتھ ہی لے آئی ہوں" اور اسنے پاس کھڑی گھوڑی کی باگ کھینچ کر تھیلے پر ہاتھ رکھا جو کاٹھی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

"مگر وہ ہے کہاں مجھے تو دکھائی نہیں دیتا" میں نے ٹارچ جلا کر روشنی اِدھر اُدھر پھینکی۔

"یہاں" اسنے تھیلے پر ہاتھ مارا "یہاں"

میں نے کہا "مذاق مت کرو تم کو معلوم ہے میں صرف یہی جاننے گاؤں آیا ہوں تم روپ سنگھ کے ساتھ بیاہ کرو گی ہو کہ نہیں۔ مجھے تو وہ بہت بدلا ہوا لگتا تھا تمہارے ساتھ تو وہ نہیں بدلا۔

"نہیں وہ نہیں بدل سکتا تھا میں اسے بدلنے کب دیتی بھلا۔ اب وہ بدل ہی نہیں سکتا ویر۔"

اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

مجھے خون رگوں میں جمتا ہوا لگا۔ یہ کیسری تھی کیا۔ جو دھیرج سے بات کرتی تھی۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور سختی سے پوچھا "تم ہنس کیوں رہی ہو آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے میں نے تم سے ہمیشہ ہمدردی کی ہے اور اب جب کہ تم خوش ہو مجھے بتانا بھی نہیں چاہتیں۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور اسی دھیرج سے بولی "ویر زیادہ خوشی آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے۔ مگر تم میرے ویر ہو اور تم کو نہ بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی بھلا" پھر وہ تھیلے کی ڈوریاں کھولنے لگی

"ویر ذرا بتی تو جلاؤ۔ مگر پہلے چادر سے پردہ کر لو۔ کوئی اور نہ دیکھ لے۔"

میں ایک جادو کے اثر میں آئے انسان کی طرح چادر سے گھر ہاتھ سے اوٹ کرنے لگا اور جب میں نے چادر کا کونا پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے بتی جلائی ہے تو کیسری روپ سنگھ کا سر تھیلے سے نکالے بیٹھی

تھی اور ان آنکھوں میں یوں جھانک رہی تھی جیسے پاگل ہو گئی ہو۔

کیسری تم نے یہ کیا کیا ہے" میں نے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

" کچھ نہیں ویر کچھ نہیں۔ اس کی آواز کی سردی مجھے اپنی کپکپاہٹ کے مقابلے میں بہت عجیب لگی۔ اور پھر سر کو واپس تھیلے میں رکھتے ہوئے بولی۔ اب میں جاؤں کوئی دیکھ نہ لے۔

مگر اسے ساتھ لئے کیوں پھرتی ہو۔ میں نے مستقبل کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس نے گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لی اور تھیلے کو کاٹھی کے ساتھ لٹکائے ہوئے بولی۔ اسی کو ساتھ لئے پھرنے کے لئے تو میں نے آج تک گھڑیاں گن گن کر گذاری ہیں ویر اب اسے کیوں پھینک دوں۔

" مگر کیسری تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔" میں نے یونہی کہنے کے لئے کہا۔

" ویر بھلا میں پاگل ہو سکتی ہوں۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ روپ سے کیسے ملا جائے۔ میں نے ان ٹھنڈی راتوں میں نہر کے کنارے اس درخت کے نیچے پوری پوری رات اس کا انتظار کیا ہے اور اب مہینوں کے بعد جب وہ یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ وہ مجھ سے بیاہ نہیں کر سکتا اور میں اسے تنگ نہ کروں میں بھلا اُسے واپس کیسے جانے دیتی۔ اب میں اُسے دیکھ تو سکوں گی۔ ویر وال کے راستے اب تک مجھے برداشت کرتے رہے تھے۔ اب کیوں میں ساری عمر ان راہوں کے چکر کروں ؟

میں نے اُسے بہت کہا" کیسری یہ سر کہیں چھپا دو۔ اس بات کا کسی کو پتہ نہیں ہے تم موت سے بچ جاؤ گی۔ تمہیں قانون کا پتہ نہیں ہے کیا بننے والا ہے" مگر اس نے کہا تو صرف یہ کہ" میں قانون سے نہیں ڈرتی اور تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میں اسے اتنا چھپا کر رکھوں گی کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہیں چل سکے گا۔ لمبڑوں کے پوت نے پاگلوں کی طرح جھانک کر اور چھپا کر کے مجھے اپنا دیوانہ بنایا تھا۔ اب میں اسے چھپا کر رکھوں گی اور اکیلے میں دیکھا کروں گی۔"

میں نے روشنی بجھا دی اور خاموش کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی" تمہیں پتہ نہیں ویر یہ آنکھیں مجھے کتنی پیاری تھیں یہ ہونٹ کتنے میٹھے تھے۔ دانت تو موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ ان نگاہوں نے مجھے کتنی کہانیاں سنائی ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ویر مجھے روپ سنگھ کے بنا زندگی کتنی سونی لگتی۔ کیا میں اسکے بغیر جی لیتی؟ اگر اسے دوسری عورت کا بننا پڑتا تو مجھے رنج ہوتا۔ اگر وہ وہاں سے کوئی میم لے آتا تو میں کیا کر لیتی۔ مگر وہ میم نہیں لایا۔

یہاں اسکو لوگوں نے بدل دیا تھا دو مہینوں سے میں اُس کی راہوں میں بیٹھی اُسے ملنا چاہتی رہی ہوں مگر وہ مجھ سے نہیں ملا۔

پھر آج وہ کیسے قابو آیا۔

"آج" اسنے ہولے سے کہا۔ "آج اماوس کی رات تھی اور میں نے اسکے ایک پرانے یار کو بھیجا تھا کہ اُسے بلا لائے۔

وہ چپ ہو گئی تو میں نے کہا "کیا اُس آدمی نے اُسے ساتھ لانے میں تمہاری مدد کی تھی" میں نے اپنے اندر کے افسر کو جاگتے ہوئے محسوس کیا۔

وہ ہنس کر بولی "روپ سنگھ جب تک مجھے دیکھ نہیں لیتا تھا اسے چین نہیں آتا تھا اور آج میں نے اُسے کہا تھا کہ تمہیں دیکھے بنا میں نہیں جی سکتی۔"

پھر وہ گوندوال کے راہ پر آگے چلی گئی اور آگے چلی گئی۔

آج اس کی اپیل کا فیصلہ تھا۔ میرے سامنے جگ جیت تھی اور اس کا بابو تھا۔ انصاف تھا اور وہی ترازو تھا جس میں میں نے اس چاندنی رات میں کیسری کے حسن کو تولا تھا اسکے چہرے کی موہنی اور آنکھوں کی اُداسی کو جانچا تھا۔ وہ مجھے دیر کہنی تھی اور مجھ پر وشواس رکھتی تھی۔ اور پھر عدالت میں میری وہ کرسی تھی۔

روپ سنگھ کی بنا کیسری جی نہیں سکتی اور میں اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا ان ہونٹوں کی مٹھاس زہر بن گئی۔ اور اس رات روپ سنگھ کی حیرت سے کھلی آنکھوں کی طرح آج کیسری کی آنکھیں بھی حیرت سے فیصلہ سننے کے بعد کھلی ہوئی میری طرف تکتی رہی تھیں اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا مگر میرے قدم پاتال کی طرف کیوں اٹھ رہے ہیں۔ میں گر کیوں رہا ہوں اور میرے قدموں میں بار بار وہ نگاہیں کیوں آرہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ شاید یہ گرمی کا اثر ہے۔

سالانہ:- ۱۶ روپے

قیمت فی پرچہ:- ۳ روپے

شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی ۵

چندن کی چتا

جمیلہ ہاشمی

پچھلی راتوں کا چاند بادلوں کے جھروکوں سے جھانکتا ہوا بھاگتا جاتا ہے اور ہوا میں پانی کی بوندوں کی جھنکار سی ہے درختوں پر نکلی نئی کونپلوں کی باس پھولوں کی سوگندھ کے ساتھ ملی میرے آس پاس ڈول رہی ہے۔ دور باغ کے کسی کونے میں کوئل رہ رہ کر یوں بولتی ہے جیسے میرے من میں درد کی لہریں ہولے ہولے اٹھتی ہیں۔ نیچی دیوار سے پرلی طرف میرے بھیا کے پوتوں میں سے کوئی جاگ اٹھا ہے اور بنا رُکے چلائے جاتا ہے۔ میں چونک کر اٹھتی ہوں یہ کہیں میری پدمنی تو نہیں مگر پدمنی کہاں۔ جب بھی گھر میں کوئی بچہ روتا ہے رات کو ڈر کر چیختا ہے ماں کو پکارتا ہے۔ مجھے پدمنی یاد آتی ہے۔ پدمنی تو اب یوں لگتا ہے پچھلے جنم کی میری بیٹی تھی۔ اس جنم میں آنکھ کھول کر مجھے وہی یاد آتی ہے اور اسکے ساتھ سارے پرانے دکھ یوں جاگ اٹھتے ہیں جیسے برسات کے جھرنوں سے سوکھی کھیتیاں ہری ہو جاتی ہیں۔ میں کانوں میں انگلیاں دیتی ہوں۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند کو دیکھتی ہوں۔ اندھیرے میں بھگوان کا دھیان کرتی ہوں۔ مگر من بڑا ہٹیلا ہے بالک کی طرح اُسے جیسے جیسے روکو ویسے ویسے مچلتا ہے۔ بھلا اس سے کون پوچھے پرانے دنوں میں کیا رکھا ہے؟

میرے پاس سوئی مالتی نے بھی کروٹ بدلی ہے ابھی وہ کہے گی "ماں جی پوجا کا سمے تو ہو گیا ہے پھر میں یادوں کے بوجھ تلے دبی بھاری قدموں سے اٹھوں گی اور اشنان کروں گی باس سے تھکے پھولوں کو تھال میں سجاؤں گی اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں کو چوموں گی جبکہ میرا من اس ساری پوجا میں نہیں ہوگا۔ میرے بھیگے بالوں سے گرتے قطرے میرے پیچھے دیئے کی روشنی میں ستاروں کی جوت کی طرح لگیں گے اور میں ادم کے اس مندر میں یوں گر جاؤں گی جیسے کوئی مہاتما سمادھی لگائے زمانوں سے بیٹھا ہو۔ مالتی ست رام جپتی ہر ایک کو بتاتی ہے کہ میں پوجا میں رات دن کیسے

مگن رہتی ہوں دل کی باتیں دوسروں کو کہاں معلوم ہو پاتی ہیں۔

میں اوم کے اس مندر میں پھولوں کی سوگندھ سے گھری کھجن گاتی ہر سمے اُن پرانے دنوں میں جا بستی ہوں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے جب بیتا سمے کبھی لوٹ کر نہیں آسکتا تو بھلا من ایسی بیکار کی آشاؤں میں کیوں الجھا رہتا ہے، بھگوان جو شکتی دیتا ہے دکھوں کو سہنے کی طاقت دیتا ہے شانتی کیوں نہیں دے سکتا۔ کبھی کوئی مہاتما ادھر آنکلتے ہیں تو پجاری جی ان سے میرا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ مجھے اشیرباد دیتے آئے ہوئے سادھو مہاتماؤں سے میں آج تک یہ نہیں پوچھ پائی کہ تم لوگ جو مکتی کا پرچار کرتے ہو یہ بیکار کی باتیں رہنے کیوں نہیں دیتے مجھے مکتی کی آشا نہیں ہے۔ گیلی لکڑی کی طرح میں سدا سلگتی رہی ہوں اور انت تک میں یونہی سلگتی رہوں گی۔ میرا من پاتال کی طرح گہرا ہے اس کی اتھاہ نہ مجھے ملی ہے اور نہ تمہیں ملے گی۔ یہ بھلا کسی ترسے بھر سکے گا۔ میں ناستک نہیں ہوں پر تمہارے بول مجھے تسلی نہیں دے سکتے۔ لوگ کہتے ہیں وقت بڑے بڑے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ پر میرے ننگے زخموں پر تو کوئی شے کبھی مرہم نہ بن سکی۔

مالتی جانتی ہے میرے بنا کہے جانتی ہے کہ مجھے مکتی کی آشا نہیں پر زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ کبھی کبھی جب راتوں کو اندھیکار گہرا ہو جاتا ہے اور اسے کبھی نیند نہیں آتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور آپ ہی آپ کہنے لگتی ہے کیوں ماں جی پوجا سے بھگوان نہ ملے پرشانتی تو ملتی ہے "اور میں یہ بات سنکر چُپ رہتی ہوں۔ میں اسے کیا کہوں کہ کچھ بھی نہیں مل پاتا۔ کبھی بھی نہیں مل سکتا۔ آدمی کے حصے میں صرف سلگنا آیا ہے۔

دھرتی کی طرح میں نے پدمنی کو جنم دیا تھا اور بھگوان نے جب مجھ سے اسے بھی لے لیا۔ اسے زندگی ہی میں مجھ سے الگ کر دیا تو میں اور کس شے کی آشا کروں۔ پجاری جی کی باتیں سنکر اوم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

ندی کا دھارا اسی طرح رواں ہے' وہ پتھر بھی اسی طرح ہے صرف میں بدل گئی ہوں چیزوں کے مقابلے میں آدمی کی زندگی کتنی کم ہوتی ہے۔ پیپل کا درخت ویسے ہی ندی پر جھکا ہوا ہے جیسے ان گنت صدیوں پہلے جھکا ہوا تھا۔ بیتا وقت مجھے تو اتنا ہی لمبا لگتا ہے جیسے اس کے اور میرے درمیان صدیاں ہوں زمانے ہوں اور کتنے ہی جنم ہوں۔ یہ جنموں پہلے کی بات لگتی ہے جب شام کے سائے ندی کی لہروں میں رنگ بنکر بہہ رہے تھے میں کھیتوں سے آتے ہوئے راہ میں تھک کر پتھر پر ٹک کر بیٹھ گئی تھی اور تھکن کو

دھونے کے لئے پاؤں پانی میں ڈال لئے تھے۔ ساتھ کی سکھیاں آگے نکل گئیں اور مجھے آوازیں دیتے دیتے سرکنڈوں کے بنے ہوئے راہ سے دوسری طرف چھپ گئیں مجھے ان کی باتوں اور قہقہوں کی گونج دور تک سنائی دیتی رہی بھر بسنتی نے زور سے کہا "ہم جا رہی ہیں تو اکیلی کہیں گم نہ ہو جائیو۔"

بسنتی کو کیا معلوم تھا گم ہونے کے لئے اکیلے ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

پھر پُل کے پار سے شام کے دھندلکے میں ایک سوار آیا اور اسنے مجھ سے پوچھا تھا کیا "شام نگر" کو راستہ یہیں سے مڑتا ہے؟ وہ پیپل کے پتوں کے بھیگے ہوئے گہرے سائے اور ندی کے رنگین پانی کے مقابلے میں مجھ سے بہت اونچا اور دور ایک دیو سا لگ رہا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور اسکی پلکوں پر دھول کی سنہری ذرّی بھلی لگتی تھی وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہا تھا اور اس کی کیسری پگڑی سے اسکے کان ڈھنپے ہوئے تھے اسکے کانوں میں لٹکے بالے بات کرتے میں ہل رہے تھے۔

میں نے کہا تھا پل کے پار والے شام نگر میں جاؤگے یا اِدھر والے "شام نگر" میں اور ہاتھ اٹھاکر دُور اٹھتے نیلے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میرے بھیگے ہاتھ سے بوندیں میری بانہہ پر پھیلتی جا رہی تھیں اور ایک عجیب بے چینی میری جان کے ساتھ لپٹتی جا رہی تھی۔

اسنے سر اٹھاکر پہلے پل کے اس پار والے شام نگر کو دیکھا تھا پھر میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں دوسرے شام نگر کی طرف اس راہ پر جہاں میری سکھیاں ہنستی گاتی چلی گئی تھیں اور جہاں سے اٹھتے نیلے دھوئیں کی دھاریاں ہولے ہولے آکاش سے اترتے اندھیرے کی نیلاہٹ میں گم ہو رہی تھیں اسنے ایک لحہ بھر پور نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اور پھر بنا کچھ کہے اپنا گھوڑا اسی راہ پر ڈال دیا تھا جو میرے گاؤں کو جاتی تھی۔

لوگ چارے کے گٹھے اٹھائے اپنے جانوروں کے ساتھ آ رہے تھے اور شام کے سناٹے میں جو درختوں کھیتوں اور دھرتی کے سینے سے اٹھتا ہے۔ گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ پچھم کی طرف سورج بادلوں کے پیچھے ہاتھ سے پھسلے گولے کی طرح نیچے ہی نیچے ڈھلکتا جاتا تھا اور دوسرے گاؤں کی طرف جاتی" عورتیں تیز تیز قدم اٹھائے اپنے بوجھ سنبھالے بھاگتی جان پڑتی تھیں۔ ان کے پیچھے کھیتوں کی منڈیروں پر گرتے پڑتے بچے روتے جاتے تھے اور

مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اس ایک گھڑی ان سب سے الگ ہوں۔ مجھے کہیں نہیں جانا اور جب شام رات کے گلے ملے گی تو میں بھی اس سرخی کے ساتھ اوپر اٹھ کر گم ہو جاؤں گی۔ پرندوں کی پروں کی تیزی میں سما جاؤں گی۔ میرا خون رگوں میں گرم چلتا ہوا مجھے کسی اور کا بوجھ معلوم پڑتا تھا۔ سکھیاں اور اُن کے پیارے گیت مجھے بہت پرانی کہانی کی طرح لگے جس کا بس ایک آدھ بول ہی بھولا بسرا سا میرے ذہن میں باقی رہا ہو۔ جانے پہچانے راہوں کی دھول مجھے قدموں کے نیچے آج بڑی بیگانی لگ رہی تھی۔ مندر میں شام کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور گاؤں کے دوسرے کنارے میرا گھر مجھے میلوں دُور دکھائی دیتا تھا۔ گائیوں بھینسوں کو ہانکتے ہوئے لڑکے گاتے آتے تھے مجھے وہ آوازیں بھی عجیب لگیں جیسے جاگ کر پہلی بار انہیں سُنا ہو۔ میرے سارے جسم میں ایک کپکپی تھی شاید دیر تک پاؤں ندی میں لٹکائے رہنے کی وجہ سے سردی کی لہریں میری رگوں میں چلنے لگی تھیں۔ شاید میرا من تب پہلی بار جاگا تھا۔ ایسا ہی ہوگا ورنہ جس گاؤں کی دھرتی نے مجھے جنم دیا جو مجھ میں رچی ہوئی تھی وہ بھلا بیگانی کیوں لگتی۔

ماں نے دیکھا تو پھٹکارنے کے لئے کہنے لگی "کیا ابھی تیرے کھیلنے کے دن باقی ہیں جو تو کھیت سے گھر تک آتے آتے جنم لگا دیتی ہے۔ اور گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔"

میں نے ایسی آواز میں جو مجھے کسی اور کی لگی تھی کہا تھا "کیوں ماں آنند پور سے کوئی آیا ہے۔"

ماں نے کہا تھا "یہ سب باتیں پوچھ لینا کام تو پہلے نمٹالے"۔ پھر میرا چھوٹا بھائی رونے لگا اور ماں نے بہت غصے سے میری طرف دیکھ کر کہا "اب کھڑی کھڑی کیا سپنے دیکھ رہی ہے کیا اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ذرا بھیا کو بہلا لے اتنے میں روٹی ڈال لوں۔

بھیا کو اٹھا کر میں باہر جانے کے لئے مڑی ہوں تو ماں نے پھر کہا "اری چمپا کیا تیری مت ماری گئی ہے۔ ایسے سمے بھلا کوئی جوان لڑکی باہر نکلتی ہے جا کوٹھڑی میں جا مر۔ گھر کا کام میں خود دیکھ لوں گی۔

آج جانے کیا بات تھی میں بدل گئی تھی کہ ماں کو غصہ زیادہ تھا۔ بھیا کو لے کر آنگن میں ٹہلتے ہوئے میں نے اپنی رگوں میں آگ سی بہتی پائی جیسے میں راون کا بُت ہوں جسے میلے کے

دن جلایا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی چنگاری نہ تھی۔ یہ آگ کیسی تھی؟

پچھم کی طرف بادلوں میں لگی آگ ہوتے ہوتے ہوا میں گھل گئی اندھیرا آکاش سے نیچے اتر آیا اور کھیلنے والے لڑکوں کی طرح ایک ایک کر کے تارے اپنے گھروں سے نکل کر مانو میدان میں اکٹھے ہونے لگے۔ میرے کندھے سے لگا لگا بھیا جانے کب کا سو چکا تھا۔

ماں کے پکارنے پر میں نے جب اوپر دیکھا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے نیند میں کسی کو دیکھ رہی ہوں۔ بھیا کو لٹا کر میں چورسی بیچ آنگن کے کھڑی ہو گئی۔ آج میرے ہاتھ پاؤں میرے بس میں نہ تھے خیالوں کا دھارا جانے مجھے کہاں بہائے لئے جاتا تھا جیسے میں بھی ایک تنکا ہوں جو ندی کی لہروں میں آگے ہی آگے پانی کے ساتھ چلا جاتا ہے اور پھر پیپل کی چھاؤں اور ندی کے رنگین دھارے کے بیچ کھڑا وہ سوار جانے کیوں گھڑی گھڑی میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ آخر وہ میرا کون تھا؟

پھر شام اور گہری ہو گئی بھیا سو گیا بابا مہمان کے لئے کھانا حویلی ہی میں لے گیا میں اور ماں گلی کی عورتوں کے ساتھ گاؤں کے باہر چلے۔ میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں آج چمپا کے ہاں کون آیا ہے کہ اس کی ماں نے حلوہ پکایا ہے اور دال میں گھی بھی چھوڑا ہے۔

میں نے کہا آنند پور سے کوئی آیا ہوگا۔ ماں سدا اپنے پیاروں اور مائکے والوں کے لئے ہی اچھی اچھی چیزیں پکایا کرتی ہے۔ سب میرے سر ہو گئیں "واہ واہ ہمیں جیسے آنند پور سے آنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اری ہوش سے بول کیا آنند پور سے آنے والے حویلی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور یہ تیرا آج کیا حال ہے کہ ایک پاؤں یہاں پڑتا ہے اور دوسرا وہاں کیا تو نے نشہ پی رکھا ہے تجھے معلوم نہیں آج تیرے گھر کیا پکا تھا۔ تیری ماں نے نیا بچھونا نکال کر دیا ہے۔ اب بتا بھلا وہ کون ہو سکتا ہے پھر وہ سب ناچتی ہوئی میرے گرد گھومتی رہیں اور مجھے مانو پاگل بنا دیا۔

گاؤں میں اور لڑکیوں کی طرح مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ نئے گہنے ملیں گے آنکھوں

میں کاجل کی گہری لکیریں ہوں گی اور میرے لہنگے کی گوٹ بھی ریشم کی ہوگی۔ میرے سپنے اس سے آگے کبھی نہیں گئے۔ نیم تلے جب عورتیں مل کر سوت کاتتیں اور لڑکیاں مل کر گیت گاتیں تو میرا انگ انگ ایک عجیب خوشی سے جھوم اٹھتا۔ ان دنوں میری سہیلیاں کہتیں۔

"اری چمپا تجھے کیا ہو گیا ہے تیری آنکھوں میں جوت سی کیا جلنے لگی ہے جیسے ان میں تارے بھرے ہوں اور یہ اتنی پھیل کیوں گئی ہیں۔ جیسے سارے جہان کو ڈھانپ لیں گی" ماں بھی مجھ سے بہت پیار سے بولتی کبھی غصہ نہ ہوتی بڑی بوڑھیاں مل کر بیٹھتیں تو کہتیں چڑیوں کی طرح بیٹیوں کے دن بھی بابل کے آنگن میں کم ہوتے ہیں اور بیت جاتے ہیں اور پھر اپنے بیاہ کے اور مائکے کے قصے لے بیٹھتیں سالوں پیچھے پرانے دنوں میں پلٹ جاتیں اور یوں ہنستے ہنستے میرے وداع کے دن آ گئے۔

۲

برات آئی ہے تو دھوم مچ گئی اونٹوں کی قطاریں نہر کے پل سے لے کر ہماری حویلی تک تھیں۔ باجوں کے شور اور آدمیوں کی بھیڑ میں لگتا تھا یہ گاؤں اوپر اٹھتا جاتا ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں ہمارے آنگن میں جمع تھیں اور ڈھولک کی دھپ دھپ راگوں کی ندی پر بہتی تھی۔ گھنگرو باندھے ناچنے والیوں کے پاؤں میں بجلیاں تھیں سنگار کرواتے ہوئے نائن مجھ سے کہتی جاتی تھی " بیٹیا تیرے دھن بھاگ ہیں جو تو ایسے بڑے گھر میں جا رہی ہے ایسا گھر جہاں دودھ دہی کی نہریں بہتی ہیں۔ جہاں کی لونڈیاں باندیاں بھی ریشم پہنتی ہیں۔ ارے تیرے جیسے بھاگ تو گاؤں میں کسی کے بھی نہیں ہیں تو ایسی بھگ دتی ہے وہاں جا کر ہمیں نہ بھول جانا۔ اور جانے کیا کچھ کہتی نائن میرے بالوں میں موتی پرو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشم کے ڈھیروں میں میں دب کر کھو جاؤں گی میرا سانس گھٹ جائے گا دودھ دہی کی نہروں میں یوں بہہ جاؤں گی کہ مجھے کنارہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ اور پھر ساری رونق اور شور کے اوپر مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جنہوں نے مجھے یوں دیکھا تھا کہ میرا دل ڈول گیا تھا اور میرے گیلے ہاتھ سے جو شام نگر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اٹھا تھا پانی کی بوندیں میری بانہہ پر ایسے بہہ رہی تھیں کہ میری جان

کو ایک عجیب بے چینی سی لپٹتی جارہی تھی۔ نائن کا کرایا ہوا سنگار چھین بن رہا تھا اور کاجل میری آنکھوں میں ریت کے ذروں کی طرح لگتا تھا۔ میرا من جانے کیوں اس ساری خوشی سے الگ اکیلا تھا اور بہت اُداس تھا۔ میں بے حد گم سم بیٹھی تھی اور میری سکھیاں مجھے چھیڑ رہی تھیں۔ جانے کیوں ایسے ہی بیکار کی ایک آشا کی طرح میرا جی چاہ رہا تھا کوئی مجھ سے اس سجیلے کا ذکر کرے اور کہے کہ تیرا دولھا ایسا ہے۔

ماں کو میں نے دو ایک بار اپنے پاس سے گذر کر اندر کوٹھڑی میں جاتے دیکھا تھا میلے کپڑوں میں بھی اس کا چہرہ جگ جگ کر رہا تھا اور جب کسی سے بات کرتی تو لگتا تھا ابھی اس کے گلے لگ کر مارے خوشی کے ناچنے لگے گی۔ اندر باہر عورتیں اور آنند پور سے آئی ہوئی برادری کی لڑکیاں پاؤں میں جھانجھنیں چھنکاتی یوں ہی بھاگ دوڑ رہی تھیں جیسے سب سے زیادہ کام تو بس انہیں کے ذمہ ہو۔ بھیگی ہوئی سہانی رُت تھی اور سردی میرے جسم پر یوں لگتی تھی جیسے کوئی انجانا ہاتھ مجھے تسلی دے رہا ہو اور ہوا جب کھلے دروازے سے آتی تو جان پڑتا جیسے گھبراہٹ میں مجھے تسلی دے رہی ہو۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور عجیب سپنا میرے سامنے تصویروں کی طرح گھوم رہا تھا۔ جس میں میری سہیلیوں کی جھانجھنوں کی جھنکار بھی تھی۔ ڈھولک کے ساتھ گائے ہوئے گیت بھی تھے۔ برات کے ساتھ آئے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن بھی تھی۔ جیسے راس لیلا رچانے والوں کی ٹولی میں گوپیاں کنھیا ہوں۔ اور میں رادھا تھی اور یہ سارے شور کا دھارا میرے سامنے بہہ رہا تھا اور میں اس سے الگ تھی۔ ہم دونوں تھے میں بھی اور کوئی دوسرا تھا مجھ سے اونچا میری پہنچ سے دُور مگر میرے بالکل قریب جیسے میری جان کا ایک حصہ ہو۔ جیسے میرے انگوں کی ساری دُکھن نکل کر اسکے قدموں میں لوٹ رہی ہو میری جان اسکے پاؤں میں ہو۔ میں ایک ریشم کا کپڑا ہوں جس پر اگر وہ چاہے تو اپنا پاؤں دھر دے۔ میں ایک کنول کا سفید پھول ہوں اگر چاہے تو اپنے سانس سے اس میں خوشبو بھر دے۔ میرے قریب کھڑے ہوئے اسنے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا ہے تو سَن سَن کر کے میری جان یوں نکل گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ میں نہ رادھا ہوں۔ اور نہ کوئی اور دھرتی کا ایک ذرہ ہوں جو اگر اسکے پاؤں تلے آجائے تو اس کی مان اور شان بڑھ جائے آنگن

میں جانے کیسا شور ہو تے لگا تھا یا میرا سپنا ہی ایسا تھا کہ مجھے لگا کسی نے میرے پاس کھڑے ہوئے جوان کے سر پر زور سے کوئی شے ماری ہے۔ جھٹک سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں چیخ مار کر گر پڑی۔

میری سہیلیاں میرے گرد اکٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں "چمپا اری چمپا ہوش میں آ پھیرے ہونے والے ہیں۔ اور تو یوں چیخ رہی ہے یہ کیا بد شگونی ہے۔ اگر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے تو دو گھڑی کو کمر سیدھی کرلے۔"

میری آنکھوں سے آنسو ساون کی جل دھارا کی طرح بہہ رہے تھے اور میرے پرانوں میں جان نہیں تھی۔ سارا کیا ہوا سنگار خراب ہو گیا۔ اور نائن ہاتھ ملتی ہوئی پھر سے پٹاری کھول کر بیٹھی۔ مگر میرا اپنا آپ میرے بس میں نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ سنبھل کر بیٹھوں پر سنبھل نہ پائی تھی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھرے ماں آئی اور کہنے لگی "چمپا تجھے کیا ہے بیٹی کیا تجھے بیاہ کی خوشی نہیں ہے میں تو بہت خوش ہوں کہ تیرے بھاگ پر ماتما نے اچھے بنائے ہیں اور تو ہے کہ روئے جاتی ہے۔ لڑکیاں تو اس دن کے انتظار میں رہتی ہیں اور اب جب کہ میرے دوار پر یہ دن کھڑا ہے تو گھبرا رہی ہے۔ اری پگلی تو سدا کے لئے تھوڑا جا رہی ہے بس دو چار دن میں لوٹ آئے گی اور پھر تیرے جیسا دولہا تو بھگوان ہر کسی کو دے۔ نراش کیوں ہوتی ہے دیکھ تو سبھی سارے گاؤں سے اچھا تو تیرا گھر ہو گا۔"

باہر سے کسی نے پکارا ہے تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنے میں شور ہوا کہ سسرال والے آگئے ہیں۔ لڑکی باہر آئے تو پھیرے ہوں۔ میرے ننھیال کی عورتیں اور برادری کی لڑکیاں مجھے پکڑ کر باہر لائیں۔ میں کانپ رہی تھی۔ جیسے سردی بہت زیادہ ہو۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ مندر میں سویرے کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور رات کی جاگی ہوئی عورتیں ڈھولک بہت تیزی سے بجا رہی تھیں۔

سرکنڈوں سے بنے چھپر میں رنگین تاگوں سے بنے لٹو چاروں طرف سے میرے سر پہ سایہ کئے تھے۔ اور گھی کے دیوں کی روشنی میں ہون کنڈ کی آگ بڑی پوتر لگ رہی تھی۔ لپکتی ہوئی جیسے باقی ہر شے کو اپنے میں کھینچ لے گی۔ پھولوں کے سہروں میں سے جھانک کر میں نے دیکھا تھا ماں کا

چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ آنسو رو کے جانے کیسے بیٹھی تھی بھیا اس کی گود میں لدا بیٹھا تھا اور لوگوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میلے میں آئے ہوؤں کو دیکھ رہا ہو اس کی رہ رہ کر تھکی ہوئی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں پھر وہ انہیں کھولے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دُور پرے میرے آنند پور والے ماما اور اور دتی دیس سے آئے ہوئے چاچا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پھر پھولوں کی لڑیاں کسی عورت نے برابر کر دیں تو سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

پھیرے کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا جانے یہ کون ہے جو مجھے کسی دوسرے گاؤں سے وداع کرانے آیا ہے میرے دل میں کھلبلی سی مچی تھی اور میں چاہتی تھی کم از کم گھونگھٹ اور پھولوں کا یہ بوجھ ہٹا کر ایک بار اس چہرے کو تو دیکھ لوں۔ اور آج مجھے معلوم ہے چہروں میں تو کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ کتنے بھولے دکھائی دیتے ہیں ؟

پنڈت جی اشلوک پڑھ کر آگ پر جانے کیا کچھ ڈال رہے تھے کہ باس سے میں بے سدھ ہوئی جاتی تھی۔ آج کتنے زمانوں کے بعد بھی وہ باس مجھے انوکھی اور الگ سی میرے ذہن کے ایک کونے سے جہاں بھولی بسری یادوں کے ساتھ پڑی ہے آیا کرتی ہے۔ سامگری کی سوگندھ۔ چلتے میں میرے لہنگے کی گوٹ میرے آگے آگے بجلی کی طرح کوند رہی تھی اور پیچھے سے کھلی چولی میں اتنے کپڑوں میں لپٹی ہونے کے باوجود مجھے لگتا تھا میں ننگی ہو جاؤں گی۔

بیٹھی ہوں تو یوں تھکی ہوئی تھی جیسے جنموں کا سفر کر کے آئی ہوں اور لگتا تھا گر جاؤں گی یہ سارے لوگ۔ جو میرے آس پاس بیٹھے تھے جانے کون تھے اور وہ جو میرے قریب بیٹھا تھا وہ جانے کون تھا۔ میرے ساتھ کیا بیتنے والا تھا۔ پھر ہون کنڈ کو ہٹا کر مجھے اور اسے جواب میرا بھگوان تھا آمنے سامنے بٹھا دیا گیا۔ لوگ ہنس رہے تھے میرا ہاتھ کبھی اٹھایا جاتا تھا اور کبھی رکھ دیا جاتا۔ میری آنکھیں تھکن کے مارے بند ہوئی جاتی تھیں جب نائن نے کہا تھا کہ بی بی آنکھیں کھول کر اپنے دولہا کو تو دیکھ۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کو دیکھنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں کھل نہ سکیں۔ ساری رسمیں ہو چکی تھیں۔ سورج نکلنے والا تھا۔ جب سر کنڈوں کی اس کوٹھری میں سے سب کو نکال کر میری سکھیوں نے مجھے اسکے ساتھ بند کر دیا تھا جو میرا پتی تھا۔

گھی کے دیئے کی لَو مجھے بجھتی ہوئی لگی اور پھولوں کی باس تھکن سے بیہوش ہوتی جان پڑی۔ جب کسی نے میرا گھونگھٹ الٹ دیا ہے۔ بھگوان جانتا تھا میں کچھ دیکھنا نہ چاہتی تھی مجھے صرف سننے کا انتظار تھا۔ بیگانے ہاتھوں کا جو میری طرف بڑھیں گے اور لاج کے مارے میں دوسری ہو جاؤں گی۔ اور اس انتظار میں جیسے زمانے بیت گئے۔ دیئے کی لَو بھڑکی اور بجھ گئی اور اندھیرے میں پلنگ کی دوسری طرف بیٹھنے کی آواز آئی۔ ہولے ہولے میرے انگ ڈھیلے پڑ گئے شاید میں انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔

آج تک یہی انتظار ہے جو میرے گرد باقی ہے۔ اور جو کچھ باقی دنوں میری زندگی میں ہوا ہے اسنے بھی اس انتظار کرنے کے جادو کو نہیں توڑا۔ میں نے دوار دوار بھیک مانگی ہے۔ پر بھکشا کے ناتے بھی کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ جانے کتنی آنکھوں میں میں نے جھانکا ہے۔ جانے کتنے ہاتھوں کو میں نے چھوا ہے۔ پر میرے شریر میں وہ اینٹھن ویسی ہی ہے۔ وہ تناؤ جو اس صبح کو دیئے کے بجھنے کے بعد سے اب تک میری رگوں میں خون کے ساتھ موجود ہے بھگوان کیا یہی بیاہ تھا؟

ڈولی اٹھی ہے تو میں ڈھنگ سے بیٹھ نہ سکتی تھی۔ نہر کے پل سے لے کر دریا کے گھاٹ تک اونٹوں کی قطاریں تھیں جن کی گھنٹیوں سے لگتا تھا سارا جہان مجھے وداع کرانے آیا ہے۔ ماں کے رونے کی آواز سب سے الگ اونچی تھی۔ نائن میرے کپڑوں کو ٹھیک کرتی ڈولی میں بیٹھی ہچکولے کھاتی میرے ساتھ آن لگی تھی۔ بابا اور بھیا اور وہ سارے جن کے درمیان میں نے آج تک کا وقت گزارا تھا کہاں تھے۔ وہ بیگانہ آدمی جو آج صبح میرے رنگین پلنگ کی پائنتی بیٹھا رہا تھا کیسا ہو گا۔ دریا کے گھاٹ تک گاؤں کی عورتیں جو گیت گاتی آئیں تھیں وہ میری سمجھ میں نہیں آپاتے تھے جیسے کسی اور ہی بولی میں ہوں۔ مجھے لگتا تھا میری ارتھی اٹھ رہی ہے۔ میں نے برے خیالوں کو سر جھٹک کر دور کرنا چاہا۔ اور نائن سے کہا کہ میرا دم گھٹتا ہے ذرا سا پردہ تو سرکا دے۔

دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا کشتی کو رنگوں تاگوں اور ریشمی پھندنوں سے سجایا گیا تھا جب چپو چلتے تو گھنگروں کی جھنکار بڑی مدھر لگتی۔ مجھے پھر لگا میں رادھا ہوں جو پرائے دلیس میں اپنے

کرشن کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں پر یہ جو میرے پاس بیٹھا تھا کون تھا۔ گم سم اور خاموش جیسے اس پر کوئی جادو کر دیا گیا ہو۔ دریا پر کی ٹھنڈی ہوا آ آ کر میرے چہرے پر لٹکے سہرے کو ہلاتی تھی اور میٹھی پھوار کی طرح میرے جسم پر پھیلتی تھی پر میری رگیں جیسے سخت پڑ گئی ہوں پتھر کی طرح اس ٹھنڈک کو قبول کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ جیسے میں مورتی بن گئی ہوں جس پر پانی کی پھوار صرف اوپر کی سطح کو ہی بھگو سکتی ہے۔ آج تک کسی ٹھنڈک نے میرے انتر کو ٹھنڈا نہیں کیا۔ میں تو اپنا نرک اپنے ساتھ لئے پھرتی ہوں میرا نرک جس میں ہر کام کا آخر تھکن اور اینٹھن ہوا ہے۔ مجھے آج تک کسی نے سکون کی اس میٹھی نیند نہیں سلایا جو اس سرکنڈوں کی کوٹھری میں رنگین پایوں والے پلنگ پر سونے سے پہلے میری تھی۔

پھر میرا گاؤں پیچھے چھوٹ گیا اور ناؤ آگے بڑھ آئی۔ دریا کا دھارا وقت کی طرح جہاں جی چاہے بہا کرلے جاتا ہے ملاح زور لگا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں پانی تھا اور دل چاہتا تھا یہ لہریں مجھے اپنے میں چھپا لیں دوسرے کنارے پر آموں کے بور کی خوشبو نے میرا سواگت کیا اور سایوں والے ٹھنڈے راہ پر میں اس گاؤں کی طرف چلی جو اب میرا دیس بننے والا تھا جس کی مٹی میں میرے جسم کو ملنا تھا جو پرماتما نے میرے لئے بنائی تھی۔

ڈولی کے آگے آگے چلنے والا سوار بانکا چھبیلا تھا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر بیٹھا ہوا۔ لوگوں سے ہنس ہنس کر بولتا جاتا تھا۔ نائن نے پردہ سرکا کر کہا بی بی باہر تو جھانک دیکھ تو سہی کتنا سندر نگر ہے۔ درختوں کی اوٹ سے پرے کھیتوں پر سے ہوا اناج کی خوشبو لا رہی تھی۔ پر نتھ بار بار میرے ہونٹوں پر آ کر لگتی تھی۔ اور سانس لینے میں ناک دکھ رہی تھی اس لئے میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں تو آپ مہکار بنی ہوئی تھی۔

۳

میں نے جب آئینے میں جھانکا ہے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تو یہ میں تھی میں جو چپ تھی اور جو پرسوں تک کھیتوں میں گھومتی ندی میں تیرتی اور آنگن میں اتنے اونچے پینگ چڑھاتی تھی کہ میری سکھیاں بس بس کہنے لگتیں۔ یہ میں تھی چمپا جس کو ماں نے کبھی اچھا کپڑا

پہننے کو نہیں دیا۔ تہوار کو بھی جسے کبھی ریشم دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ شام نگر کی وہ لڑکی اب گزدں ریشم میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی اور بالوں میں پروئے موتی چھپ کر کے مقابلے میں ماند تھے آنکھوں میں آکاش کے سارے ستاروں کی جوت تھی اور کاجل کی لکیریں دھڑکتی ہوئی رگوں کی طرح آنکھوں میں پکڑ دھکڑ کر رہی تھیں۔ پاؤں ہلاتی تو بچھوے بج اٹھتے اور اٹھاتے تو گھنگروؤں والے کنگن ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ ماتھے پر لٹکے ٹیکے میں جڑے ہیروں سے روشنی نکلتی تھی اور جو عورت گھونگھٹ الٹ کر دیکھتی حیران ہو کر پیچھے ہٹ جاتی۔ ہولے ہولے دن کھسکتا رہا اور شام کی طرف جاتا رہا۔ اور پھر نرم سی ہوا چلنے لگی۔

اس رات جانے کتنے پرانے اور پہلے خواب میرے من کی دیواروں سے آ آ کر ٹکرائے ہیں اور میں نے کیا کیا سوچا۔ پھر تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا چاند نکلا۔ رنگین پایوں والے پلنگ کے چاروں طرف پھولوں کی چادروں کی مہکار تھی اور گھی کے دیئے جل رہے تھے باریک بادلے کے دوپٹے میں سے میرا سنگار جانے کیسا الگ رہا ہوگا۔ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی تھی اپنے پاؤں کو دیکھتی تھی کیا یہ میں ہی تھی کہ گھاٹ سے یہاں تک آنے میں کتنے ہی جنم پار کر گئی تھی۔ یہ جادو کا کیسا دیس تھا۔ اپنے جسم کی پاگل کرنے والے باس سے میں آپ ہی بیہوش ہوئی جاتی تھی۔ بھگوان۔

پھر اس آنگن کی طرف آنے والے راہ پر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میری رگیں اسی طرح پتھر ہو گئیں۔

۴

میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ جس کو مجھے بھگوان بنا کر پوجنا تھا اسنے مجھے دیوی سمجھ کر پوجا۔ میں چاہتی تھی بچپن سے سوچتی آئی تھی جانے کون میرا دولہا ہوگا۔ میں کیسے کیسے اس کی سیوا کروں گی۔ پر میرے من کی پوجا میرے من میں رہی۔ میرے دل کے بند کبھی کھل نہ سکے۔ میں اس بیدی سے نیچے اتر نہ سکی جس پر میرے اپنے بھگوان نے مجھے بٹھا دیا تھا۔ اس رات بھی میرا گھونگھٹ اٹھا ہے تو میں منتظر رہی ہوں مگر اسنے کہا "چمپا تم تو دیوی ہو دیوی

سے بھی زیادہ سندر اور سندرتا میں شکتی ہے پھر اس نے جھک کر میرے پاؤں چھو لئے اور انہیں اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اس کی اس بھول نے میری ساری زندگی کو برباد کر دیا ہے بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے میں نے اس آسن سے اترنے کے لئے جو جتن کئے ہیں سب بیکار گئے ہیں صرف اس ایک لمحے کی غلطی نے میرے سر کو گناہوں سے جھکا دیا ہے۔ پر پھر بھی مجھے جو چاہئے تھا وہ میں نہ پا سکی۔ تم مندر میں جاؤ اور تم دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکو اور تم یہ دیکھو کہ تم آپ مورتی ہو اور آپ ہی دیوتا تو تمہارا من کیا کہے گا۔ میں نے اپنا کیسا کیسا سر مارا۔ ہر کہ اور کسی کو نہیں تو کم از کم مالتی کو ہی سمجھا سکوں کہ قصور میرا نہیں ہے پر مالتی ماننے تو؟

میں نے کتنی بار کہا ہے مالتی میں تو بچارن تھی۔

اور مالتی کہتی ہے ماں جی تم سے بڑھ کر بھاگوان کون ہوگا جسے ایسا پتی ملا ہے جو پوجتا ہو جو دیوی سمجھتا ہو۔ ارے ماں جی ہر کسی کے ایسے بھاگ کہاں؟

میں مالتی کو کیسے بتاؤں کہ میں نے کیا چاہا تھا۔ اور مجھے کیا ملا۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی غصہ ور ہو کہ میں اسکے خوف سے کانپتی پھروں۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی مجھے عورت سمجھے اور عورت کی کمزوریاں تو بہت ہوتی ہیں۔ جنہیں پجاری معاف نہیں کرتا پر پتی بھول سکتا ہے۔ ہمارا گھر سورگ نہ بن سکا۔ وہ مندر کا بڑا پجاری تھا اور اس نے آپ دیوی بنا کر میری پوجا شروع کر دی۔ اسکی عاجزی دیکھ کر میرا جی چاہتا اسکے سر پہ زور سے ٹھوکر ماروں۔ جب وہ میرے پاؤں اپنی آنکھوں سے ملتا تو میں یوں پتھر کی طرح پڑی رہتی جیسے سچ مچ میں دیوی ہوں۔ اوہ بھگوان کیسی کیسی یادیں آج پرے باندھے چلی آتی ہیں۔

جب میں اسکے لئے آپ کھانا بناتی تو وہ کہتا چھپا نہیں یہ تمہارا کام نہیں ہے تم میری دیوی ہو کر یہ سب کچھ کر کے مجھے اپرادھی بنا رہی ہو۔ تم تو صرف اس لئے بنائی گئی ہو کہ تمہاری پوجا کی جائے۔ میرے چاروں طرف ریشم کے ڈھیر ہوتے۔ سونے اور موتیوں کے گہنوں سے میرے صندوق بھرے رہتے باندیوں کی کمی نہ تھی۔ پر ہر رات سپنے میں میں اپنے مائکے گھر جاتی جہاں کی راہوں کی دھول بھی اب مجھ تک نہ پہنچ سکتی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح ندی کنارے پیپل کے سائے میں دھڑکتے دل کے ساتھ میں اس سوار کا انتظار کرتی۔ کیا وہ کھو جتا کھو جتا

مجھ تک آ نکلے گا۔

میری آنکھوں میں جلی جوت ماند پڑگئی۔ اور روکھے پھیکے دن ایک کے بعد ایک یوں گزرنے لگے جیسے گھسٹ رہے ہوں۔ میرے گالوں کی لالی اور میرے ہاتھوں کا لوچ جیسے گذرے دنوں کی بات ہو۔ میں سنگھار کرتی تو بھی نہ کروں تو بھی اسنے مجھے جس آسن پر بٹھایا تھا اس سے اتارنا اسکے بس کی بات نہ تھی۔ میری رگیں جسم میں یوں جمنے لگیں جیسے میں برف کے پہاڑوں میں دب گئی ہوں۔ جب پدمنی پیدا ہوئی ہے تو چند دنوں میرا دل اس سے بہل گیا ہے پر پھر وہی سستی اور وہی بیزاری میرے گرد آگئی اور پدمنی بھی اس ٹھنڈ کو جو میری رگوں میں تھی گرم نہ کرسکی۔

جب پدمنی نے پاؤں چلنا شروع کیا ہے اور توتلی باتیں بھی کرنے لگی ہے تو ایک نئی سوچ نے میرے من کو گھیرا۔ کہیں اسے بھی ایسا دیوتا نہ مل جائے جو اس کی پوجا کرے۔ اس کا باپ اُسے پدماوتی کہتا تھا اور جب جھک کر اسے پیار کرتا تو اس کی آنکھیں غرور سے جھک جاتیں۔ پدمنی آنگن میں ایک رنگین چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی اور اسکے پیچھے باندیوں کی قطار ہوتی۔ میں بڑے پلنگ پر جو دالان میں پڑا رہتا لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر دیکھتی مگر میرا دل بجھا سا رہتا گرمیوں کی دوپہروں کو جب پدمنی اپنے بابا کے ساتھ سوئی ہوتی اور رنگین پنکھے ریشمی ڈوریوں کے ساتھ بندھے بے آواز ہمارے سروں پر ہلائے جاتے تو میں دالان سے باہر درختوں کو دیکھتی جن پر نئے پتے چمکتے ہوتے اور نئی کونپلیں پھوٹی پڑتیں۔ ہر شے پر بہار آتی ہے مجھ پر جانے کب بہار آئے گی پر مجھے خود معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ میں کس شے کے انتظار میں ہوں۔ کون آس ہر آہٹ پر مجھے چونکا دیتی ہے۔ اس بیکاری سے اُکتا کر میں نے زور شور سے گھر کو سنوارنا اور ہر کام میں حصہ لینا شروع کیا۔ رسوئی سے لیکر باہر تک سب لوگ چونک اٹھے۔ پدما کے بابا نے مجھے کہا بھی "بھلا تمہیں یہ سب کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے کام تو ہوتے رہتے ہیں تم اپنے آپ کو کیوں ہلکان کررہی ہو۔"

اُنہی دنوں دریا کے پاس گھاٹ سے ذرا ہٹ کر ایک جوگی نے اپنا ڈیرہ لگایا۔ اور لوگ مندر کو چھوڑ کر ان کے درشنوں کے لئے الٹے پڑتے تھے۔ ایک میلا سا رات دن گھاٹ

پر لگا رہتا۔ روز باندیاں آتیں اور کہتیں ماں جی سادھو مہاتما تو جس کی طرف نظر بھر کے دیکھتے ہیں اسی کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ مہاتما نے آج یوں کر دیا آج ایسا کر دیا۔ نت نئے قصے سنتے سنتے میرے جی میں بھی ترنگ اٹھی اور میں نے اپنی نند کو جو ابھی کنواری تھی اور مجھ سے بہت چھوٹی تھی ساتھ لے کر مہاتما کے درشنوں کو جانے کا ارادہ کیا۔ جاتے جاتے چوکھٹ کے اندر ایک دم رُک کر میں نے سوچا بھگوان نے مجھے سب کچھ دیا ہے دولت ہے چاہنے والا پتی ہے رونق کے لئے بچے ہیں خدمت کے لئے باندیاں ہیں۔ میری تو کوئی ایسی آس نہیں جو مجھے پریشان کرے گی۔ بھلا میں کیا لینے مہاتما کے پاس جا رہی ہوں۔ پر پیچھے سے آتی موئی دستنی نے کہا۔ "بھابی جلد چلو دیر ہو گئی ہے لوٹ کر بھی تو آنا ہے۔ بھیا کو پتہ چل گیا تو ناراض ہوں گے۔" اور میں بنا یہ سوچے کہ مجھے کسی شے کی آشا نہیں کوئی شے لینی نہیں چل پڑی۔

لوگ گھاٹ پر کشتیوں کے پاس اور گھاس والی زمین پر بیٹھے تھے جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور میلے کا سا سماں تھا۔ عورتیں اور بچے جوان اور بوڑھے سبھی تھے دل میں آشائیں لے پرارتھنا کرتے آنکھیں بند کئے پربھو سے لو لگائے بھگت مانگنے والے۔ مجھے ان سب کو دیکھ کر ہنسی بھی آئی کیا مہاتما ان سب کے دلوں کا حال جانتے ہیں کیا ان سب کو وہ دے سکیں گے جو انہیں چاہئے ہو گا۔ بھگوان تو ہر کسی کو وہ دے نہیں پاتا جو انہیں چاہئے یہ مہاتما اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی آس پہنچائیں گے۔" مجھے یونہی ہنسی آ گئی۔ جوگی مہاراج کے آسن کے آس پاس لوگ رام نام مالا جپ رہے تھے اور ہولے ہولے بولتے تھے۔ آدمی سر جھکائے بیٹھے تھے ایک دنیا تھی بھیڑ تھی جیسے لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

عورتوں اور باندیوں کے ایک جھگھٹے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہوں نے آدمیوں کو پرے ہٹا دیا۔ ہم نے چادریں اپنے ماتھے تک نیچی کر رکھی تھیں اور باندیوں نے بھی منہ چھپائے ہوئے تھے۔

مہاتما نے میری طرف دیکھا تو کہا دیوی تم میرے اور پاس آ جاؤ تو میں تم سے بات کروں۔ میرا دل یونہی دھک دھک کر رہا تھا اور مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ

گئی تھی۔ جب گھونگھٹ ہٹا کر نیچی نظریں کئے میں مہاتما کے سامنے بیٹھی ہوں تو انہوں نے کہا "آنکھیں اوپر اٹھاؤ۔"

میری نگاہیں جانے کیوں جھکی جاتی تھیں اور آنکھیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ لگتا تھا صدیاں بیت گئی ہیں اور ان نظروں کے سامنے میں بھسم ہو جاؤں گی پھر آپ ہی آپ میرا ڈر دور ہو گیا اور میں نے اوپر دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میرے اندر میں ٹٹول رہے ہوں۔

پھر بہت آہستہ کہنے لگے تمہاری آنکھوں میں اتنی تنہائی ہے اور زمانوں کا دکھ ہے۔ پر تم دکھی نہیں ہو دیوی تم صرف زندگی سے ناراض ہو۔ تم نے دریا دیکھا ہے پر تباہ کرنے والے دیوتا کا چہرہ نہیں دیکھا۔ تم نے بہت آرام کر لیا ہے۔ تمہارے من میں جوت جلے گی اور ضرور جلے گی۔ پر یہ تمہیں اور تمہارے پتی کو تمہاری بیٹی کو تم سے جدا کر دے گی۔ یہ روشنی تم سے بہت کچھ چھڑا دے گی۔ تم نے آرام کے بہت دن گذار لئے ہیں اب تمہارے لئے جلنے کے دن آئے ہیں۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ آنے والی گھڑی ٹل جائے مگر ہونے والی باتیں ہو کر رہتی ہیں۔ جو نصیب میں بدا ہو وہ ضرور ہوتا ہے ڈرنا بیکار ہے تم نے اب تک سکھ بھوگ لئے ہیں اب تم کشٹ اٹھاؤ گی۔ ہر آدمی جو پیدا ہوتا ہے اسکے ماتھے کا لکھا اس دنیا میں پورا ہوتا ہے جاؤ میں تمہیں اشیرباد دیتا ہوں کہ طوفان تمہارے سر پر سے جلد گذر جائے۔" پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

دستی کو دیکھا تو کہنے لگے "تم کنیا ہو میں تمہیں کیا کہوں اگر سال سے پہلے تمہارے ہاتھ پیلے ہو گئے تو تم سکھ شانتی سے رہو گی نہیں تو ایک روگ اپنی جان کے ساتھ لے جاؤ گی۔ تم جو چاہو گی تمہیں وہ کبھی نہ مل سکے گا۔ آدمی ایسی دھرتی سے بنا ہے کہ وہ ان ساری چیزوں پر جو اسے مل جاتی ہیں کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کرتا وہ کئی بیگانی چیزوں سے ٹکرا جاتا ہے جب تک ٹھوکر نہ کھائے وہ سنبھل نہیں سکتا۔" اسنے سر جھکایا تو انہوں نے اسے اشیرباد دی اور دیر تک اس کے سر پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے رہے۔

راہ میں وسنتی گھڑی گھڑی میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھی "بھابی ہم بیکار میں آئے اب یہ وہم میرے جی میں جڑ پکڑ لیں گے۔ نصیب کی باتیں پوچھنا بیکار ہوتا ہے۔ بھگوان نہ کرے مجھے کوئی روگ لگے۔" وہ چپ ہو گئی تو باندیاں کہنے لگیں "دیکھو تو سہی اوپر سے مہاتما ہنستا ہے اور دل میں کتنا کرودھ بھرا ہے۔ اچھا ہوا ہم نے کچھ نہ پوچھا ورنہ جانے کیا کیا بتاتا۔"

میں نے کہا وسنتی مہاتما نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس کا برا مانا جائے۔ یہ اُن کا کہا تو نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو انہیں کیسے پتہ چلتا کہ تم کنواری ہو۔ اور پھر ہم تو اندھیرے میں تھے۔

پھر ہم سرکنڈوں کی راہ سے جو گاؤں کے باہر سے ہمارے گھر تک جاتا تھا تیز چلنے لگے۔ سرکنڈوں کے ریشمی بور ہمارے سروں پر لگتے تھے اور سر سر کرتی ہوا اکیلی اکیلی بین کرتی ہوئی بھاگی جاتی تھی۔ گاؤں کے باہر جھونپڑیوں میں دیئے ٹمٹما رہے تھے اور جب ہم شمشان کے پاس سے گزرے ہیں تو بڑے بڑے پر پھیلا کر چمگادڑیں تیز تیز ہمارے آگے پیچھے اڑنے لگیں۔ اور ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی زور زور سے ہنس رہا ہو اور کٹورہ بجا کر گھنگرو پہنے ناچ رہا ہو۔ میں خاموش تھی اور سب سے آگے تھی پر وسنتی سہم سہم کر میرے کندھے سے لگتی تھی اور کہتی تھی "بھابی ہم اس راہ سے کیوں آئیں بھلا شام کے وقت بھی کوئی اس طرف سے نکلتا ہے۔ بوڑھی باندی جو سب سے پیچھے آتی ہوئی ہانپ رہی تھی اس کی بات سنکر کہنے لگی "بی بی جو نصیب میں بدا ہے ہوتا وہی ہے وہم کرنا اور ڈرنا بیکار ہے بالکل بیکار۔

پھاگن ختم ہو رہا تھا جب ہمارے گاؤں میں اشنان کا میلا لگتا ہے۔ دھرتی جیسے نیا روپ دھار کر روشنی سے نہا کر نکلی تھی۔ نرم ہوا چلتی اور نیلے آسمان پر آکاش پر چاند تاروں کے جھرمٹ میں بہت بھلا لگتا پرندوں کے پروں میں نیا رنگ تھا اور ان کی آوازیں یوں تازہ تھیں جیسے پہلی بار انہوں نے بولنا سیکھا ہو۔ کھیت دُور دُور تک ہریالی سے لہلہاتے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیں دوہری ہو جاتیں۔ میں جب کھڑکی کھول کر باغ سے پرے دیکھتی تو مجھے لگتا اس زمین کو اور ان درختوں کو جنموں سے دیکھتی آئی ہوں اور پھر بھی پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ آموں پر بور تھا جس کی باس سے نیند سی آنے لگتی اور بڑے سہانے

سپنے دکھائی دیتے۔ میں کھڑی کھڑی جانے کیا سوچا کرتی تھی۔ سفید بگلوں کی قطاریں میرے سر پر سے اڑتی جاتیں اور آکاش کا نیلا سورج کی روشنی میں بڑا گہرا ہو جاتا۔ جیسے کسی سہاگن کا دوپٹہ ہو۔ میرا دل ہلکا تھا اور بہت سالوں سے جو خوشی میں نے نہیں دیکھی تھی وہ جانے میرے گرد تھی۔ میری رگوں کی اینٹھن کم تھی اور مجھے مہاتما کے لفظ رہ رہ کر یاد آتے تھے۔

آئینہ سامنے رکھے میں پہروں سنگھار کرتی اور اپنی آنکھوں میں دیکھتی کہ تنہائی کہاں ہے۔ میری سکھیاں تو کہا کرتی تھیں کہ ان آنکھوں میں مانو ستارے کوٹ کر بھرے ہیں۔ ارے یہ سوئی ہوئی دھرتی کی طرح ہیں۔ مجھے کون جگائے گا؟

پوجا میں میرا من آج کی طرح کبھی بھی نہیں لگا۔ شانتی کی آشا میں نے آج کی طرح کبھی نہیں کی۔ اور میرے نصیب میں نہ شانتی ہے اور نہ بھکتی۔ پر اس بھاگن میں میں مندر جاتی سیڑھیوں کو دھوتی اور دیوتا پر پھول چڑھا کر پرارتھنا کرنا چاہتی مجھے کیا چاہیے تھا۔ بھگوان تو تو من کی ڈھکی چھپی آشاؤں کو جانتا ہے۔ انتریامی مجھے کس شے کی چنتا تھی؟ اور من ہی من میں ہنستی کہ میں بھلا کیا مانگنے آئی ہوں۔ اس آسن پر کیوں جھکی ہوں ان قدموں کی دھول کیوں ماتھے پر چڑھاؤں گی مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیے تھا اشنان میلے میں جا کر پانی میں جھلکتے اپنے بدن کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے جیسے بلور میں ترشا ہوا ہو۔ بھلا مٹی کا یہ رنگ کسے اچھا لگتا تھا اور پھر بھی اس رنگ کے لئے میرے پتی دیو میری پوجا کرتے تھے۔

عورتیں مجھے ملتیں تو کہتیں بھگوان تمہاری طرح سب کا نصیب کردے۔ تم بھاگونتی ہو۔ ہماری لڑکیوں کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ اور میں یہ نہ کہہ پاتی کہ میں تو مورتی ہوں میری رگوں میں گرمی نہیں میرے دل میں کسی شے کو پانے کی آشا نہیں جنتا نہیں۔ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں کیا ہوں پھر تم لوگ کیوں مجھ سے اشیرباد مانگو؟ گیتوں کے بول میرے دل میں گونجتے رہتے۔ میرا کے بھجن پڑھتے ہوئے میں سوچتی میں کیوں رادھا نہ ہوئی۔ آج سے زمانوں پہلے بھگوان نے مجھے کیوں نہ پیدا کیا۔ اور پھر برہا کے گیت سنتے میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آ جاتے مجھے کس کا دکھ تھا میں کیوں برہن تھی؟ پدمنی کو سینے سے لگا کر یوں کھینچتی کہ وہ چیخ اٹھتی اور دسنتی کام کرتے کرتے سر اٹھا کر کہتی "بھابی آج کل تم اتنی سندر کیوں لگتی ہو مانو چمپا کی نئی کھلی کلی ہو۔ میں گھبرا کر پدمنی

کو چھوڑ دیتی۔ دسنتی کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھتیں اور میں شرما کر اپنے دالان میں چھپ جاتی۔

پر دسنتی وہاں پر بھی میرا پیچھا کرتی اور کہتی "اچھا بھیا کو تو آ لینے دو دیکھو تو سہی کیسا کیسا تمہیں پریشان کرتی ہوں، اسکے بھیا کے نام پر یوں لگتا جیسے کسی نے زور سے میرے سر پر کوئی چیز ماری ہو۔ میری رگوں میں خون ٹھنڈا پانی بن جاتا اور میں کہتی "دسنتی کبھی کوئی کام کی بات کیا کر بھلا تجھے کیا ملے گا مجھے پریشان کر کے اور پھر نراشی سی ہو کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی اور باغ میں اترتی چڑیوں کو ڈال ڈال پر پھدکتی ہوئی دیکھا کرتی اور سوچتی آدمی ایسا کیوں ہے کہ کسی شے سے بھی خوش نہیں ہو پاتا؟

دسنتی کی بُوا بھی اشنان میلے کے لئے اپنے گاؤں سے آئیں اُن کے ساتھ ان کی بہوئیں تھیں اور بیٹے پوتے تھے۔ دو چار سال بیماری کی وجہ سے ان میں سے کوئی نہ سکا تھا اور اب کے جب بُوا چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو سبھی کو لے کر مندر چڑھاوا چڑھانے آئیں گھر میں عجیب گہما گہمی اور رونق ہو گئی۔ میرے بیاہ پر آئیں تو بہو کے گھر بچہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد لوٹ گئی تھی۔ ان سب لوں ان کے بیٹے آتے تو باہر ہی سے پلٹ جاتے رہے۔ میری ساس ہوتیں تو خیر اور بات تھی۔ میری ماں بھی بھیا کو لیکر آئی تھی اور میری موسی کا بیٹا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ گھر میں اتنا منگل تھا اور دن رات ایسی بھیڑ رہتی کہ میرا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ دسنتی کی بُوا اور میری ماں مندر سے لوٹ کر آئیں تو پہروں بیٹھی جانے کہاں کہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ میرے پتی اُن دنوں گھر میں بہت ہی کم کم آپاتے۔ اتنے اپنوں کی وجہ سے انہیں میری اُداسی کی کوئی ایسی چنتا نہ تھی۔ بھیا ان پانچ چھ سالوں میں بڑا ہو گیا تھا اور جب جیجا کہتا تو لگتا کسی اور کو پکار رہا ہو۔ پدمنی اسکے کندھے سے نہ اترتی۔ میری موسی کا بیٹا کہیں پڑھتا تھا اور ماں کے اکیلے ہونے کی وجہ سے اسکے ساتھ آ گیا تھا۔ وہ بنارس سے چھٹیوں میں آیا تھا اور بہت بانکا تھا مجھے کہتا دیدی تُو تو بڑے گھر کی رانی بن گئی ہے بھئی ہم سے کاہے بولے گی۔ اور میں اسکے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ باقی لوگ بہت کم اندر آتے۔ باہر میلہ تھا اور اتنی رونق تھی کہ اندر آنے کی فرصت کسے تھی۔

ایک دن تُوا کے سب سے چھوٹے پوتے کی طبیعت بگڑ گئی تو بہو اداس ہو گئی اور بچہ پکار پکار کر بابا بابا کہتا رہا تو تُوا نے کہا چمپا اگر تجھے بُرا نہ لگے تو مُنّے کے بابا کو گھر میں بلا لوں۔ بچہ کب سے پکار رہا ہے اور نہیں بہلتا۔

میں نے کہا بھلا اس میں کوئی پوچھنے کی بات ہے تُوا ہم دوسرے دالان میں ہو جائیں گے ہمارے لئے کوئی بیگانہ تو نہیں بس اتنے دنوں نہ ملنے کی وجہ سے ذرا جھجک سی ہے پھر وسنتی اور میں دوسرے دالان میں چلے گئے اور یوں میں نے بانکے بہاری کو دیکھا۔

اسکے کانوں میں بالے ہلکورے لے رہے تھے اور وہ آنکھیں جھکائے تیز تیز قدموں سے آنگن کو پار کر رہا تھا۔ پھر مجھے لگا یہ سب لوگ یہ سارا زمانہ یہ ہر شے جھوٹ اور بیکار ہے میں ہدی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں وہ دیکھ رہا ہے پھر اسنے آہستہ سے سر پھیر کر ایک لمحہ کو میری آنکھوں میں جھانکا ہے اور جب میرا سپنا ٹوٹا ہے تو وہ بچے پر جھکا پوچھ رہا تھا " کیوں ارجن مُنّے مجھے کیوں پکارتے ہو باہر میلے میں چلو گے مٹھائی کھاؤ گے۔ بچہ اسکے گلے کے ساتھ لگ کر زور سے رونے لگا اور میں نے وسنتی کے کندھے کو اس زور سے دبایا ہے کہ اسنے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور کہا " بھابی تمہیں کیا ہو گیا ہے تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑتا جاتا ہے۔ تم اچھی طرح سے تو ہو۔"

میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے جیسے زمانوں سے پیاسی ہوں اور زبان منہ میں سوکھ کر لکڑی ہو گئی تھی میں نے سر ہلا کر کہا میرا جی اچھا نہیں وسنتی مجھے پانی لا کر دو۔ اور میری صورت کو تکتی وسنتی بھاگی ہوئی گئی اور پانی لے آئی۔ جنم جنم کے پیاسے کبھی پیاس بجھا سکے ہیں۔

بانکے بہاری بچے کو گلے سے لگائے باہر چلا گیا۔ شام کا نیلا دھندلکا چاروں طرف تھا۔ ہوا آواز سے چل رہی تھی اور سرد تھی۔ میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے سوچا رات کتنی سہانی اور سندر ہو گی تاروں بھری اور سورگ کی اپسراؤں کی طرح نازک کامنی سی۔ پردوں میں اپنا چہرہ چھپائے اپنے پائل چھنکاتی جانے کتنے من لبھائے گی۔ جانے کتنے لوگ اپنی پیاس بجھائیں گے کتنے لوگ اس کی اوٹ میں اپنے ہردے کی پیڑا اور من کی لگن ایک دوسرے سے کہیں گے؟ اور وہ ساری رات ایک نیلی دھند میں لپٹی میں بے سدھ سی پڑی رہی میرا جاگا ہوا من نئے پیدا ہوئے

بچے کی طرح اپنی حالت پر آپ ہی حیران تھا۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی اور سوچ نہ سکتی تھی۔ ساری آوازیں مجھے اپنے سے دُور باہر کہیں اور گھومتی لگتی تھیں۔ دو ایک بار وسنتی نے مجھے کھانے کے لئے کہا تو میں نے اُسے کہہ دیا میرا جی اچھا نہیں ہے اسنے کہا کیا بھیا کو بلاؤں تو مجھے یوں لگا جیسے بھیا جانے کون ہو بھلا اُسے مجھ تک بلانے سے میرا جی کیسے اچھا ہو سکتا ہے۔
ارجن کی حالت بگڑ گئی۔ اس شام سردی میں باہر سے جاتے ہوئے بانکے بہاری نے خیال نہیں کیا تھا اور اسے بخار آیا ہے تو وہ بیہوش ہو گیا۔ میں سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے سے باغ میں اُتر جاتی اور سیر مٹھیوں پر بیٹھی تالاب کے کنارے پہروں پانی میں جھانکتی رہتی۔ بیہوش سی شہد کی مکھی کی طرح جو زیادہ خوشبو میں بس درخت کے گرد چکر لگاتی رہے اور اسے بھول جائے کہ وہ شہد لینے کے لئے آئی ہے بھونرے کی طرح جو پھول تک پہنچ کر بس کھو جائے اور اپنا منہ پیلا کئے تکتا چلا جائے۔ اور یہ میرا جسم ایک نئے سانس سے بسا ہوا اتنا بیگانہ لگتا تھا کہ گھبرا کر میں اپنے ہاتھوں کو تکتی تھی۔ ایک نام پپیہے کے بول کی طرح میرے دل میں چکر لگاتا تھا بانکے بہاری بانکے بہاری چڑیاں ڈال ڈال پھدک پھدک کر یہی نام لیتی تھیں پتے ہوا سے ہلتے تھے تو یہی نام کہتے تھے ہوا جب درختوں میں سے گزرتی تو یہی آواز آتی تھی اور پھر چمپا چمپا جانے کون پکارتا تھا؟

میلا ختم ہو گیا تھا پر ارجن بھی بہت کمزور تھا۔ ما کچھ دنوں اور رُک کر اپنے باقی بچوں سمیت چلی گئیں صرف بانکے بہاری اور اس کی بیوی رُکے رہے۔ وسنتی کا بھیا میری طرف دیکھ کر سوچنے لگتا تھا اسے کیا ہو گیا ہے وہ میرے پاس بیٹھا رہتا اور میں اس سے بات نہ کرتی۔ جب وہ کچھ کہتا تو یوں چونک کر اس کی طرف دیکھتی جیسے جانے وہ کون ہو اور مجھ سے اُسے کیا کہنا ہو۔ میرے پاس کیوں بیٹھا ہو۔ پھر اسنے سوچا میں بس یونہی اداس ہوں اور ماں کے جانے کے بعد گھبرا گئی ہوں۔ تب پہلی بار اپنے رسم ورواج بھول کر اسنے کہا۔
"چمپا اگر تم جانا چاہو تو تھوڑے دنوں کے لئے مائکے ہو آؤ۔ تمہارا رنگ یوں پیلا پڑتا جا رہا ہے جیسے کوئی بڑا دکھ اندر ہی اندر تمہیں کھائے جا رہا ہو۔ مجھے کیوں نہیں بتاتی ہو۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہارا دکھ دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اور پہلی بار میں نے جانا کہ

یہ سب کیا دھرا اُسی کا ہے اگر وہ اپنی اچھی صورت کے ساتھ دیوتا بنتا تو۔ پر لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ مجھے اس پر بڑا ترس آیا وہ میرے لئے آپ اتنا دکھی ہو رہا تھا۔ وہ میرے لئے ایسی ساری باتیں کرنا چاہتا تھا جو اُن کے خاندان میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ ان دنوں میں پدمنی کو بھی بھول گئی وستنی کو بھی بھول گئی۔

جب بانکے بہاری نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے وہ شام بادلوں کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی اور بارش سے بھیگی ہوئی تھی میں پشمینے میں لپٹی تکئے سے ٹیک لگائے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اور باقی سب لوگ ارجن کے پاس تھے۔ وستنی بھی اپنے کمرے میں باندیوں کے ساتھ کہانی کہہ رہی تھی۔ بجلی جب چمکتی ہوگی تو بچہ ڈرتا ہوگا۔ ارجن کے رونے کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میرے پتی ابھی مندر سے لوٹ کر نہیں آئے تھے میرا خیال تھا جیسے پوجا ابھی ختم نہیں ہوئی ہوگی۔ میں آگ کے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو لوہے کو بھی سرخ کئے دیتے تھے اور لوہا مانو پگھل رہا تھا۔ ان کے ساتھ بہنے والا تھا۔ دئے کی لَو بڑی مدھم تھی اور آگ کا عکس میرے میرے چہرے پر پڑ رہا تھا مجھے اپنی آنکھیں جلتی ہوئی لگتی تھیں۔

کسی نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا بھابی کیا گھر میں امرت دھارا ہوگا۔ ارجن روئے جاتا ہے۔ جب میں نے منہ پھیر کر دیکھا ہے تو بانکے بہاری تھا۔

باہر ہوا ایک بین کرنے والی آواز سے چل رہی تھی۔ اور کھڑکی میں سے جو بادل مجھے دکھائی دے رہے تھے وہ آگ کے رنگ کے تھے آکاش پگھل کر اُن میں ملتا ہوا لگتا تھا۔ سورج اب ڈوب رہا تھا۔ یہ پہلی گھڑی تھی کہ ہم دونوں اکیلے ملے تھے۔ میں اٹھنا چاہتی تھی اور اٹھ نہ سکتی تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے گئی۔ اُس نے گھبرا کر پھر کہا" بھابی منا رو رہا ہے اگر امرت دھارا ہو تو دے دو۔"

دوسروں کے سامنے ہم نے آج تک کوئی بات نہ کی تھی میرا کیسا کیسا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بولے کچھ تو کہے اور آج جب ہم آمنے سامنے تھے تو سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیا بات کر سکتی ہوں۔ جانے اُسنے ندی کنارے بیٹھی اُس رنگین شام والی لڑکی کو پہچانا بھی تھا کہ نہیں؟

تنے میں ارجن بہت زور سے چیخا اور بانکے بہاری بھاگ کر میرے جواب کا انتظار کئے بنا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ آج جنموں کے بعد ہم اکیلے ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے اور آج اسی گھڑی وہ میری پرواہ کئے بنا جب کہ میں اپنا دل اسکے قدموں میں ڈالنے والی تھی بھاگ کر چلا گیا تھا جیسے اور دنیا وہ بچے وہ بیوی اس کے لئے سب کچھ ہوں اور میں جس نے زمانوں اس کا انتظار کیا تھا اس کی کچھ نہ تھی۔ من جب انوکھی باتوں سے دکھی ہونے لگتا ہے تو اسے کون سمجھا سکتا ہے۔ مورکھ من! میری آنکھیں دکھ کے آنسوؤں سے بھر گئیں اور میں روتے روتے تکئے کے سہارے گر گئی۔ میرے لئے کوئی امید نہ تھی۔ بانکے بہاری کو میرے دل کی ذرّہ برابر بھی خبر نہ تھی میرا اپنی اندر آیا ہے تو میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے مجھے پکارا مجھے ہلایا اور جب وہ گھبرا گیا تو اسنے وسنتی کو آوازیں دیں۔

میں ایک روگی کی طرح بستر سے لگ گئی اور دیئے کی بتی کی طرح گھٹنے لگی ہو اور بانکے بہاری دونوں میرے پاس آکر بیٹھے رہتے۔ تارا بڑے پیار سے میرے ہاتھوں کو دباتی اور مجھے کہتی بھابی کنتیں کیا ہے تم روز بروز گھلتی کیوں جارہی ہو۔ بانکے بہاری کہتا "جب ہم آئے تھے بھابی تو آپ اچھی بھلی تھیں اب اتنے تھوڑے دنوں میں آپ کی صورت بدل گئی ہے۔"

تارا اتنی سندر تھی جیسے چاند ہو۔ بالکل دیوی کی سی موہنی اسکے چہرے پر تھی جب ہنستی تو میرا دل چاہتا اُسے اپنے دل کے ساتھ لگالوں۔ بانکے بہاری اسکی صورت کو دیکھ کر جیتا تھا۔ باہر سے آتا تو تارا تارا پکارتا ہوا۔ یوں ایسا اوچھا بھی نہ تھا۔ مگر تارا میں اس کی خوشی تھی جیسے چاند اور چکور ہو۔ میں لیٹے لیٹے یہ سب دیکھتی اور میری آس ٹوٹ جاتی۔ کیا ہی اچھا ہو یہ دونوں چلے جائیں تو!

پھر میری بیماری لمبی ہوتی گئی اور وہ دونوں چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ تارا مجھ سے مل کر جاچکی تھی اور اب کمرے میں سے سامان باہر بھجوا رہی تھی۔ بانکے بہاری جب مجھ سے وداع ہونے آیا ہے تو میں دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھی اور رو رو کر میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ہچکیوں سے میرا جسم ہل رہا تھا۔ جب اس کے بلانے پر بھی میں نہ بولی تو اس نے مجھے ہلا کر کہا۔

"بھابی۔ بھابی۔ آخر آپ کو کیا ہے۔ کیا آپ کا جی بہت ماندہ ہے۔ میرا جسم اس کے ہاتھ کے نیچے پگھل کر پانی بن گیا۔ جیسے وہ سورج تھا اور میں ایک قطرہ۔ جیسے وہ آگ ہو اور میں چنگاری۔

دُکھ میں آنند ملا تھا میں نے دیوار کی طرف منہ کئے کئے اپنے کندھے پر پڑے اسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جو کانپ رہا تھا اور رگوں کی ساری آگ زندگی کی ساری تمنا میری انگلیوں میں سما گئی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے جلتے ہوئے ہاتھ کے نیچے ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ اور یوں زمانے بیت گئے۔

بیساکھ آگیا تھا جب میں لوٹ پوٹ کر تندرست ہوئی ہوں۔ فصلیں کٹ گئی تھیں اور دُور دُور تک سنہرے ڈھیر کھیتوں میں تھے۔ ہوائیں دیوانوں کی طرح درختوں میں ناچتی ہوئی چلتیں اور مندر میں چڑھاوے چڑھانے والوں کی بھیڑ رہتی۔ ڈھول بجتے رہتے اور لوگ مست ہو کر دیوی ماں کی استتی گاتے۔ میں ان ساری آوازوں کو سنتی جو اپنی گہری گونج کے باوجود صرف میرے کانوں سے ٹکرا سکتیں تھیں۔ اندر میرا من یوں تھا جیسا جاگ کر پورے ہوش میں نہ آیا ہو۔ دستی کہتی بھابی یہ تمہاری صورت ایسے کیوں ہے جیسے آدمی سپنا دیکھ رہا ہو۔ تم کون سپنے دیکھتی ہو جبکہ میرا بھیا بھی تمہارے پاس ہے مجھے یوں لگتا ہے مانو تم ایک پری ہو جو ہمارے گھر جانے کیسے آگئی ہو اور جب تمہیں وقت ملا تم پنکھ پھیلا کر اڑ جاؤ گی" پھر ہم دونوں مل کر ہنسنے لگتے" اور بدھ متی بھی کھیلتی ہوئی کہیں سے آکر ہمارے ساتھ مل کر یونہی ہنستی خوشی روشنی ہے جو ایک سے دوسرے چہرے پر پھیلتی ہے جیسے دیئے روشن ہو جائیں۔

وقت ایک ایسے جنگل کی طرح میرے سامنے پھیلا تھا جس میں سے نکلنے کا راستہ میری آنکھیں ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں اور پا نہ سکی ہوں۔ بانکے بہاری میرے دل کا حال جانتا تھا پر اس سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے میری کوئی پرواہ نہ ہو میں صرف اسکی بھابی ہوں اس کے بھائی "چندر شیکھر" کی بیوی۔

دن لمبے ہوتے جاتے تھے اور ہوا کے ساتھ سفید روئی کے گالوں کی طرح چھوٹے چھوٹے جالوں کے قافلے میرے سر کے اوپر سے گزرتے رہتے۔ ایسی دوپہر میں جب نیند آنے لگتی ہے

رہٹ کی آوازیں ساری دُنیا کے ساز بجنے اور میرا دل چاہتا پر لگا کر اڑ جاؤں۔

مہاتمانے کہا تھا تمہارے من میں جوت جلے گی۔ مگر یہ جوت کیسی تھی کہ اسکی روشنی نہ اندر تھی نہ باہر جو کسی تک بھی پہنچ نہ پاتی تھی۔ آموں کے بور کی خوشبو مدھم پڑتی جاتی تھی اور باغ میں کوئلیں شور مچاتی رہتیں۔ سویرے میرے سپنے انہی کے بولنے سے ٹوٹتے۔ میں اپنے سینے کو پکڑ کر بیٹھ جاتی" دل باہر نکلنے لگتا۔ کوئل جانے اتنے دُکھ سے کیوں روتی ہے؟

"چندر شیکھر" اگر کبھی بانکے بہاری کا نام لیتا تو میرا دل یونہی دھڑکنے لگتا۔ سارا جہان اس کی دھڑکن کی تال پر مجھے ناچتا اور کانپتا لگتا تھا اور پھر سب سے زیادہ ڈر مجھے اس بات کا تھا اگر "چندر" کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا اس کی دیوانی چاہت کا کیا بنے گا۔ وہ کیا کہے گا شاستروں نے مجھے اس کی پتنی بنایا تھا اور میں ایک پتی ورتا عورت نہ تھی۔ میں شروع سے ایسی نہ تھی پھر ایسے ہی ان گنت دکھ میری جان کو روگ بن کر آن لگتے۔ دریا کے گھاٹ پر مندر کی سیڑھیوں پر بولتے اور چلتے لوگوں سے ملتے برادری کی عورتوں میں مل کر بیٹھتے اشنان اور پوجا کے سمے میں ایک ایسے چور کی طرح تھی جس کو کسی گھڑی بھی اپنے راز کے کھل جانے کی فکر ہو۔ دیوی کے سامنے میں جانے سے ڈرتی دیوی ماں تو دلوں کا حال جانتی ہے اور دیوی ماں یہ بھی جانتی ہے کہ میں نے بانکے بہاری کے لئے اپنا آپ بیچ دیا ہے۔ میں پھر بانکے بہاری کو کب دیکھوں گی؟

دسنتی باتیں کرتے ہوئے کہتی تارا بھابی کتنی سندر ہے مانو چاندنی ہو۔ جب ایسے چہروں کو دیکھو تو دنیا بڑی پیاری لگنے لگتی ہے جی چاہتا ہے بس جیئے چلے جائیں اور پھر بھیا بہاری ہے کتنا اونچا اور سندر ہے دیوتا لگتا ہے۔ میرے بھیا سے بھی نکلتا قد ہے۔ تُو کے سارے بیٹوں میں سے وہی سب سے بانکا ہے۔ جب میں بہت چھوٹی سی تھی اور ماں زندہ تھی تو ہمارے بابا کے پاس رہا کرتا تھا۔ پھر ماں اور بابا دونوں چلے گئے اور تُو اب بوڑھی ہو گئی ہیں کم کم ہی آتی ہیں اُن دنوں ہمارے گھر میں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اب تو مجھے بہاری بھیا کے سامنے آتے لاج آتی ہے ان دنوں وہ مجھے اٹھا کر گھوما کرتے تھے اور میں ان کو کتنا تنگ کرتی تھی۔

بھابی تب یہ مندر اور گھاٹ اور یہ گاؤں بہت آباد تھا۔"

مجھے ہر اُس شے سے جو بانکے بہاری چھو چکا تھا لگاؤ تھا پھر دسنتی سے کیوں نہ ہوتا۔ دسنتی یونہی

بڑی پیاری لڑکی تھی پھر اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں ہی تو تھے۔

پوربی ہوا چلتی تو میری کھڑکی کے کھلے پٹ یوں بجتے جیسے دو بچھڑی روحیں آپس میں گلے مل رہی ہوں۔ میں بازو کھول دیتی اور میرا جی چاہتا ہوا کی یہ ساری شوخی اور تیزی اپنے میں بھر لوں۔ اور ان ساری خواہشوں اور خیالوں کے اوپر میرے کان ان قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار رہتے جن میں میرا دل تھا۔ ساری دنیا دہی تھی کہ ایک دل کے بدلنے سے سب کچھ اور ہو گیا تھا۔

پھر گرمیاں آئیں اور سنسناتی ہوئی دوپہروں کے ساتھ گزر گئیں۔ برساتیں ہوئیں اور برہا کی ماری کا دل ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ برکھا اور بادلوں کے گھنیرے میں رنگوں اور درختوں کی ہریالی میں میں نرک کی اس آگ میں جلتی رہی جس سے مجھے کبھی چھٹکارا ملنے والا نہیں تھا۔

جب دستی کی منگنی ہوئی ہے تو اور لوگوں کے ساتھ بانکے بہاری بھی آیا۔

گھر عورتوں سے بھرا تھا اور بہت بھیڑ تھی۔ گاتی ہوئی عورتیں سنگار خوشبوئیں اور پھر سکڑی سمٹی دالان کے ایک کونے میں گاؤں کی لڑکیوں اور برادری کی ماسیوں اور چاچیوں سے گھری دستی بیٹھی تھی۔ "چندر شیکھر" نے اس سے پہلے اس بات کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جب کیا ہے تو مجھے ہوش کہاں ہو گا کہ میں یہ کہہ سکوں کہ دستی سے پوچھ لیا جائے بھلا کسی نے کبھی لڑکیوں سے بھی پوچھا ہے کہ تمہاری مرضی کیا ہوتی ہے؟

رسم ختم ہوئی ہے تو بھیڑ ہوتے ہوتے چھٹ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ منزل سامنے تھی اور میں وہاں تک پہنچ نہ سکتی تھی اور میں بہت اداس تھی۔ پرانی بیماری پھر سے مجھے آتی جان پڑی۔ میں سارا سارا دن دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی رہتی اور اس ہاتھ کی منتظر رہتی جو میرے کندھے پر پڑے گا اور میرے ہاتھ کی گرمی کے نیچے ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میری رگوں کی وہ اینٹھن پانی بن کر بہے گی اور میرا سارا وجود اسکے قدموں میں ہو گا جسے شاید ان سب کی ضرورت بھی نہ تھی۔

بہاری کی اور میری دوسری ملاقات بالکل اچانک ہوئی۔ دستی پوجا کے لئے مندر گئی ہوئی تھی اور میں اپنے کمرے میں رنگوں کی پٹاری میں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی شاید دستی نے کچھ کہا ہو گا کہ وہ باہر کھنکارا اور پھر دالان کو پار کر کے دروازے کے بیچ میں کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں کے وہیں رک گئے اور ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گئے۔

اسنے دوبارہ کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور کہنے لگا " بھابی میں وداع لینے آیا ہوں۔ آج اپنے گاؤں جاؤں گا تارا کو کیا کہوں وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔

میرے کانوں میں اس کی آواز میٹھے مدھر راگ کی طرح پڑ رہی تھی جو مجھے سلا ہی تو دیگا۔ اسنے پھر کہا میں نے سوچا بھیا سے وداع لینے سے پہلے تم سے وداع ہو لوں۔ تم بیمار تھیں جب ماں گئی ہیں تمہارا بھی بہت پوچھ رہی تھیں جس دن سے میں آیا ہوں اس بھیبڑ بھڑکے میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟

مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس سے کہتی بیٹھ تو جاؤ۔ وہ وہیں دہلیز پر کھڑا تھا اور باقی ساری دُنیا کے اور میرے درمیان تھا۔ اور پھر بھی مجھ سے بہت دُور تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ صرف ایک اندھا بے نام زور تھا جو یہ کہہ رہا تھا اگر اب کے بھی بہاری سے کچھ کہہ نہ سکیں وہ کچھ سُن نہ سکا تو ساری عمر روتی رہو گی۔ ہر روز دستی کی منگنی تو نہیں ہو گی۔ روز تو پھول نہیں کھلیں گے۔ یہ رُت سدا تو نہیں رہے گی۔

ہولے ہولے میں نے اپنی پوری طاقتیں لگا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اسکی طرف دیکھا وہ ایک جادو کئے ہوئے انسان کی طرح وہیں دہلیز میں کھڑا تھا اور میری طرف دیکھتا جاتا تھا میری ان نگاہوں نے مجھے کتنا ننگا کر دیا تھا اور پھر ان آنکھوں کی حیرت وہ بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھیں جیسے تصویر میں بھگوان کرشن کی ہوتی ہیں۔

پھر وہ مڑا اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کچھ کہہ سکتی لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پار کر کے باہر چلا گیا۔

میں نے منہ کو ہاتھوں میں چھپا لیا اور رنگوں کی پٹاری پر گر کر زور زور سے سسکنے لگی بھگوان یہ میں نے کیا کر دیا تھا۔ کیا چاہت کا یہی مطلب ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے قدموں میں گرا دیا۔ عورت کی شان اس کا مان پوتر تا۔ ہائے مجھے لاج نہ آئی جانے بہاری کیا کہتا ہو گا۔ اب تو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ ورنہ وہ یوں بھاگ کیوں جاتا۔ اسے مجھ سے سخت نفرت تھی۔ بھگوان اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں یوں تڑپ رہی تھی جیسے مجھے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

بھاگتی ہوئی وسنتی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی اسکے پیچھے باندیوں کی قطار تھی سارے پریشان چہروں کے درمیان میرا من میرے ہاتھ سے چھوٹتا جاتا تھا۔ شرم اور بے عزتی کے خیال سے میرا جسم پانی ہوا جاتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ بھگوان یہ کیسی جوت تھی جو میرے من کو کبھی روشن نہ کر سکے گی۔ بھگوان کیا تو دیا نہیں کر سکتا۔

پدمنی رو رہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اپنے ایسے جسم میں ٹھوک دوں اُس گھڑی پر ہزار پھٹکار جب میں پیدا ہوئی ہوں خاندان کا نام لاج اور شرم۔ ارے میں کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ ایسی عورت کے لئے تو موت سے زیادہ کوئی بہتر شے نہیں۔

سارا دن گزر گیا شام آگئی "شیکھر" میرا دل بہلاتا رہا ویدجی نے طاقت کی کئی دوائیں دیں۔

۵

رات قریب آئی تو مجھ میں نئی طاقت آگئی۔ پدمنی کہانی سنکر سو گئی۔ میں نے "شیکھر" سے کہا میرا جی چاہتا ہے مندر جاؤں۔ وہ حیران ہو کر بولا "ویسے تمہارا جب جی چاہے تم ضرور جاؤ۔ مگر رات اندھیری ہے تمہیں ڈر نہیں لگے گا کہو تو میں ساتھ چلوں۔" اور میں نے بڑے پیار سے اس سے کہا "تم بھی بس ایسے ہی ہو مندر کونسا ایسی دوری پر ہے اور پھر جہاں دیوی ماں ہو وہاں ڈرنے کی کیا بات ہوگی تم سارا دن کے تھکے ہوئے آرام سے سو جاؤ۔ میں کسی کو بھی نہیں لے جانا چاہتی میں آج تن اور من لگا کر پرارتھنا کرنا چاہتی ہوں تاکہ یہ جو روز روز مجھے بیماریاں آگھیرتی ہیں اُن سے چھٹکارا ملے۔ تم پریشان ہوتے ہو تو میں اور بھی پریشان ہوتی ہوں۔" اور پھر میں نے جھک کر اسکے ماتھے کو چوم لیا۔

بہت دنوں کے بعد میں نے اتنا دل لگا کر اور پیار سے اس سے بات کی تھی اس لئے وہ بہت خوش تھا۔ پھر میں نے پدمنی کو پیار کیا اور جاتے ہوئے "شیکھر" کے پاؤں اپنی آنکھوں سے لگائے وہ اٹھ بیٹھا اور بولا "چمپا آج تمہیں کیا ہو گیا ہے لگتا تم بہت نراش ہو مجھے تو بتاؤ کیا بات ہے۔ تم یوں کیوں کر رہی ہو ماتو آخری بار ہو۔ نصیب میں جو بدا ہے وہی ہوگا۔ پر جب

تک ہیں زندہ ہوں تم مر نہیں سکتیں تمہیں کیا ہے۔ ضرور جاؤ اور دیوی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر جی بھر کر پرارتھنا کرو۔ بھگوان جانتا ہے میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آس یہی ہے۔ تم تو میرے سر دے کی روشنی ہو۔ تم میری پدمنی کی ماں ہو تم میری ساری دنیا ہو۔"

اس رات میں نے پور پور سنگھار کیا تھا۔ اپنا سب سے بڑھیا جوڑا نکال کر پہنا تھا۔ زیوروں سے لدی آخری بار جب دیئے کی لو میں میں نے آئینہ دیکھا ہے تو میں خود حیران تھی۔ میں تو مرنے جا رہی تھی۔ شرم کے بوجھ تلے دبی میں تو آخری گھڑی دیوی کے قدموں میں جان دینا چاہتی تھی۔ اور یہ سنگار کیسا تھا جیسے میں بہاری کو ملنے جا رہی ہوں۔ بہاری کا نام سویرے کے بعد اب میرے من میں آیا تھا جیسے کوئی رات کا مسافر سب سے آخر میں آئے اور دوار کھٹکھٹا کر تھکا ہارا اندر آتے ہی سو جائے۔ پھر اس نام کے تال اور سُر پر جیسے میرے قدم ناچتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھال میں دیئے جلائے اور پھول رکھے میں اکیلی مندر کی طرف چلی۔ پلو میں بندھی زہر کی پڑیا کو رہ رہ کر میں ٹٹول رہی تھی۔

میرا دل کہتا تھا تم ایسی دلہن بنی ہو جو پہلی بار اپنے پریتم سے ملنے جا رہی ہو۔ تم رادھا ہو جو اندھیرے میں اپنے کرشن سے ملو گی۔ تم رگمنی ہو جسے چرانے وہ آپ آئے گا۔ اور مرنے والے کی طرح نہیں زندگی میں پہلی بار داخل ہونے والوں کی طرح میرے قدم ہلکے اٹھ رہے تھے۔ ساری دنیا مجھے اپنے گرد ناچتی لگتی تھی۔ ہوا میں ایسی سنسناہٹ تھی جو خوشی کا گیت سا ہو ہے بھگوان کیا بہاری چلا گیا تھا ــــ بہاری۔ بہاری۔ بے وقت کوئل جانے کیوں بول رہی تھی؟

مندر میں دیا مُند مُند جل رہا تھا۔ میں نے تھال رکھ دیا اور پھول دیوی کے چرنوں پر چڑھا دیئے۔ اتنے دیئے جلنے سے روشنی زیادہ ہو گئی تھی۔ دیوی ماں مجھ سے اونچی تھی اور اندھیرے سے ملی روشنی میں مجھے اس سے ڈر بھی لگتا تھا پر ڈر کس بات کا تھا۔ یہ میری زندگی کی آخری رات تھی۔ میں اُن چرنوں میں جھکی دیوی ماں سے زندگی کی نہیں موت کی بھکشا مانگ رہی تھی۔ دیوی اگر پریم کرنا اگر کسی کی آشا کرنا اتنا ہی بُرا ہے تو میں جینا نہیں چاہتی ہر دن میرے لئے مصیبت تھا۔ اور ہر گھڑی میرے لئے عذاب۔ ایسے انسان کی طرح جس کی جان بس ہونٹوں پر اٹکی ہو۔ دیوی ماں

لوگ تجھ سے جینے کی بھکشا مانگتے ہیں میں تجھ سے موت کی دکشنا لینے آئی ہوں۔

دیوی ماں مجھے طاقت دے۔ دیوی ماں مجھے شکتی دے۔

اُس گھڑی مجھے ماں یاد نہیں آئی۔ مجھے کندھے پر اٹھانے والے بابا یاد نہ آئے۔ پلّو پکڑ کر پیچھے بھاگنے اور چمپا کہنے والا بھیا یاد نہ آیا۔ سکھیاں اور سہیلیاں نہیں۔ پدمنی اور "شیکھر" کوئی بھی تو میرے ذہن میں نہ تھا۔ بس ایک خیال تھا کہ آج میری آنکھوں میں میرے تن کی بھوک کو بہاری نے جان کر بھی مجھے دھتکار دیا ہے اور سوائے مرنے کے میرے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ موت میرے سارے دکھوں کا انت تھی۔ میرے سارے کشٹ دُور ہو رہے تھے تو مہاتما نے یہی کہا تھا کہ میرا پتی اور میری پدمنی مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ پتہ نہیں اب میں کہاں اور کس صورت میں جنم لوں۔ مجھے مکتی کبھی نہیں ملے گی — دیوی ماں مجھے شکتی دے۔ میں جینا نہیں چاہتی مجھے مرنے دے۔

پھر میں نے اٹھ کر دئے بجھا دیئے۔ باہر چاند کی روشنی تھی جو بڑے دروازے کی دہلیز پار کر کے اندر آنا چاہتی تھی۔ پر ایسی رات جب موت اندر ہو اور یم کے دوت دوار میں کھڑے ہوں۔ چاندنی بھی اچھوت کی طرح باہر بھٹکتی رہی۔

دیوی ماں کے چرن چھو کر میں نے پلو کے اس کونے کو ہاتھ میں پکڑا جس میں زہر تھا۔ پھر میں نے ایسی آواز میں جو مندر میں گونج گئی۔ کہا۔ "دیوی ماں تو گواہ ہے میں لاج شرم اور پوترتا کے لئے مر رہی ہوں۔ تاکہ میرے من کو ایسی بیماریاں نہ لگیں جو پتی ورتا استری کی سہار سے باہر ہوں۔ بھگوان تو میرے اس بلیدان کو سویکار کرے۔ میری انگلیاں ہولے ہولے گرہیں کھول رہی تھیں اور میں دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی تھی۔ دیوی کے قدموں کے پاس صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ پڑیا کو کھولتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ گئے۔ میں نے سوچا باہر کتنی نرم چاندنی ہے اور ہوا ہے۔ اور ساری دُنیا جو مجھے پیاری تھی وہ نظارے جو مجھے سہانے لگتے تھے وہ سب اس ایک پڑیا کے بدلے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ پھر بُوا کو پتہ چلے گا اور پھر بہاری اور تارا آئیں گے اور کہیں گے چمپا بھابی نہیں رہی اور شاید بہاری کو دکھ ہو۔ شاید بہاری میرے لئے ایک آدھ آنسو بہائے۔ زندگی بڑی پیاری چیز ہے۔ میری انگلیاں پڑیا پر بہت بے جان سی

تھیں اور کاغذ کھوئے نہیں کھل رہا تھا۔ جب میں نے پڑیا کھول لی ہے اور منہ اونچا کر کے اُسے اپنے حلق میں گرانے لگی ہوں تو کسی نے ہاتھ مار کر زہر گرا دیا اور پھر دیا بھی بجھ گیا۔

میں سسک رہی تھی اور میرے من میں دیوالی ہو رہی تھی۔ اس چوڑے سینے میں سمانے کے لئے میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے ہونٹ میری باہیں اور یہاں تک کہ میرا دل بھی پگھل کر اس گرم دھارے میں مل گیا جو زندگی تھا۔ دیوی ماں نے مجھے دکشنا یوں دی تھی کہ مجھے میرا اپنا آپ بھی لوٹا دیا اور وہ بھی جس کی مجھے آشا تھی۔ شرم لاج اور گھونگھٹ جانے کہاں تھے۔

ایک مدھر سپنے میں دیکھی صورت کی طرح کوئی کہہ رہا تھا۔ سولہ سنگار کئے تم موت سے ملنے کہاں جا سکتی تھیں۔ موت میں کب اتنا بل ہے کہ سندرتا کو جیت سکے۔ یہ سپنوں کی سی رات ہے اس رات میں بھگوان ملتا ہے۔ بھگوان جو آپ پریم ہے جو آپ سندرتا ہے۔

میں کب تک تمہارا انتظار کرتا۔ چھپا میں کب تک تمہاری راہ دیکھتا۔

جب میں گھر لوٹی ہوں تو آکاش پر اندھیرا اجالے میں ملنا چاہتا تھا۔ سوئے ہوئے کھیت شانتی ہی شانتی صبح کا تارا شانتی تھا۔ اور میرا مسلا ہوا سنگار میری مسکی ہوئی چولی میرے گھنیرے اور کھلے بال میری چوری کی نشانی تھے۔ ہر طرف شانتی تھی۔ تو دھنیہ ہے دیوی ماں۔ تیرا مندر پریم کا مندر ہے۔

ارے اب ان بوڑھی رگوں میں کیا رہا ہے۔ اب دیوی سے کچھ بھی مانگوں تو کبھی نہیں ملے گا۔ میں نے تو سب کچھ مانگ لیا تھا اس ایک رات میں اسنے مجھ پر ہر شے کی بارش کر دی تھی۔ اُس برکھا میں نہا کر میرے بدن سے سارا میل میرے من سے ساری دکھن اور میرے انگوں کی ساری پیڑا دھل گئی تھی۔ میں پریم رنگ میں رنگی ہوئی اتنی پوتر تھی جیسے ابھی پیدا ہوئی ہوں۔

۶

وہ جیون جو اس رات کے بعد سے مجھے ملا ہے اس پر سوائے بہاری کے کسی کا ادھیکار نہ تھا وہ جیون اسنے بچایا تھا۔ دیوی ماں کے سامنے موت کے ہاتھوں سے یہ جیون اس نے چھینا تھا۔ یہ اس کی شکتی تھی جس سے یم کے دوت بھی شکست کھا کر لوٹ گئے تھے اور بھگوان جانتا ہے اس رات کے بعد سے میں نے سوائے بہاری کے کسی کو اپنا نہیں سمجھا اگر دیوی چاہتی تو مجھے شیکھر کو دلا سکتی

تھی۔ اگر دیوی کی آشا ہوتی تو۔ پر جو اندھیرے میں ہے اُسے سوائے بھگوان کے کون جانتا ہے۔ میں اور تم اور مہاتما سب اندھیرے میں ہیں زندگی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرے کا سفر ہے۔

جب میں نے آئینہ دیکھا ہے تو دیکھتی رہ گئی۔ اور پھر میں نے گھبرا کر آئینہ پرے پھینک دیا۔ کپڑے بدل کر پدمنی کے پاس آئی ہوں تو وہ جاگ رہی تھی اسنے اپنی باہیں اوپر اٹھا دیں اور میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "شیکھر" سویرے کی پوجا کے لئے مندر جا چکا تھا۔ میری آنکھوں میں سپنوں اور پریم کے رنگ ملے تھے دستی نے دیکھا تو کہنے لگی "بھابی تم تو رات ہی رات میں بدل گئی ہو مانو تمہیں نیا جیون مل گیا ہو۔ کل تک تم اتنی پیلی تھیں کہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا اور آج تو تم نئے کھلے پھول کی طرح ہو۔ پھر اسنے جھک کر میرے کندھے سے اپنی ناک لگا دی اور کہنے لگی" ارے یہ نئی باس تم میں کہاں سے آئی ہے تم تو مہک رہی ہو۔" میں نے اسے کہا "ہٹ تجھے تو ہر گھڑی مذاق سوجھتا ہے بھلا نئی مہک مجھ میں کہاں سے آئی۔ نہا کر آئی ہوں اس لئے۔

دستی نے سر ہلا کر کہا نہیں بھگوان کی سوگند اٹھوا لو۔ تم تو یوں نکھری ہو مانو ساگر میں سے نہا کر نکلی اندر کے دربار کی اپسرا ہو۔ ارے بھابی تمہاری آنکھوں میں یہ گلابی ڈورے کیسے ہیں۔ پھر وہ خوشی سے تالیاں بجا کر میرے گرد ناچتی رہی اور میں شرم سے لال ہو گئی۔

دوپہر کو "شیکھر" آیا تو کہنے لگا۔ "چمپا تم تو اتنی سندر جان پڑتی ہو مانو دیوی ہو یہ ایک رات میں تم کتنا بدل گئی ہو۔ تمہاری ساری بیماری کیسے دُور ہو گئی ہے؟ میں کہتا ہوں تم روز رات مندر میں پوجا کرنے جایا کرو تو دیوی ماں تم پر بہت ہی کرپا کریں۔ میں کتنا خوش ہوں کتنا خوش۔" اور اسنے چاہا کہ میرا ہاتھ پکڑے مگر میں پہلو بچا کر ایک طرف ہو گئی اور پدمنی کو بازوؤں میں لے کر پیار کرنے لگی۔

پدمنی بھی میری اس اچانک تبدیلی سے بہت حیران ہو گئی۔ ایک وہ دن تھے کہ میں پہروں دیوار کی طرف منہ لئے لیٹی رہتی اور کسی سے بولتی نہ تھی اب میرا دل ایک دم دنیا کے اتنے پیار سے بھر گیا تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے پریم دل کو بھی خیالوں کو بھی گہرائی دیتا ہے۔ میں آج تک کے اپنے اتھلے پن سے شرمندہ ہو رہی تھی مجھے "شیکھر" کے پریم اور اس پیڑا کا جو اسکے پردے میں ہوتی ہو گی پہلی بار احساس ہوا تھا کہ پیٹ آدمی کو صرف روٹی کے سپنے آتے ہیں اور جب پریم انتر

میں روشنی کر دیتا ہے تو باہر بھی ہر شے رنگ اور نور میں ڈوب جاتی ہے۔
میں گھر میں ایک تتلی کی طرح گھومتی پھرتی اپنے نئے پن میں آپ ہی مگن وسنتی کے گلے لگتی۔ پدمنی کو چومتی۔ "شیکھر" کو میں اتنے احسان کی نگاہوں سے دیکھتی اور باندیوں سے پہلے سے زیادہ رسان سے ملتی۔

ہر رات میرے لئے دیوالی کی رات ہوتی تھی۔ ہر رات مندر میں میرے لئے دن ہوتا تھا۔ اجالے میں میں دیکھتی کہ بانکے بہاری مندر کے ساتھ والے ایک کمرے میں بیٹھا پوجا پاٹ کرتا یا شاستروں کو پڑھتا۔ "شیکھر" گھر آتا تو کہتا "چمپا بہاری کے لئے کھانا اچھی طرح بھجا کرو۔ بیچارا دن رات اتنی محنت کرتا ہے کہتا ہے مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔"
وسنتی کہتی۔ بہاری بھیا کبھی گھر میں کیوں نہیں آتے جانے کیوں اتنے بیگانے ہو گئے ہیں، باہر پڑے رہتے ہیں۔ لوا آئیں گی تو شکایت کروں گی کہ انہیں جانے کیا سکھا کر بھیجا ہے کہ ہم سے ملنے نہیں آتے۔ کیوں بھیا تمہیں یاد ہے کیسے بھیا مجھے گودوں میں اٹھا کر گھوما کرتے تھے؟

شیکھر کہتا۔ میں تو کئی بار بہاری کو کہتا ہوں پگلے گھر چل آخر ایسا جتن اور اتنی تپسیا کرنے کا کیا فائدہ۔ ہر کام کے لئے وقت ہوتا ہے۔ تیرا ابھی مہاتما بننے کا وقت نہیں آیا۔
پھر اور باتیں ہونے لگتیں۔

میں بڑی بے تابی سے رات کا انتظار کرتی۔ پہلے پہل تو شیکھر بہت خوش تھا کہ چلو کسی بہانے ہی سہی۔ دیوی ماں کی سنگت میں ہی سہی چمپا کا دل تو بہلا چہک کر ہر کی وہ زردی اور بے رونقی تو دور ہوئی۔ ہر ایک سے اچھی طرح سے بولتی ہے گھر کے کاموں میں حصہ لیتی ہے۔ گاؤں والوں سے ملتی ہے اس نئی چمپا کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ وسنتی سے کہتا "دیکھا دیوی ماں نے تیری بھابی کو کتنا بدل دیا ہے یہ سارا پوجا کا پھل ہے۔" اور پھر دیوی ماں کی استتی گانے لگتا۔

بہاری کہتا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو پر رات میں میری ہو۔ میں رات کو مندر میں دیئے جلاتی "سیڑھیاں دھو کر دیوی ماں پر نئے پھول چڑھاتی" اور پھر پوجا کرنے کیلئے

بہاری کے قدموں میں جھکتی کہ بہاری میرا دیوتا تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اُسے دیکھ کر جیتی تھی۔ پر کبھی کبھار ایک خیال سوئے ہوئے ناگ کی طرح میرے دل میں سر اٹھاتا، ہو سکتا ہے بہاری کی چاہت وقتی ہو اور میں جو اپنا آپ بیچ کر اسکے قدموں میں آن پڑی ہوں میں جس پر ترس کھا کر اسنے گرے پھول کی طرح مجھے دھول میں سے اٹھایا ہے کیا پتہ وہ کبھی مجھ سے روٹھ کر واپس تارا کے پاس چلا جائے۔ ان خیالوں کا ڈنک میری خوشی میں ما تو زہر بنکر پھیلتا۔ پر یہ سارے خیال یہ ساری اُداسیاں ایک لمحے کی ہوتیں۔ دوسرے لمحے دریا کی بڑی لہر کی طرح اس مدہوشی کا طوفان مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔

وہی راتیں ہیں جو میرے پاس باقی ہیں انہی راتوں کا تیل ہے کہ میری زندگی کا دیا جلانے کو صدیوں کافی ہوگا۔ بہاری کے بعد اگر میرے پاس سہارے کے لئے ان بیتی راتوں کی یاد بھی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جانے کیا ہوتا۔

اندھیرے میں تیز باس والے گلاب کھلتے ہمارے چاروں طرف جھنکار ہوتی" اور مجھے لگتا ہم پر پھول برستے تھے۔ لوگ کہتے تھے ہم نے مندر کو بھرشٹ کر دیا ہے لوگوں کو جانے پونتر تا کس شے میں دکھائی دیتی ہے پریم سارے دھرموں سے اُتم اور ساری شرموں سے اونچا ہے اسکی ہدی تو آکاش میں ہے۔ اگر دیوی ماں کو یہ سب بُرا لگتا تھا تو ہم کو آپ مندر سے نکال سکتی تھی زمانے نے کبھی کسی کا ساتھ دیا ہے۔

بہاری کے بازو مجھے ستاروں کا ہنڈولا لگتے تھے اور پھر میں تو ندی کا دھارا تھا جو اسکے قدموں میں بہتا تھا اس کی انگلیاں میری ساری سختیاں ساری کٹھورتا پگھلا دیتیں اور میں یوں بہنے لگتی مانو سورگ میں سے آئی جل دھارا ہوں۔

میں کہتی بہاری ایک دیا ہو تو اچھا رہے اور بہاری کہتا تھا تمہاری آنکھوں کی جوت سے تو سارا جگ روشن ہے تم جو آپ روشنی ہو تمہیں دیوؤں کی کیا ضرورت ہے۔

میں کہتی بہاری اندھیرا دشمن ہے اس سے ہوشیار کیوں نہیں رہتے اندھیرا سیاہ سانپ ہے کہ چپکے سے ڈس لیتا ہے۔

اور بہاری میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر کہتا۔ پر اندھیرا کہاں ہے یہ اتنی بڑی

بڑی جوت سے بھری آنکھیں یہ تمہارے بدن سے پھوٹتی کرنیں کیا ان سب کے ہوتے تمہیں اندھیرے سے ڈرنے کی ضرورت ہے کبھی ہم دیوی ماں سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھے رہتے ایک دوسرے میں مگن ایک دوسرے سے لگے ہوئے جیسے ہم میں کوئی دوسرا نہ ہو ہم ایک ہی ہوں اور پھر اندھیکار کے دھڑکتے دل سے ڈرتی میں سوچتی یہ سپنا کسی دن ٹوٹ جائے گا۔ اتنی بہت خوشی کا بوجھ سنسار نے کبھی اٹھایا ہے؟ دھرتی اس بوجھ سے پھٹ جائے گی۔ مگر ان سارے وہموں کو میں نے جھٹک کر کبھی بہاری سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں بہت دنوں شیکھر کو دھوکا دینے میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

راتوں کو گھر سے میرا یوں مندر میں چلے آنا اور اندھیارے میں رہنا اس کی نظروں سے چھپا نہ رہے گا۔ اور پھر بہاری کا بنا کسی کام کے یہاں رُکے رہنا۔ ہے بھگوان کیا بنے گا مگر چار گھڑی سے زیادہ یہ سوچ مجھے پریشان نہ کرتی۔

میری بدلی ہوئی لگا میں میری چال جیسے کوئی سپنے میں چل رہا ہو۔ بوڑھی باندیوں کی نظروں سے کب تک چھپی رہتی میں گھر میں ہوتی تو دیکھتی باندیاں وسنتی کو لئے کونوں کھدروں میں چھپی باتیں کر رہی ہوتیں میری طرف دیکھتی ہوئی کئی بار وسنتی میرے پاس یوں آتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پر پلٹ جاتی۔ مجھے معلوم تھا وہ ان باتوں کا جھوٹ سچ جاننا چاہتی ہو گی جو باندیاں کہتی تھیں پر مجھے دیکھتی کر اپنے میں مگن گیت گنگناتی ہوئی اس کے جہیز میں دئے جانے والے جوڑوں میں کناری ٹانک رہی ہوں اور بہت ہی مصروفیت سے کسی صندوق کو الٹ پلٹ کر رہی ہوں۔ اناج تکوا رہی ہوں پدمنی کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔ پھر اس کے بھائی کے کپڑوں میں بڑے پریم سے بٹن ٹانک رہی ہوں تو وہ میرے پاس کھڑی ہوئی بڑی محبت سے مجھے دیکھتی رہتی اور پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی "میری بھابی تو سچ مچ اتنی اچھی ہے اور اتنی سندر۔"

اور میں کہتی "کیوں وسنتی کیا تجھے یہ سب جھوٹ لگتا ہے مجھے تو تو اپنی بہنوں کی طرح پیاری لگتی ہے تو تو مجھے پدمنی سے بھی زیادہ پیاری ہے جب تو چلی جائے گی تو پھر جانے میں کیا کروں گی۔ تیرے بنا یہ گھر کتنا سونا ہو گا۔ تیری ہنسی کی جھنکار تیری آواز کی مٹھاس کہاں سننے کو ملے گی۔" بیاہ کی بات پر وہ شرما کر بھاگ جاتی۔

آج لگتا ہے سُکھ تو ایک سپنا ہے سپنے میں دیکھے رنگ محل کبھی جاگتے ہیں دکھائی دئے ہیں؟ وہ سب دنوں جب میں زندگی کے پیالے میں سے خوشی کا آخری گھونٹ تک پی جانا چاہتی تھی۔ اصل میں ایک سپنے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بہاری سپنے میں دکھائی دیا ایک جوان تھا۔ سپنا چاہے کتنا ہی لمبا ہو سالوں پر پھیلتا چلا جائے آخر سپنا ہے اور جب سونے والے کی آنکھ کھلے گی اور وہ ہوش میں آئے گا تو سپنا ٹوٹ جائے گا۔

جس طرح اور سپنوں کے نصیب میں یہ ہے کہ وہ ٹوٹیں اسی طرح میرے نصیب میں بھی آنکھ کھول کر یہ دیکھنا بدا تھا کہ یہاں نہ بہاری ہے نہ مندر ہے۔ دیوی ماں کی مورتی بڑے دکھ سے اپنی ہنسی چھپائے ہوئے ہے اور بڑے لمبے ختم نہ ہونے والے دن ہیں جن میں کام ہے اور "شیکھر" کی نگاہوں کی بے یقینی ہے۔ میں جب اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھتی تو میری رگوں میں خون کی جگہ برف ہوتی۔ اور وہ جس نے کہا تھا کہ تم اندھیرے کی دلہن ہو کہیں نہ ہوتا۔ مندر میں دئے جلا کر آنکھیں بند کئے سوچتی رہتی ہر آہٹ پر کان دھرے اپنے سارے جسم کو مانو کان بنائے پر کسی کونے میں سے کوئی نہ اٹھتا کہ اس زہر کو جو ہولے ہولے گھل کر میری رگوں میں پھیل رہا تھا ہاتھ مار کر گرا دے۔ آنکھ بند کئے میری جاگتی آتما بھکاری کی طرح اپنا کرمنڈل اٹھائے ایک کونے میں کھڑی تھی کہ کبھی تو وہ ان راہوں سے گزرے گا۔

میری بھول یہ ہوئی ہے کہ میں نے اپنا وہ پھول جو مجھے اس کے قدموں پر سویکار کرنا چاہئے تھا بچا کر رکھ چھوڑا تھا کہ اس کے ماتھے پر کے تاج میں سجاؤں گی۔ اس کے سر تک میرے ہاتھ پہنچ نہ سکے اور میرا پھول میرے ہاتھ سے گر کر دھول میں مل گیا۔ آج تک اس مٹی میں بکھرے پھول کو دیکھتی ہوں اور افسوس میری نگاہوں سے آنسو بن کر بھی نہیں بہہ سکتا کہ یہ پھول کسی تاج میں نہ لگ سکا۔ میری بھول ہے سب میری بھول ہے اور بھگوان میری بھول کی سزا مجھے کتنی بڑی مل رہی تھی۔ میرا وہ پیالہ جس میں کبھی امرت تھا زہر سے بھرا ہے اور ہر روز مجھے اس پیالے میں سے گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا ہے اگر ایک ہی بار اسکو ختم کر سکتی تھی تو مگر نہیں مجھے یہ سب بھوگنا ہے کہ میں زہر بن کر جیوں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ بہاری کے اور میرے درمیان کتنے جنموں کا فاصلہ ہے جس سے آگے اور پیچھے ہونے کی میری مجال نہیں۔

ہر ایک آدمی کے حصے میں کچھ خوشیاں آتی ہیں اور کچھ رنج۔ میں نے اپنے حصے کی خوشیاں ان چند راتوں میں ختم کر دیں۔ پر یہ آج تک سمجھ نہیں آتا۔ ان راتوں میں یہ کیوں لگتا تھا کہ یہ خوشی میری باقی زندگی کے لئے کافی ہے۔ میں اس خوشی کی خاطر کئی نرک بھوگ سکتی ہوں۔ میں سارے سنسار سے مقابلہ کر سکتی ہوں۔ بھلا آج تک سنسار کے مقابلے پر کوئی ڈٹ کر جیت سکا ہے۔ سب ہی گر گئے ہیں اور ہم دونوں بھی گر گئے۔

جب وسنتی کا بیاہ ہوا ہے تو تارا بھی آئی تھی اور نُوا کی بہوئیں بھی۔ تارا اس طرح پریم سے مجھ سے ملتی، پروانوں کی طرح میرے گرد چکر رگاتی بھابی کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتی۔ پھر کاموں میں مگن، اگر ان دنوں وہ میری مدد نہ کرتی تو میں شاید بری طرح گر جاتی۔ بہاری کبھی اندر آتا بھی تو بس دو لمحے تارا سے بات کرتا اور چلا جاتا اس کی آواز سن کر میری رگوں میں ٹھنڈک سی بھر جاتی اور گھما گھمی میں بھی ایسی گم سم ہو جاتی جیسے بیہوش ہوں۔ تارا کہتی بھابی بھلا یہ بوجھ کس طرح برداشت کر سکتی ہے اکیلی پر کتنا کام ہے۔ مہینوں سے کام کر رہی ہے۔ بیمار نہ ہو گی تو کیا ہو گا۔ شیکھر بھاگا ہوا آتا۔ جہاں سے ہونا میں سے بلوایا جاتا۔ مگر میں بہت بیزار ہو جاتی۔ شادی کے کاموں میں لوگوں کی فکر میری وجہ سے اور بڑھ جاتی۔

ماں بھی آئی تھی بھیا اب لگتا تھا گبرو جوان ہے اسے دیکھ کر میرا جی بڑا اداس ہو جاتا کہ میں اس کی بہن ہوں اگر کبھی اسے پتہ چل گیا تو جانے کیا ہو گا۔ اسے کتنا بُرا لگے گا۔ میں بہاری سے لگ کر اپنے آپ کو دھرتی کا ایک ایسا ٹکڑا سمجھتی تھی جس پر بھگوان نے آپ پاؤں دھرا ہو۔ اور بھیا کو دیکھ کر میرا دل کانپ جاتا۔ صرف اسے دیکھ کر لگتا مندر میں دیوی ماں کے سامنے میں اور بہاری ڈاکوؤں کی طرح شیکھر کے حصے میں سے چراتے اور بھیا کی عزت میں سیندھ لگاتے رہے ہیں۔ بھیا کو دیکھ کر مجھے کیوں ایسا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹا تھا پر میں اس سے ڈرتی کیوں تھی۔

وسنتی وداع ہو گئی تو مجھے گھر ایک دم بہت سونا لگنے لگا۔ مجھے معلوم تھا باندیاں جو باتیں کرتی تھیں صرف وسنتی ہی ان کا منہ بند کر سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ دنیا کے اور میرے درمیان ایک حفاظت کی دیوار تھی۔ کمزور سی دُبلی کامنی لڑکی۔ اس نے بہت کچھ سننے پر بھی

کبھی مجھے نہیں کہا تھا سنی سنائی باتوں کو جھوٹ سمجھ کر ٹالا تھا۔ وہ طوفان کے آگے بندھ کی طرح تھی۔
ماں نے ایک دن سب سے الگ مجھ سے کہا "چمپا تجھے گھر کے سکھ اور اپنے من کے چین کی ضرورت نہیں تو کم از کم ہماری عزت کا خیال تو کیا کر۔ دنیا کی آنکھیں شیکھر کی طرح بند نہیں بہت کھلی اور تیز ہیں۔ تو نہیں چاہتی کہ ہم یا تیرا بھیا اپنا سر اٹھا کر چلیں۔ کیا تو چاہتی ہے کہ اس عمر میں تیرا بابا ڈوب کر مر جائے۔ اری چمپا ہوش میں آ۔ اگر تارا کو پتہ چل گیا تو کیا کہے گی۔ تیرا خیال ہے یہ باتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں کوئی تارا کو نہیں بتائے گا تو سوچتی ہے تیرے ڈر سے لوگ تیرا راز چھپا کر رکھیں گے تو یہ تیری بھول ہے۔ بیٹی لوگ تو بھگوان کا راز بھی کہہ دیں۔

میں سر جھکائے سن رہی تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کہتی گئی "کیا تو سوچتی ہے مندر کو بھرشٹ کر کے تو اور بہاری بچ جائیں گے۔ بھگوان کی سوگند تم پر دیوی ماں ضرور غصے ہوگی۔ اری تجھے لاج نہیں آتی تو ہم پر دیا کر آخری عمر میں ہمارے سفید بالوں میں کیوں کالک لگوائے گی۔ پھر تیرے اتنی سندر اور موہنی بیٹی ہے۔ آدمی کیا اپنے لئے ہی جیتا ہے تو میری بیٹی ہو کر ایسی ہوگی۔ تو نے میرا دودھ پی کر اتنا بڑا اپرادھ کیا۔" اور پھر وہ رونے لگی میں اٹھ کر جانے لگی تو اسنے میرا پلّو پکڑ لیا اور کہنے لگی "چمپا تو شیکھر سے نہیں ڈرتی تو اپنے بھیا سے ڈر وہ تجھ سے چھوٹا تو ہے پر بہت غصہ ور ہے۔ وہ تجھ سے روکے نہیں رکے گا اور پھر نہ جانے کیا ہو جائے۔ اری میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے بتا تو سہی بہاری میں ایسے کیا لال لگے ہیں جو تو شیکھر کو چھوڑ کر اسے چاہنے لگی ہے۔ جس پتی نے بھگوان کے سمان تجھے سارے سکھ دیئے تو انہیں تج کر پاپ کے راستے پر کیوں چلنے لگی ہے۔ تجھ پر کس نے جادو کر دیا ہے۔ چمپا تیرا بھیا جب سن پائے گا تو وہ مجھ سے نہیں رکے گا۔ پھر نہ کہنا مجھے خبر نہ کی اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔ پھر اسنے طاق میں رکھی بھگوان کرشن کی مورتی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ بھگوان تو گواہ ہے میں نے اسے سب برا بھلا سمجھایا ہے۔"
اور مجھے لگا جیسے وہ بہاری کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو۔"

ہرتری کی مسکان میرے ہردے میں تیر کی طرح اتر گئی۔ ٹکٹ لگائے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا بھگوان اور ستیش ناک نے میرے اندر گہرے سمندر میں زور سے پھینک کر

ماری۔ اتنی زور سے کہ میں ہل گئی۔ بہت دنوں سے میں نے بہاری کو نہیں دیکھا تھا۔ میں برتن تھی اور باغوں سے گھرے اور کوئل کی کوک سے بھرے اس گھر میں اکیلی تھی۔

باہر بسنت گانے والوں کی ٹولیاں تھیں اور مندر میں پچھلے سال سے بڑھ کر دھوم تھی۔ ہوا میں رنگ اور مہکار تھی۔ مست سادھو ناچنے والے اور بے سدھ ہو کر گر پڑنے والے بھگوان کے بھگتوں کی بھیڑ تھی۔ گھاٹ سے لے کر کھیتوں تک اور راستوں پر آموں کے بُور کی باس سے پنچھی اور آدمی سب مست تھے۔ کنواریوں کی چُنریوں میں رنگ نکھرے ہوئے ان کے چہروں پر چمکار اور ہنسی کی چھوٹ جیسے کرنوں کا دھارا بہے۔ مانجھی دن رات یاتریوں کو اُس پار سے اس پار لاتے اور ان کے گیت پانی کو چھو کر آکاش تک گونجتے ہوئے دھرتی نے نیا روپ بدلا تھا۔ درختوں کی چمکتی ہوئی نئی کونپلیں اور نکھرے ہوئے آکاش کے نیچے کروٹیں لیتی ہوئی زندگی پر ماں کو میں دیکھتی اداس سی جیسے ان چند دنوں میں مرجھا گئی ہو۔ بوا وسنتی کے دوبار سسرال جانے کے لئے رُکی ہوئی تھی۔ رات آتی تو میں انگاروں پر لوٹتی جانے کب میں بہاری کو دیکھوں گی۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا اور اسے کسی جگہ بلوانا میرے لئے ممکن نہ تھا اور مندر کے اندر باہر اتنے لوگ تھے۔

کوئل آموں کے جھنڈ میں بولتی تو میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آ جاتے۔ بہاری مجھ سے یوں آنکھیں چرا کر چلتا جیسے کبھی اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ اجالے میں میں ایسے نقطے کی طرح جو دھوپ میں مل گیا ہو اُسے دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ تارا کتنی بھاگوان تھی جس کو ایک دیوتا پتی ملا تھا اور جو اُسے چاہتا بھی تھا۔ سورگ سے نکالے ہوئے کی طرح مجھے کسی طرح چین نہ آتا۔ بھیا آکر بیٹھتا تو میں اُس سے بھی دل لگا کر بات نہ کرتی۔

لوگ کہتے ہیں اس لئے اداس ہوں کہ وسنتی اب اس گھر میں نہ ہو گی۔

وسنتی سسرال گھر سے پہلی بار لوٹ کر آئی ہے تو بہت خوش نہ تھی ایسے بھکاری طرح جس کو بس پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو ملی ہو۔ اس کی کاجل سے کٹیلی بنی آنکھوں میں دبے رونق تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ جب تک آس ہوتی ہے انسان جیئے جاتا ہے۔ پر جب آگے پیچھے کچھ نہ رہے اور جو ہو وہ تمہاری جھولی میں آن پڑے تو؟

دوسروں کے سامنے وہ بہت خوش رہتی۔ تارا بھابی سے گھُس گھُس کر باتیں کرتی، پدمنی سے مل کر پینگ بڑھاتی، اپنے لہریا دوپٹے کو جھٹکاتی تو وہ مجھے ایسی بہار لگتی جس کی آنکھوں میں ویرانی کا نقش ابھی سے جما ہو اور میں دل ہی دل میں پرارتھنا کرتی بھگوان تونے اس گھر میں کسی کے لئے شانتی نہیں لکھی۔ کیا ہم اپنی اپنی راہوں سے آپ مکتی کے لئے کھوج کریں۔ بھگوان تو ہم پر دیا کیوں نہیں کرتا۔ بھگوان!

سب لوگوں سے مل کر ایک رات جب شیکھر کسی کے ہاں پوجا میں گیا ہوا تھا اور تارا بوا اور ماں کے ساتھ باتوں میں مگن تھی وہ میرے پاس آئی اور پہلے چپ چاپ بیٹھی اپنے پلو کو انگلیوں میں مروڑتی رہی اس کے بعد اٹھ کر میرے گلے سے لگ گئی اور ہچکیوں سے مجھے اس کا سانس رُکتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

میں نے کہا وسنتی ارے ہوش میں آ تو رو کیوں رہی ہے ساری دُنیا کی لڑکیاں مائکے گھر سے وداع ہو کر سسرال جاتی ہیں کیا میں اس گھر میں ایسے نہیں آئی تھی۔

وسنتی نے کہا "بھابی تمہیں وہ گھاٹ والے مہاتما یاد ہیں انہوں نے ٹھیک کہا تھا" اور میں اسے کیا بتاتی کہ وہ مہاتما بھلا مجھے بھول سکتے تھے۔

میں نے کہا "ضروری نہیں کہ باغ میں جا کر پہلے ہی وہ سب پھول دکھائی دیں جو ٹوٹ کر جھول میں گرنے والے ہیں"۔

اور وسنتی نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "کیوں بھابی اس بھیڑ اور شور میں ہمارے بھیّا سے تو ملنا مہانہ ہوگا"۔

جس پریم کو میں نے ساون اپنا خون دے کر پالا تھا اس سے انکار کرنا میرے بس کی بات نہ تھی پھر وسنتی تو بہت کچھ جانتی تھی شاید اس سے بھی زیادہ جتنا میں سمجھتی تھی کہ وہ جانتی ہوگی۔

وسنتی پھر کہنے لگی "بھابی تم کسی کو اپنے سے اونچا سمجھ سکی ہو یہی بہت ہے۔ اس جیون میں ہر کسی کو تو یہ خوشی نہیں مل سکتی بھابی۔ اور پھر تم اور ہماری بھیا مانو ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہو۔ میں نے جب جب تمہیں دیکھا ہے تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میرا جی ناچ اٹھا ہے۔ جیسے تم رادھا ہو اور وہ بھگوان کرشن ہو۔ سپنے میں دیکھی سندر مورتیوں کی طرح۔ بھابی ایسی

راتیں ہر کسی کے نصیب میں تو نہیں ہوتیں۔ میں مر بھی جاؤں تو وہ پہلی رات نہیں بھول سکتی جب تم مندر میں دیوی ماں کے سامنے بہاری بھیا سے ملی تھی۔

میں نے کہا۔ اس رات تو میں سوچتی تھی مندر میں موت ہے اور میں ہوں۔ تم کہاں تھیں۔

وسنتی نے ہنس کر کہا مندر کا دوار کھلا تھا اور ہر کسی کو تمہاری طرح پوجا کا ادھیکار ہے۔ ہے نا بھابی۔

میرے من میں ایک شک نے زخمی سانپ کی طرح سر اٹھایا۔ کہیں وسنتی بھی بہاری کے لئے تو وہاں نہ جاتی تھی۔ کیا وہ بھی بہاری کو پوجتی ہے ؟

تم کو معلوم ہے وسنتی میں تو بھگوان سے اپنی پوترتا کے لئے موت کا سہارا مانگنے گئی تھی۔ تمہیں تو سب معلوم ہے وسنتی نے پھر کہا۔ دیکھو بھابی تم یوں کیوں گھبرا رہی ہو کیا پریم اور موت میں کوئی فرق ہے ؟ اور پھر تمہیں تو اس رات نئی زندگی ملی تھی۔ دیوی ماں نے تم کو جو کچھ دیا وہ کسی کو کب ملتا ہے۔ اس رات سولہ سنگار لئے باریک ساڑھی میں تمہارا روپ اتنا نکھرا تھا کہ اس سے پہلے میں نے کسی روپ وتی کو ایسا نہیں دیکھا۔ تمہارے ہاتھوں میں لگا رنگ تمہاری آنکھوں میں کاجل کی دھار اور پھر وہ خوشبو جیسے دھرتی کی ساری پوترتا نے عورت کا روپ دھار لیا ہو۔ تمہارے گھنیرے کھلے بال اور تمہارے سفید پاؤں۔ بھابی اس رات تم سر سے پاؤں تک وہ روپ تھیں جو بھگوان کو بھی بس میں کرے بہاری بھیا تو پھر بہاری تھے۔

وسنتی: میں نے بڑے دکھ سے کہا اپنا آپ ملبیدان کرنا بہت مشکل ہے۔

اور وسنتی نے بڑے دکھ سے کہا۔ بلیدان کرنا تو بہت لوگ جانتے ہیں پر سویکار کسی کسی کا ہی ہو پاتا ہے۔ تمہیں تو دیوتا ملا ہے کس فتنے کی جلنا ہے ؟

میں نے کہا جلنا یوں پوچھو جلنا کا ہے کی نہیں۔ تم دیکھتی نہیں ہو بہاری گھر میں آتے ہیں تو میری طرف دیکھتے ہی نہیں، تارا سے بات کر کے چلے جاتے ہیں اور پھر دو ایک دنوں میں سب لوگ چلے جائیں گے۔ تم بھی اور وہ بھی۔ اور پھر پیچھے، دم گھونٹنے والا چپ چاپ کا سناٹا ہو گا۔ اور اس سنتی رات کے بعد جب لمبی دوپہریں آئیں گی تو یہ سوچ کہ میں بہاری سے بات تک نہ کی کتنا دکھ دے گی۔ جانے پھر کب ملنا ہو اور مل سکیں بھی کہ نہیں ؟ وسنتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر

کہا یوں ناراض کیوں ہوتی ہو بھابی دو ایک دن تو تالا یہاں ہے ہی کچھ سوچوں گی۔ وہ بہاری کی اور میری آخری ملاقات تھی۔ بھگوان جانتا ہے اس کے بعد وہ صورت میری آنکھوں سے یوں چھپ گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سوچتی ہوں تو لگتا ہے ایک سپنا تھا میں نے سوتے میں ساری زندگی کی خوشیاں اور اپنے بھاگ کے سکھ بھوگ لئے کہ جب آنکھ کھلی ہے تو آج تک اندھیرا ہے۔ میں اس اندھیرے میں اکیلی ہوں اور وہ جو کہتا تھا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو مگر رات میں میری ہو اب کہیں نہیں ہے۔ میں اس سہاگ کی سیج پر اکیلی ہوں اور ہر آہٹ پر چونک کر دیکھتی ہوں کہ شاید وہ اب میرے قریب آئے مگر نہیں وہ چاپ قریب نہیں آتی۔ کوئی نہیں ہے یہ میں ہوں اور یہ اندھیرا ہے آگے اور پیچھے سرسراتا ہوا اور ہر گھڑی ڈستا ہوا اندھیرا۔

اس رات باغ میں نئی گھاس کی میٹھی باس اور پھولوں کی پاگل کر دینے والی تیز سوگند تھی۔ میں وسنتی کے بتائے ہوئے راہ پر ننگے پاؤں جا رہی تھی۔ اور آنے والی گھڑی کی بیہوشی مجھ پر ابھی سے چھا رہی تھی آکاش میں چاند ہلکے سفید بادلوں کے پردوں پر سے ابھرتا ڈوبتا جا رہا تھا آموں کے جھنڈ میں سے خوشبو نکل کر میرا سواگت کر رہی تھی اور سایوں کا اندھیرا مجھے اندھیرے کے بیچ کا پھیلا ہوا رنگ لگتا تھا ہوا ہولے ہولے سرسرا رہی تھی اور پتوں پر سے رینگتی لگتی تھی۔ چاندنی بڑی پھیکی تھی اور گھڑی گھڑی اوٹ میں ہو جاتی تھی۔ جیسے مجھے چھپ کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پتلا سا چاند کبھی درختوں کی ٹہنیوں میں اٹک جاتا اور کبھی ذرا سے پتے کے پیچھے گم ہو جاتا۔ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اندھیرا اور چاندنی۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں بہاری کو اس کے بعد کبھی نہیں دیکھوں گی تو شاید میں اس سے وہ سب کچھ کہتی جو میں اب ہر گھڑی جی میں دہراتی ہوں۔ تالاب کے کنارے گرے ہوئے درخت کے تنے پر ہم دونوں بیٹھے تھے اور دنیا ہمارے لئے کوئی پرانی کہانی تھی۔ وہ مجھ سے ان سب دنوں کی بیتا بی کی باتیں کہہ رہا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد ہم ایک دوسرے میں دو جھرنوں کی طرح مل جانا چاہتے تھے ہمارے سانس بے ترتیب اور ہمارے ہاتھ سن ہوئے جاتے تھے۔ میرے گھنیرے سیاہ بال ہم دونوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور پھر ہم

دونوں چُپ تھے۔ میں مندر میں گزاری اُس پہلی رات کی طرح آخری رات بھی پگھل کر اُس کے خون میں مل جانا چاہتی تھی۔ میرا اپنا وجود کہیں نہیں تھا۔ ہر طرف بانکے بہاری تھا۔ میرا دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا تھا اور میں اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی اسکے قدموں میں مرنا چاہتی تھی یہ بھرپور چاہت یہ خوشی جیسے اسکے بعد کچھ تمنا کرنے کو باقی نہ رہا ہو کچھ کہنے کو اور چنتا کرنے کو باقی نہ رہا ہو اگر اس گھڑی میرا دل ٹھہر جاتا رُک جاتا اور ہم دو بھونروں کی طرح تالاب کے کنارے گر جاتے تو بھی مجھے کوئی غم نہ تھا۔ مگر موت پریم سے شکست کھا جاتی ہے۔ جہاں پریم ہو وہاں موت کہاں گھس سکتی ہے۔ اور اس رات کے بعد آج تک تمنا کرنے اور کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔

جب تالاب کے دوسری طرف بہاری نے قدموں کی چاپ سنی جیسے سوکھے پتوں پر کوئی چل رہا ہو تو میں نے کہا بہاری تم اتنے دنوں بعد مجھے ملے ہو اگر ان چاپوں کو سننے کے لئے سہمے کھوتے رہے تو شاید ہمارے من کو کبھی شانتی نہ ہو گی۔

بہاری نے کہا تھا۔ چمپا اتنی خوشی میں بھی کیوں بھولتی ہو کہ دُنیا کا وار سخت ہوتا ہے۔ میں نے کہا میں تمہارے جیسے دیوتا کے سائے ہوں تمہارے بازو قلعے سے زیادہ مضبوط ہیں مجھے کسی شے کا ڈر نہیں کسی بات کی چنتا نہیں۔

اور پھر وہ امرت زہر بن گیا۔ وہ گھڑی گزر گئی اور اس کا سایہ اندھیکار بنکر آج تک میرے بھاگ کے لکھے کو چھپائے ہوئے ہے۔

ماں جب جانے لگی ہے تو اسنے مجھے کہا چمپا تجھے اپنے سہاگ اور گھر کی نہیں تو اسکی تو چنتا ہونے چاہئے جس کے لئے تو نے لاج شرم سب چھوڑ دی ہے۔ چمپا میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ دُنیا سے ڈرتے رہنا اچھا ہوتا ہے۔ بہت آگے اور اندھیرے میں بڑھنے والے جب ایک بار ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو سنبھل نہیں سکتے۔

میں نے ذرا غصے سے کہا "تم کیا کہتی ہو ماں میں نے ایسا کیا پاپ کیا ہے؟

ماں اپنے ہاتھ ملنے لگی اور بولی "چمپا اب تیری بربادی اور اجڑنے میں کوئی وقت باقی نہیں اری پاپن تجھے اس گھر پر بھی دیا نہیں آتی۔ میری کوکھ کو آگ لگ جاتی اور میں تجھے پیدا ہی نہ کرتی تو اچھا تھا۔ تجھے خیال تھا کہ باغ میں اس درخت کے تنے پر بیٹھے تجھے کسی نے

نہیں دیکھا۔"

"پرماں۔" اور ماں نے کہا بس میں اور زیادہ کیا سنوں گی۔ بھیا نے تجھے دیکھا ہے۔ ارے اُس کا کیا حال ہوا اُس کی خبر ہے۔

تب مجھے لگا میں نے بھیا کو دو تین دن سے کہیں نہیں دیکھا۔ وسنتی بھی چلی گئی تھی۔ بہاری اس سے اگلے دن ہی تارا اور بُوا کے ساتھ جا چکا تھا۔ پھر ماں بھی چلی گئی اور میں ڈرتی کانپتی پھول میں رہنے والی راجکماری کی طرح کسی روشنی کی راہ دیکھتی رہی کسی آس کا سہارا لینے کے لئے۔ جانے اب بہاری سے کب ملنا ہو۔ میرے دامن میں بندھے موتی کھل کر سب بکھر چکے تھے۔

۷

شیکھر اس دن دیوانوں کی طرح دالانوں میں گھومتا پھرتا تھا اور اپنے بال نوچتا تھا جس دن بُوا کے ہاں سے سویرے سویرے آدمی آیا ہے۔ میں گم سم بیٹھی تھی اور مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ دالان میں تیز دھوپ میں سے اٹھا کر جب باندیوں نے مجھے اندر کمرے میں لٹایا ہے اور ٹھنڈے پانی سے بھگو کر پنکھا جھلا ہے تو میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتی تھی سب چپکے چپکے رُستے ہوئے اور اداس تھے اور مجھے بھول چکا تھا کہ شیکھر سویرے سے جا چکا ہے اور بہاری کی گردن کسی نے تیز چھری سے کاٹ دی ہے وہ گردن جس پر سے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی وہ شان سے اونچی اٹھی ہوئی اور سر جو غرور سے نہیں یونہی دیوتاؤں کی طرح سیاہ بالوں کے تاج سے اتنا سندر لگتا تھا۔ اس سر کو انہوں نے الگ کر دیا تھا جو سر میرے کندھوں پر ٹکا رہتا تھا۔ میں دائیں بائیں دیکھتی اور کہتی "بہاری نہیں ہے" اور دیکھنے والی باندیاں افسوس سے کہتیں بہو کا دماغ چل گیا ہے۔

وسنتی جب شملہ کو آئی ہے تو اس کا رنگ یوں زرد تھا جیسے اسکے کندھوں پر کسی مری ہوئی عورت کا چہرہ لٹکا دیا گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی "بھابی پگلی بن کر کیا تم افسوس زیادہ کر سکتی ہو۔ تمہاری انہی باتوں نے تو بہاری بھیا کی جان لی ہے اور اب دنیا کو تماشا دکھا رہی ہو۔ تمہارا پریم گہرا نہیں ہے تم صرف پریم کا سکھ جانتی ہو۔ اس کی پیڑا سے واقف نہیں ہو۔ تم نے جس

شے کو چاہا ہے بل سے ضد سے پالیا ہے اس لئے تم نراش ہونا نہیں جانتیں "
میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی یہ وہی وسنتی تھی جو میرے سامنے بچی سے بڑی ہوئی تھی جو مجھے پدمنی کی طرح پیاری تھی اور جو مجھے پریم کرنے اور آس نراس کا سبق دے رہی تھی۔
میں نے کہا وسنتی تم غلط سوچتی ہو میں نے اتنے دنوں نراش اور دکھ کے ساتھ گزارے ہیں تم نہیں جانتیں۔
وسنتی نے اسی طرح کہا جب آگے بھی کوئی آس نہ ہو تو تم نراش ہونا جانو تو میں سمجھوں۔
دنوں کوئی خبر نہ آئی جس کو بھجوایا جانا وہیں کا ہو رہتا۔ پھر شیکھر نے پیغام بھیجا کہ بہاری کی حالت سدھر رہی ہے اور تھوڑی آس ہے شاید وہ تندرست ہو جائے اور چند مہینوں میں ٹھیک ہو جائے۔ وسنتی بھی اپنی سسرال جا چکی تھی گھر کے کاموں سے نمٹ کر میں ایسی راتوں میں جب تیسری چوتھی رات کا چاند باغ پر سے کھسکتا اور پتوں کی اوٹ میں چھپتا تالاب پر آتا تو اس گرے ہوئے درخت کے تنے پر جا بیٹھتی اور بس پانی میں جھانکتی رہتی ان گہرے سایوں کو دیکھتی اور بیٹھی رہتی یہاں تک کہ نرم ہوا چلنے لگتی اور چڑیاں ڈال ڈال پات پات چوں چوں کرتیں اور سویرے کی سرخی پورب میں سے ابھرتی۔
شیکھر واپس آگیا۔ بہاری کی حالت سنبھل گئی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ کہتا پنڈت نہیں اتنے سندر اور ہنس مکھ بہاری کا کون دشمن ہوسکتا ہے۔ اسنے اپنے زور کے بل پر بھی کسی کو نہیں دھتکارا۔ اور میں بھیا کا سوچتی جس کو میں نے مہینوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کی باتیں میرے کانوں میں اسی طرح سنائی دیتیں اور پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی رہتی۔
پھر سنا بہاری کے ٹھیک ہونے کی خوشی میں لوا نے اپنے گاؤں میں بہت بڑی پوجا کروائی ہے۔ ماں کے ہاتھ بھیا کا پیغام ملا کہ تمہارے وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اگر تم گئیں تو میں تمہیں بھی کاٹ کر رکھ دوں گا۔
عین اس دن جب ہم سب تیار تھے اور دروازے سے نکلنے والے تھے مجھے اپنا دل یوں بیٹھتا لگا جیسے بس ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکل ہی تو جائے گا۔

میری وجہ سے وسنتی بھی رک گئی شیکھر پدمنی کو لے کر چلا گیا۔

پھر ساری باتیں یوں تیز تیز ہوئیں جیسے آندھی چلنے لگے اور میں اُس تیز ہوا کے ساتھ اڑ کر آنکھ کھلی ہے تو یہاں پڑی تھی۔

وہ گھر مجھ سے چھٹ گیا جو میری آشا اور نراشا کا ساتھی تھا اور پدمنی جس کو میں نے کبھی گھوم کر نہ دیکھا تھا جو سدا میرے پیار کی بھوکی رہی تھی۔

وسنتی کہتی تھی "بھابی تم بھیا کی بات کو کیوں اتنا بڑا سمجھتی ہو۔ انہیں گھر آنے دو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔ آپ سے آپ ہر بات درست ہو جائے گی تم بس تھوڑے دنوں اور رہ سکو تو کیا تمہیں مجھ پر وشواس نہیں ہے۔ مجھے اس پر وشواس تھا مجھے شیکھر پر بھی وشواس تھا پر مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔

جانے میرے اور بہاری کے راز کو کتنے لوگ جانتے تھے؟

شیکھر میرا پجاری! اور اسنے اپنی مورتی کو اپنے ہاتھوں ہی توڑ دیا۔

اس کی طرح پدمنی کو بھی مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ میری صورت کو دیکھ لیتی تو پہروں دیکھتی رہتی۔ جب شیکھر کے گھر میں سوتیلی ماں کے ہاتھوں دکھ اٹھا اٹھا کر وہ مری ہے تو مجھے اسکی صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔

شمشان میں بیٹھی میں پاگلوں کی طرح اُس راکھ میں پدمنی کی وہ آنکھیں ڈھونڈتی رہی جن کی روشنی اس راکھ میں مل گئی۔ اپنے پاؤں چومنے والے شیکھر اپنے مرن جیون کے ساتھی اپنے پتی کو بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب چتا کو آگ دکھائی گئی ہے تو جو سفید بالوں اور سفید داڑھی والا بوڑھا رو رہا تھا اور اپنے ہاتھ مل رہا تھا وہ کوئی اور ہوگا۔ جانے کون ہوگا۔ پدمنی کے لئے جب میری آنکھ سے آنسو نہ نکلا تو اسپر رونے والا بھلا اور کون ہوتا۔

اور بھیا نے آج تک مجھ سے بات نہ کی۔

پھر سنا ایک سال بعد جب اُسکے زخم چھٹ گئے تھے اور وہ تارا پر جان دینے لگا تھا اپنے پچھلے پاپوں کا پرائشچت کرنے والا تھا بہاری اچانک مر گیا۔ یوں جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے کوئی نازک پھول شاخ سے نیچے آ رہے۔

میں اُس دن بھی نہیں روئی اور افسوس نہیں کیا۔ بھلا کوئی سپنے میں دیکھی صورتوں کے لئے روتا ہے۔

پر اس گھڑی سے مجھے اور بہت سی چیزوں کی طرح بھگوان کی دیا پر بھی وشواس نہیں ہے وہ ایک گھڑی دیتا ہے تو دوسرے لمحے چھین بھی لیتا ہے۔ پھر ایسے بھگوان سے کوئی کیا مانگے۔ اور یوں ادم کے اُس پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

نیا دور
کراچی
۳۱ — ۳۲
کہانی نمبر
سالانہ :- سولہ روپے
قیمت فی پرچہ :- تین روپے
شائع کردہ :- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

انتظار حسین

جمیلہ ہاشمی

"تم نے میری کہانی ترموروتی پڑھی؟"

"نہیں ابھی نہیں پڑھی۔"

"دوسری کہانیاں؟"

"چھری کے نیچے دم تو لینے دو۔ ابھی تو تم نے مجھے کتاب دی ہے۔ اب پڑھوں گا۔"

یہ ابھی پچھلے برس کی بات ہے جب جمیلہ ہاشمی نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ 'رنگ بھوم'
جو انھیں دنوں شایع ہوا تھا مجھے دیا تھا۔

دوسری ملاقات میں پھر وہی تقاضا "تم نے ترمورتی پڑھی؟"

"پڑھ رہا ہوں۔ یہ کہانی ابھی نہیں پڑھی ہے۔"

"میں نے ہندو کلچر کے رنگ کی کہانیاں لکھی ہیں۔ کیسی ہیں۔"

"پوری کتاب پڑھ لوں۔ پھر بات ہوگی۔"

تیسری ملاقات جب ہونے کو تھی تو میں نے جلدی جلدی وہ کہانی پڑھی۔ ملاقات
ہونے پر پھر وہی سوال اور میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ترمورتی پڑھ لی ہے۔"

"کیسی ہے۔"

"اچھی ہے۔"

جمیلہ اس دو لفظی داد سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ میں نے جمیلہ

سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کتاب کے بارے میں لکھوں گا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ جمیلہ نے بار بار ایک ہی کہانی کے بارے میں مجھ سے کیوں سوال کیا۔ کیوں اس کہانی کے بارے میں رائے معلوم کرنے اور سننے کے لیے اس کے یہاں اتنی بے چینی تھی۔ میں اس وقت اس کہانی کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا تو اپنے اس رویے کی تو میں وضاحت کر سکتا ہوں۔ اچھی کہانی مجھ سے فوراً کچھ نہیں کہتی۔ تھوڑا وقت گذرنے کے بعد جب وہ واپس میری یادداشت میں آتی ہے تو پھر اپنے تھوڑے تھوڑے معنی سمجھاتی ہے۔ تو چند مہینوں کے بعد جب مجھے اس کہانی کا خیال آیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کہانی تو جمیلہ کی دوسری کہانیوں سے مختلف قسم کی کہانی ہے۔

جب جمیلہ نے داد طلب لہجہ میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ دیکھو میں نے ہندو کلچر کے رنگ کی کہانیاں لکھی ہیں تو میں نے اس وقت اس بات کو سرسری لیا تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ مجھے یہ پتہ ہے کہ رومانی رنگ میں کوئی کہانی لکھنے والا ہندو تہذیب کی طرف جاتا ہے تو اس کی نیت کیا ہوتی ہے۔ وہ وہاں اپنی رومانیت کے لئے غذا حاصل کرنے کی نیت سے جاتا ہے۔ وافر مقدار میں غذا حاصل کی اور واپس آگیا۔ اسی مجموعہ میں اس رنگ کی جو دوسری کہانیاں ہیں ان میں ہندو تہذیب کے رنگوں سے یہی کام لیا گیا ہے۔ مگر اس کہانی میں جمیلہ اور رستے پر چل پڑی اور میں حیران ہوں کہ جمیلہ یہاں تو ہندو رسم و رواج کی رنگ بھری فضا سے گذر کر سیدھی دیومالا کی اقلیم میں داخل ہو گئی۔ اور کس کہانی پر جا کر اس کی نظر ٹھہری ہے اور پھر کس خوبی کے ساتھ اس نے آج کے تشکیک گزیدہ تعقل پسند ذہن کا دیومالا سے تصادم کرایا ہے اس تصادم نے کہانی کو عجب شکل دی ہے کہ وہ SUBLIME اور RIDICULOUS کی آنکھ مچولی بن گئی ہے اور کس طرح پوری کہانی میں ایک ہلکے ہلکے مزاح اور طنز کی کیفیت سرسرا رہی ہے۔ یہ رنگ جمیلہ کے یہاں پہلے کہاں دیکھنے میں آیا تھا۔

میں اس وقت اس کہانی کے متعلق بس اتنا ہی سوچ پایا تھا۔ اب جبکہ جمیلہ اس دنیا میں نہیں ہے اور اب جبکہ وہ اپنی کسی کہانی کے بارے میں مجھ سے پوچھنے نہیں آئے گی اور اب جبکہ اپنی کسی رائے کے سلسلہ میں مجھے اس کی ناراضگی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے تو میں اس

کے ناولوں، طویل مختصر افسانوں اور مختصر افسانوں کو اپنے حافظہ میں دہرانے کی کوشش کررہا ہوں، الٹ پلٹ کے دیکھ رہا ہوں، اس بی بی نے اس فن میں کیا کمایا ہے اور اس عمل سے گذرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر 'اترموتی' مجھے یاد آتی ہے اور اس مرتبہ وہ مجھے اس طرح پکڑلیتی ہے کہ میں چونک پڑتا ہوں۔ آخر جمیلہ نے کیا سوچ کر یہ کہانی لکھی۔ اس کے اندر کیا ہو رہا تھا کہ یہ کہانی ظہور میں آئی۔ کیا وہ شعوری طور پر موت کے مسئلہ سے دوچار تھی یا تحت الشعور کی سطح پر موت سے کچھ اشارے کنائے ہو رہے تھے کہ یہ کہانی لکھی گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہندو دیومالا کی ساوتری تک جمیلہ اپنے رومانی تخیل کی راہ سے نہیں پہنچی ہے۔ کوئی اور پراسرار اشارہ تھا جو اسے موت کے سائے میں ایک لمبی یاترا کرنے والی اس عورت تک لے گیا۔ ساوتری عجب عورت تھی۔ اس کم بخت نے کس جوان کو اپنے شوہر کے طور پر پسند کیا جس کے متعلق اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ سال کے اندر اندر مر جائے گا۔ ساوتری کس شدت سے اس آنے والے سنگین وقت کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ گھڑی آتی ہے تو وہ موت سے الجھ پڑتی ہے۔ یم دوت نے ستیہ دان کی روح قبض کرلی ہے اور اب وہ اپنے ڈیرے کی طرف جا رہا ہے۔ ساوتری سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ سمندروں، پہاڑوں، آسمانوں سے گذرتی ہوئی اندھیری بھید بھری راہوں پر ایک لمبی یاترا۔ یم دوت جھنجھلایا ہوا ہے کہ ایک عورت کس بے خوفی سے اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ آخر میں ہار کھا جاتا ہے اور ستیہ دان کی زندگی اسے واپس کرنی پڑ جاتی ہے۔

اس کہانی کو میں نے پہلے کتنی بار پڑھا تھا اور جب موت سے مقابلہ کی اس کہانی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو اسی قبیل کی ایک اور کہانی کا حوالہ دیتا چلوں۔ اپنشدوں میں بیان ہونے والی وہ کتھا جس میں ایک برہمن دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنا سارا مال و متاع بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس کا نوخیز بیٹا نشکت پوچھتا ہے کہ باپ میں بھی تو تیرا مال ہوں۔ مجھے تو نے کس دیوتا کو بھینٹ دیا ہے۔ باپ کے منھ سے بیساختہ نکلتا ہے کہ میں نے تجھے یم دوت کو بھینٹ دیا۔ نشکت فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یم دوت کے ڈیرے کی طرف چل پڑتا ہے۔ یم دوت سے کرنے کے لئے اس کے پاس سوال ہی سوال ہیں۔ یم دوت لاکھ پہلو بچاتا

ہے مگر جواب دینے پہ بالآخر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں نے ان کہانیوں کو پڑھا اور سوچا کہ قدیم ہند و بصیرت نے موت کے تجربے کو گرفت میں لانے کے لئے، اس کی تھاہ تک پہنچنے کے لئے اس کے ذریعہ زندگی کے بھید جاننے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ ایک دفعہ ایک عورت یم دوت کے گلے پڑ جاتی ہے۔ دوسری مرتبہ ایک نوجوان اسے بحث میں الجھا کر اس سے حکمت کے موتی رول لیتا ہے۔ میں نے کتنی بار سوچا کہ کیا ان میں سے میں کوئی اپنی کہانی نکال سکتا ہوں۔ لیکن ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ یہ کہانیاں بڑی ہیں، میں چھوٹا ہوں۔ پتہ نہیں جمیلہ ہاشمی کس عالم میں تھی کہ اس نے ساوتری کی کہانی سے اپنی کہانی نکال لی۔

جمیلہ ہاشمی کے یہاں آکر ساوتری کو ناستکوں کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ اس کے قول و فعل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگتا ہے۔ بے چاری ساوتری۔ ایک بنواری دادا ہیں جو ساوتری پوجا کی رسم ہی کو فضول جانتے ہیں کہ ان کی دانست میں کسی پوجا کسی برت سے ہونی کو نہیں ٹالا جا سکتا۔ پھر مونیک ہے جو سنیاس لینے کے شوق میں مغرب سے یہاں آئی ہوئی ہے مگر اپنی نئی تہذیب کا عطا کردہ تعقل اور تشکیک ساتھ لائی ہے۔ سو وہ ساوتری کتھا یکسوئی کے ساتھ نہیں سن سکتی۔ بیچ بیچ میں شک سر اٹھاتا ہے ۔ کوئی موت کی شکل دیکھ سکا ہے کیا ۔ کیسی راجکماری تھی، اکٹھے سو بیٹے مانگ لئے۔ بچوں کو سنبھالنا تو یوں ہی بہت تسکل ہو گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اچلا جھنجھلا اٹھتی ہے " مونیک کتھا سننے کا یہ طریقہ نہیں "۔

اچلا نے ٹھیک کہا۔ کتھا سننے کے کچھ آداب ہیں۔ یہاں جوتیاں باہر اتار کر آن پڑتا ہے۔ اچھا ہو کہ راضی برضا ہو کر اپنی تشکیک کو اتنے عرصے کے لئے معطل کر دیا جائے مگر مونیک اپنی تشکیک کو معطل کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ اچلا سے کہتی ہے " تم مجھ سے اس سلسلہ میں سوال کرنے کا حق نہ چھینو بھئی "۔

مگر کہانی کا اپنا ایک سحر ہے مونیک نے اپنی رضامندی سے تو اپنی تشکیک کو معطل نہیں کیا۔ بس کہانی کے سحر میں گم ہوتی چلی گئی۔ شروع میں اس نے شک ظاہر کیا تھا کہ " کیا ساوتری کتھا سچ ہے "۔ اور اب جب کہانی ختم ہوئی ہے تو اسے سب کچھ سچ نظر آ رہا ہے۔ مگر اس کے

اندر اب ایک اور سوال سر اٹھاتا ہے "ستیہ وان اور ساوتری اب بھی کہیں ہوں گے۔"

اچلا اس سوال پر کسی قدر حیران ہوتی ہے۔ "راست یگ ختم ہو گیا۔ یگ بیت گئے۔ صرف دیوتا امر ہوتے ہیں۔"

اور مونیک کہتی ہے: "وہ ایک بار موت کے سمندروں کو پار کر چکے تھے۔ واپس آچکے تھے۔ یم دیوتا کے ساتھ انھوں نے لمبی مسافت طے کر لی تھی۔ پھر انھیں مرنا نہیں چاہیئے تھا۔"

اچلا سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

"وہ کیوں امر نہیں ہوئے۔" مونیک کا سوال پھر سنائی دیا۔

اب اچلا اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مونیک کو سرزنش کر سکے کہ کتھا سننے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ وہ خود اس پیچ میں پڑ گئی ہے کہ جب انھوں نے موت کا سمندر پار کر لیا تھا تو وہ امر کیوں نہیں ہوئے۔ اور مونیک کہہ رہی ہے "اچلا، جب آدمی امر نہیں ہو سکتا۔ جب موت بار بار اسے چھو جاتی ہے تو پھر بچنے سے کیا ملے گا۔ تم کتھا سنا رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ وہ دونوں اب بھی ہوں گے۔ پر جب تم کہتی ہو کہ وہ نہیں تو چند دنوں کے لئے موت کو ٹالنے سے فائدہ۔ سب سے بڑی شکتی جب دھرم راج کی ہے تو یم پوری تک اس کا پیچھا کرنے سے بھی ہمیں کیا ملتا ہے۔ جسے بچا کر لاؤ، وہ لوٹ ہی تو جاتا ہے۔"

اچلا کے پاس مونیک کی اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کہتی ہے کہ اچھا صبح بنواری دادا سے پوچھیں گے۔ مگر صبح کو پتہ چلتا ہے کہ بنواری دادا تو سدھار گئے، اب کس سے پوچھا جائے۔ مونیک کے سوال کا جواب کون دے۔

وہ وقت گذر جاتا ہے۔ مونیک بھی چلی جاتی ہے۔ مگر بہت وقت بیت جانے پر بھی اچلا اس بات کو بھول نہیں پاتی۔ اسے بنواری دادا یاد آتے ہیں "جو کہا کرتے تھے کہ مرنے اور جینے کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ ہے، جو اس راستے کو پھلانگ کر اٹھا وہ بے کنارہ موت سے مکت جیون میں ہنسی خوشی داخل ہو گئے۔" اور پھر اسے مونیک یاد آتی ہے جو "جانے کہاں گھوم رہی ہوگی، جانے اسے کس شے کی کھوج تھی، کیا اس نے موت سے مکت ہونے کا گر سیکھ

لیا ہوگا۔" اور مجھے رہ رہ کر جمیلہ کا خیال آرہا ہے کہ جانے اسے کیا ہوا کہ اپنے رومانی انداز میں کہانیاں لکھتے لکھتے اور محبت کی کیفیتوں کو میٹھے لفظوں میں بیان کرتے کرتے موت کے تجربے کی اقلیم میں جانکلی اور ساوتری کے سہارے کتنی دور نکل گئی کہ اب جب میں نے اس کہانی کو پڑھا تو لگا کہ جمیلہ یم پوری کی طرف اڑی چلی جارہی ہے اور مجھے خیال آرہا ہے کہ کیا یہ کہانی لکھنے کی برکت سے اس کے لئے موت اتنی آسان ہوگئی کہ مرنے اور جینے کی بیچ کا فاصلہ اس کے لئے سچ مچ ایک قدم کا فاصلہ بن گیا۔

جمیلہ ہاشمی نے آخری فقرہ لکھا "جانے آدمی موت سے مکت ہونا کیوں چاہتا ہے، جانے کیوں۔" اور کہانی کو ختم کردیا۔ یہ سوال کس نے کیا ہے، افسانے کے مرکزی کردار اچلانے یا خود جمیلہ ہاشمی نے جس کسی نے بھی کیا ہو۔ جمیلہ ہاشمی کی کہانی یہاں آکر ختم ہوجاتی ہے۔ جمیلہ کی کہانیاں آگے ایک رومانی افسردگی پر ختم ہوا کرتی تھیں۔ اب کے ایک گمبھیر سوال پر ختم ہوئی ہے

اسی سے ملتا جلتا سوال نشکت نے یم دوت سے کیا تھا "جب آدمی مرجاتا ہے تو ایک شک پیدا ہوجاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب وہ نہیں رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں وہ ہے۔ اے یم دوت تو مجھے بتا کہ ان میں سے سچی بات کونسی ہے۔"

نشکت نے یم دوت سے کتنے سوال کئے اور ہر سوال کا جواب لے کر مانا اور جب وہ سب سوال کرچکا اور سب سوالوں کے جواب اسے مل چکے تو اس کے اندر کی نجاستیں دھل گئیں اور وہ موت سے مکت ہوگیا۔

مگر جمیلہ کی کہانی میں تشکیک نے اسے اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ موت سے مکت ہونے کا خیال ہی عبث نظر آتا ہے —— "جانے آدمی موت سے کیوں مکت ہونا چاہتا ہے۔ آخر کیوں۔"

عائشہ صدیقہ

میری ماں

ہم دونوں کا رشتہ ایک روایتی ماں بیٹی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ اُن دوستوں جیسا تھا جنھیں زمانے سے ایک دوسرے کی تلاش ہو اور پھر اسی کھوج میں وہ ایک دوسرے کو پالیں۔ ہماری زندگی کے دُکھ سُکھ سب سانجھے تھے۔ میں کہتی امی میں نے باہر پڑھنے کے لئے جانا ہے تو امی کہتیں۔ "نہیں بھئی تمہارے بغیر میں کیسے رہ سکتی ہوں" اور اگر کبھی امی۔ مجھے لاہور میں بوجہ چھوڑ کر گاؤں جاتیں تو میری یہی رٹ ہوتی امی جلدی واپس آجائیں، بس آپ آجائیں، کام ہوں یا نہ ہوں، آپ واپس آئیں اور امی کاموں کو مختصر کر کے واپس دوڑی چلی آتیں اور زندگی پھر سے مکمل اور بھرپور لگنے لگتی۔

شعور کی منزل میں آنے کے بعد تقریباً ہر انسان بھول جاتا ہے کہ زندگی اسے RUDE SHOCKS دینے کی اہلیت رکھتی ہے اور دیتی بھی ہے۔ جب ۱۰ر جنوری کی رات کو امی کو میو اسپتال کے اے دی ایچ وارڈ میں لے کر گئے تو مجھے سو فی صد یقین تھا کہ میری امّاں موت سے جیت کر میرے لئے آجائیں گی۔ وہ تو مجاہد تھیں۔ دلیر اور باہمت تھیں بھلا وہ کیسے موت سے ہارتیں مگر ایسا ہی ہوا اور میری شیرنی جیسی باہمت، بہادر ماں جس نے زندگی کی اتنی کٹھنائیوں کا اتنے حوصلے اور جرأت مندی سے ہمیشہ مقابلہ کیا تھا موت سے ہار گئی۔

کیا ایسا بھی ممکن تھا۔ میری ماں ایک بلند حوصلہ خاتون تھیں IN SHORT SHE WAS A BORN FIGHTER اور ایک فائٹر میں سروائیو

کرنے اور حالات سے مقابلہ کرنے کی بے انتہا صلاحیت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز یعنی کہ ODDS کا مقابلہ کرتی رہیں۔ آخری دم تک۔

میرے بابا جن کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ اس کے بعد امی کی زندگی کو ایک اچانک فوری تبدیلی کے عمل سے گزرنا پڑا۔ انہیں ایک 'بیوی' جسے باہر کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں، چھوڑ کر اچانک ایک 'مرد' ایک ہیڈ آف دی فیملی بننا پڑا اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے FEUDAL SYSTEM کے خلاف لڑنے کے لئے سینہ سپر ہو گئیں جو کہ ظالمانہ اور جنونی ہے۔

ادیبوں اور لکھنے والوں کی برادری کو یہ IDEOLOGICAL شکایت تھی کہ جمیلہ ہاشمی ایک زمیندارنی ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ جمیلہ ہاشمی اس بیہودہ نظام کا ایک شکار تھی جس نے آخر ان کی جان لے لی۔ ایک ایسا نظام جہاں چادر اور چار دیواری کے تحفظ، امن اور انصاف اور اس قسم کے اور نعرے سب بے کار گئے ہیں۔ جہاں سب کچھ بکتا ہے کمزور کی جان چلی جائے۔ لیکن میری اماں نے ان تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

آتشِ رفتہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

"دادی اگر دکھ کے سامنے چٹان نہ بنتی تو مٹی کے تودے کی طرح ڈھے جاتی۔ دھیان پور والوں کی سرداری بیٹی کے دشمنوں اور رشتے داروں کے سامنے جس شان اور جس دل گردے کا ثبوت دیا اس پر سارے اپنے بیگانے حیران رہ گئے۔ دم دم مہر سنگھ کے گھر کی کہاریاں اور چمارنیں گلی سے گزرتیں۔ شاید بین کرنے کی آواز آئے شاید سردارنی کرتار کور انوپ سنگھ کی موت پر آنسو پی جانے والی اب بیٹے کی موت کی خبر سن کر پلو پھیلا پھیلا کر روئے اور دشمنوں کو یہ دعائیں دے۔ چوپال کی بھیڑ بھاڑ میں بیٹھا سردار مہر سنگھ کہتا بلے بلے بھئی عورت ہے پر مردوں سے بھی زیادہ حوصلے والی۔ دھیان پور والے ہی ایسی شیرنی پیدا کر سکتے ہیں۔"

اور میری ماں جب اس دنیا کے جھمیلے چھوڑ چھاڑ کر دنیا سے چلی گئی تو ہمارے گاؤں خانقاہ شریف جہاں وہ بیاہ کر گئی تھیں اور غیر تھیں وہاں کے لوگ آنسو بہا رہے تھے اور کہتے تھے آج خانقاہ کی شیرنی، اس کی شہنشاہ، اس کا مان سب رخصت ہو گیا ہے۔ دشمنوں کی ایک پلٹن، جو مردوں پر مشتمل تھی، اُس کا تن تنہا مقابلہ کرتے آخر میری ماں تھک کر چلی گئی۔ لیکن مجھے تو اپنے دشمنوں سے نہیں اس نظام، اس سسٹم اور اس معاشرے سے گلہ ہے، جو اندر سے گلا سڑا ہوا ہے۔ جو امن اور انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے انسانی جان بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لڑتے لڑتے آخر جری بہادر بھی بے بس ہو کر چلے جاتے ہیں۔ نہ جانے ایسا کیوں ہے۔ کیا اس معاشرے کو اچھے لوگوں کی قدر نہیں۔ اچھے اور جینوئن (GENUINE) انسان جو کہ اپنی کنوکشنز (CONVICTIONS) پر ڈٹے رہیں چاہے زندگی کا میدان ہو یا ادب کا۔

وہ نہ صرف ایک GENUINE انسان بلکہ ایک جینوئن رائٹر (GENUINE WRITER) بھی تھیں ایک ایسا WRITER جو کہ P R کے بکھیڑے سے آزاد صرف اپنے کام اور انتھک محنت کا محتاج ہو۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک خط میں امی کو لکھا تھا کہ:

"جب سماج میں MEDIOCRES اور HYPOCRATES اور بر خود غلط قسم کے فنکاروں کا تسلط ہو جائے تو تم جیسے لوگوں کو نہایت سنجیدگی سے اپنے معیار اور CREATIVITY کو برقرار رکھنے اور جلا دینے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔"

مجھے فخر ہے کہ میری ماں کو خوشامد اور فریب کے بجائے محنت کے شکل فن پر دسترس حاصل تھی۔ وہ ہر SUBJECT پر سالوں RESEARCH کرتیں سقوطِ ڈھاکہ اور اسپین کے تناظر میں لکھے جانے والے دو ناول جنہیں وہ مکمل نہ کر سکیں اس پر وہ آٹھ دس سال کام کرتی رہیں۔ وہ لکھتیں تو اپنی تخلیقی آسودگی، (CREATIVE SATISFACTION) کی خاطر۔

ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ انر سیلف (INNER SELF) کی سرد لڑائی

(SURVIVAL) کا ہوتا تھا، جو کبھی اپنے آپ سے چھپ نہیں سکتا۔ آپ کا اندر کا اصل اور سچا انسان اور شاید ان کی زندگی کے مقصد کی غمازی یہ دعا کرتی ہے جو انہوں نے اپنے آخری دنوں میں لکھی تھی اور جس کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی ہوں۔

" اے خدا ہم تجھ سے آزادی اور علم اور انصاف اور عزت کے سوالی ہیں۔
ہماری آرزوئیں پوری کر۔
ہم کڑے وقت کے ہاتھوں اسیر ہیں،
جہالت اور ذلّت میں گھرے ہیں۔
ہم پشیمان اور خستہ حال ہیں
اور ظلم کی قربان گاہوں پر چڑھائے جاتے ہیں۔
ذلتوں کے مارے لوگ۔
ہمیں زندگی کی کرن دے
ہم میں صالح رہنما پیدا کر
اے خدا ہمارے بڑوں کو احساسِ ذمہ داری دے۔
عوام کو علم، اعتقاد اور یقین کی روشنی عطا کر
اے خدا موت اور بیچارگی کے درمیان خونِ ناحق سے محبت کی کھیتی اُگے اور اے چمن تو آباد رہے تاکہ تیری آبیاری کرنے والے تجھے سنوارتے رہیں۔ تجھ سے خوشی حاصل کریں تجھے تعمیر کرتے رہیں۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی

تھی جن سے گفتگو....

۷ار نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہونے والی جمیلہ ہاشمی ۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پاگئیں۔ یہ سب کچھ یوں اچانک ہوا کہ قضا و قدر کی اس سفاکی پر یقین نہیں آتا۔ جیسے مردانہ ہو چیل جھپٹا ہو۔ چیل آئی اور زندگی کے ہاتھوں سے، جھپٹا مار کر، جمیلہ ہاشمی کو ابدی فضاؤں میں اڑا کرلے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ کہانی کا نام تھا "دو خط"۔ پڑھی تو اچھی لگی اس کے بعد اور کئی کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی میں شوق سے پڑھتا۔

۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لئے تیار تھا۔ انھیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا۔ اس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دارالحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسم قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا۔ ادیبوں کے اس کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین حیدر کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لاکر انہیں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جائے۔ اُس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ ریل ہی وہ تیز رفتار سواری تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کا مزا اور اخبارات میں بیان چھپوانے کا چسکہ ابھی نہیں پڑا تھا اور تعلقاتِ عامہ کے دفاتر بھی نہیں کھلے تھے۔ اُس زمانے کا ادیب آج

کے ادیب کے مقابلے میں یقیناً پسماندہ تھا۔ وہ زیادہ پڑھتا تھا اور زیادہ بحث کرتا تھا اور حیات و
کائنات، سماج اور زندگی کے مسائل پر ایسے غور کرتا تھا جیسے یہ اس کے اپنے مسائل ہوں اور
انہیں سلجھانا اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہو۔ میں اور عینی بیگم (قرۃ العین حیدر کو ہم سب اسی
نام سے پکارتے تھے) اسٹیشن گئے اور چند ادیبوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچا دیا۔ انھیں ادیبوں
میں سفید گرم چادر لپیٹے ایک صحت مند نوجوان سی لڑکی بھی تھی۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ
یہ وہی خاتون ہیں جن کے افسانے میں نے "لیل و نہار" میں پڑھے تھے۔ نام، جس نے آج
ساری اردو دنیا میں مسلسل اور اچھا لکھنے سے اعتبار کا درجہ پا لیا ہے، جمیلہ ہاشمی تھا، اسے
نام کی مناسبت کہیئے یا تذکیر و تانیث کی مطابقت۔ اس دن سے مرنے کے دن تک، دوستی و
خلوص کا رشتہ ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہو کر قائم رہا۔ آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے
یہ رشتہ سدا سے تھا اور سدا رہے گا۔ جمیلہ ہاشمی کا نام نیا دور کراچی کی مجلسِ ادارت کی آج تک
زینت ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جمیلہ ہاشمی ۸ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو میری بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے
کراچی آئی تھیں اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی جب
وہ شادی کی تقریبات سے نمٹ کر اپنی بیٹی عاشی کے ساتھ اپنے گاؤں خانقاہ شریف جا رہی
تھیں۔ ان دس دنوں میں وہ خوش و خرم رہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ گانے بجانے میں شریک
ہوئیں۔ مہندی میں آ گئیں۔ ولیمے میں شرکت کی۔ پرہیز بھی کیا۔ بدپرہیزی بھی۔ پرہیز میری مروت
میں اور بدپرہیزی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر۔ میں شاید واحد آدمی تھا جس کا وہ لحاظ کرتی تھیں۔
ایسا لحاظ جیسا بہنیں بھائیوں کا کرتی ہیں۔ وہ ذیابیطس کی مریض تھیں۔ میٹھا کھا رہی ہوتیں تو مجھے
دیکھ کر پلیٹ دور کر دیتیں، جس دن بدپرہیزی کا ارادہ ہوتا اور نیت ڈانواڈول ہوتی تو میرے
ساتھ کھانا نہ کھاتیں۔ جمیل صاحب! میں نے ناشتہ دیر سے کیا ہے۔ میں بعد میں ٹھہر کر
کھاؤں گی۔ جب لاہور یا خانقاہ شریف سے آتیں تو میرے سب بہن بھائیوں سے ملتیں۔
میری بیوی کی تو ایسی گرویدہ تھیں کہ تعریف کرتے کرتے زبان سوکھ جاتی۔ اپنی بیماری کا کبھی
ذکر نہ کرتیں۔ جمیلہ بی کیسی ہیں آپ۔ میں پوچھتا۔ اچھی ہوں جمیل صاحب۔ نیا ناول شروع

کر دیا ہے۔ موضوع فوراً بدل جاتا اور مسلم اسپین کی تاریخ پارینہ کا قصہ چھڑ جاتا جس پر وہ اپنا
نیا ناول لکھنے کی تیاری گزشتہ دو سال سے کر رہی تھیں۔ جمیل صاحب! یہ ناول آپ کو پسند
آئے گا اور اس بار آپ مجھ سے ضرور کہیں گے جمیلہ بی! یہ وہ تحریر ہے جس کا مجھے انتظار تھا
میں بھی جمیلہ بی سے بہت توقعات رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایسے ناول یا افسانے لکھیں کہ
زندگی ہی میں کلاسیک بن جائیں۔ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں میں اعتماد سے کہہ
سکتا ہوں کہ جمیلہ ہاشمی نے اردو ادب کو ایسی کہانیاں، ناولٹ اور ناول دیئے ہیں کہ ان کا
نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آتش رفتہ، روہی اور دشتِ سوس وہ ادب
پارے ہیں جو آنے والے زمانوں میں بھی تازہ و زندہ رہیں گے۔

۱۹۷۹ء میں میری بیوی اور جمیلہ ہاشمی نے حج کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ میں اور میری
بیوی کراچی سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور جمیلہ ہاشمی اور ان کے میاں سردار احمد
اویسی لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور ہم سب ۱۸ اکتوبر کو معلم کے ہاں
ملیں گے۔ ۱۸ اکتوبر کو ہم دونوں سارے دن ان کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہیں آئے۔
تین چار دن بعد کسی نے کراچی کا اخبار "جنگ" لا کر دیا تو ایک خبر پر میری نظر جمی اور میں سناٹے میں
رہ گیا۔ میاں سردار احمد اویسی اُس وقت وفات پا گئے جب اُن کا جہاز جدہ کے ہوائی اڈے
پر اتر رہا تھا۔ ان کی میت کراچی واپس لائی گئی۔ جمیلہ ہاشمی اور ان کی اکلوتی بیٹی عاشی ساتھ
تھے۔ سردار احمد ہیرا آدمی تھے۔ سیدھے سادے، شریف النفس اور وضع دار۔ جمیلہ ہاشمی کا
ایسا خیال رکھتے جیسے مالی تازہ گلاب کا رکھتا ہے۔ ساری ذمہ داری، گھر کی باہر کی، خود اٹھاتے
اور جمیلہ کو لکھنے پڑھنے کے لئے تازہ دم رکھتے، جو وہ کہتیں وہ کرتے۔ عاشی کو ہر دم اپنے ساتھ
رکھتے، جو اس کے مُنہ سے نکلتا پورا کرتے۔ ناز و نعم میں پلی یہ بچی اب بن باپ کے رہ گئی تھی اور
جمیلہ بھی جائداد کے جھگڑوں اور مقدموں سے نمٹنے کے لئے اکیلی رہ گئی تھیں جس پامردی
سے انہوں نے زندگی کے جھمیلوں کا مقابلہ کیا جمیلہ کی زندگی کا وہ نیا رُخ سامنے آیا جو اب
تک چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے بیٹی کے ساتھ مل کر زمینوں اور جائداد باغ کے انتظام کو ایسے سلیقے
سے چلایا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے باپ کی لاش عاشی اپنے گاؤں لے کر گئی تھی اور ۱۱ رجنوری ۱۹۸۸

وہ اپنی ماں کی لاش اپنے گاؤں لے کر گئی تاکہ آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دے۔ مصحفی نے کہا تھا ؎

کیا تماشا نظر آتا ہے انہیں، حیراں ہوں
یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں

۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء — میں اسلام آباد میں تھا کہ کراچی سے فون آیا۔ جمیلہ ہاشمی بہت بیمار ہیں اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کل رات سے داخل ہیں۔ میں نے لاہور میں فون کیا۔ عاشی نے اٹھایا وہ رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امی کی طبیعت بہت خراب ہے، انکل میں کیا کروں۔ میں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی اور کہا میں ابھی دوبارہ فون کرتا ہوں۔ کشور ناہید کو فون کیا۔ وہ نہیں ملیں۔ سائرہ ہاشمی کے گھر فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملیں۔ انتظار حسین کو فون کیا وہ بھی نہیں ملے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج لاہور خالی ہو گیا ہے۔ دوبارہ عاشی کو فون کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے بہنوئی یعقوب خان صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک طبیعت خراب ہوئی، فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو بلڈ پریشر کی مشین خط مستقیم بنا رہی تھی۔ خون میں شکر کی سطح ۳۹۶ ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے دماغ متاثر ہو گیا تھا۔ رات سے لے کر دوسرے دن ایک بجے تک انہیں زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی کوششیں مسیحائے لاہور کرتے رہے۔ جب سانس کا دھاگا ٹوٹنے لگتا تو وہ سانس بحال کرنے اور زندہ رکھنے کے لئے پسلیوں اور سینے کو دباتے۔ بجلی کے جھٹکے دیتے۔ اس عمل سے پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ اس نزاس کی کیفیت سے باہر نکلے اور ایک بج کر تین منٹ پر اعلان کیا کہ مریض نے دم توڑ دیا ہے اور وہاں چلا گیا ہے۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے پوچھا عاشی کہاں ہے؟ وہ دھاڑے مار کر رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ میں نے مقدور بھر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا میں جلد پہنچتا ہوں۔ اس وقت جمیلہ ہاشمی کی میت ہسپتال میں تھی۔ گھر نہیں آئی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور پہنچنے کے انتظامات کیے اور ساڑھے تین بجے کے قریب پھر فون کیا۔ عاشی فون پر تھی۔ اب اس کے آنسو سوکھ

چکے تھے اور سارا غم دل میں اتر گیا تھا۔ انکل میں امی کی تدفین کہاں کروں۔" بیٹا" ! میں نے کہا" اپنے گاؤں میں۔ میں انشاء اللہ ۴ بجے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں۔ انکل تو پھر ہم میت کو ایک گھنٹے میں خانقاہ شریف لے جائیں گے۔ میں نے پھر تسلی تشفی کی باتیں کیں اور فون رکھ دیا۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ اختر جمال کا فون آیا۔ بھائی! میں نے بہن سے بات کی ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ خانقاہ شریف چلوں گی۔ اور جنوری کو ہم تینوں اسلام آباد سے لاہور، لاہور سے ملتان اور ملتان سے گاڑی میں خانقاہ شریف پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے قبرستان پہنچے تو جمیلہ ہاشمی کی قبر پر حافظ صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ مہاوٹ کی ہوا تیر کی طرح جسم میں پیوست ہوگئی۔ ہوا سرد اور تیز ہو تو آنسو بھی آجاتے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور ہوا کے رُخ کی طرف پیٹھ کرلی۔ فاتحہ پڑھی اور جمیلہ ہاشمی کے باغ میں آگیا جہاں گلاب کے بے شمار پودے دم سادھے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ کشور ناہید اور نثار عزیز بٹ تصویر غم بنی ساکت صامت سر جھکائے بیٹھی تھیں اور مصحفی مجھ سے کہہ رہے تھے۔

تھی جن سے گفتگو ہمیں، وہ یار مر گئے

جنسِ سخن کے اپنی خریدار مر گئے۔

سہ ماہی
نیا دور
کراچی
شمارہ نمبر
۸۳-۸۴
خاص نمبر
قیمت: ساٹھ روپے
شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی

جمیلہ ہاشمی

ناستک

ماں مندر سے ابھی تک نہیں لوٹی۔ ڈپے کی طرف جانے والے راہ پہ بنے گرجا کا گھنٹہ بنا کے تھک رہا تھا۔ شام کی نیلی دھند بادلوں میں کھو گئی ہے۔ نیچے وادی کے گھروں میں جلتے دیوں کی روشنیاں دھند سے یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے برکھا کے دنوں میں کھیتوں پر جگنوؤں کی براتیں اتری ہوں۔ سامنے گھر کے پچھواڑے درخت کی شاخوں میں کوئی کوا رہ رہ کر یوں چیخ اٹھتا ہے جیسے درد سے بے چین ہو۔

اُجاڑ سڑک پر اکا دُکا چلنے والوں کے قدموں کی چاپ درختوں تلے گونجتی ہے۔ بالکنی میں کھڑی میں دھند سے پار دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اور سردی ہوا کی لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی میری ہڈیوں کے گودے کو جما رہی ہے۔

رات چپ چاپ اور اداس ہے اسپر جانے کیوں تمہارا جگر سوئے ہوئے چلتا بند بازار کا چکر لگا رہا ہے۔ روز تو سڑک کے نکڑ پہ سے گذر کر مندر کی طرف ندی میں پتھروں کو جوڑ کر بنائے ہوئے پل کے اُس پار چلا جاتا ہے جب ماں آتے میں وہاں سے گزرتی ہے تو وہ پھاٹک پر جھک کر اسے نمسکار کرتا ہے۔ پر نہ تو اُسے ماں کا نام ہی معلوم ہے اور نہ ہی وہ کبھی پوجا کے لئے مندر میں جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ ناستک ہے۔

سیتا کہا کرتی تھی۔ میں بھی ناستک ہوں اور تمہارا جگر بھی ناستک ہے اور یہی ہمارا سمبندھ ہے کیسے بیت جاتا ہے۔

تمہارا جگر کا سونگا ہے اس کے ہاتھ میں ہمیشہ رہنے والی چھڑی بھی نہیں۔ اندھیرے کو اور گہرا کرتی بتیوں کی روشنی میں وہ رک کر اِدھر اُدھر یوں دیکھتا ہے جیسے کچھ کھوج رہا ہے۔

جانے وہ کیسے ڈھونڈتا ہے؟

سیتا لگتا ہے کبھی تھی ہی نہیں وہ نہیں ہے پر کچھ بھی تو نہیں بدلا آدمی کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ اور جب وہ زندہ تھی تو زندگی کا سارا رنگ گیتوں کا رس اور پیار کی نرمی اسی کے دم سے تھی۔ اوپر جاتی سڑک پر کسی موٹر کا ہارن بجا ہے۔ بادل کھلی کھڑکی میں سے دھیرے دھیرے کمرے میں گھس آئے ہیں۔ تیرتے ہوئے نیچے وادی میں اتر رہے ہیں۔ بکھر رہے ہیں، چکروں میں گھوم رہے ہیں۔ دھند لکے میں گھر کی طرف آنے والی راہ پر کسی کے تھکے ہوئے بھاری قدموں کی چاپ ہے۔ یہ ماں تو نہیں ہے۔ ماں تو یوں چلتی ہے جیسے زمین پر اس کے پاؤں پڑ ہی نہ رہے ہوں۔ تیز ہوا درختوں میں سے سائیں سائیں کرتی گزر رہی ہے غصہ ور دیوی کی طرح۔

کوئی کواڑ دھڑ دھڑا رہا ہے۔

کون ہے میں بہت سہم کر پوچھتی ہوں۔

ٹھکرائیں گھر پر ہیں آواز تھکی ہوئی بوڑھی اور اجنبی ہے۔

نہیں ہیں میں چیخ کر کہتی ہوں۔

میں ٹہیں مہاراجکر ہوں۔

اوہ سمجھ میں نہیں آتا میں کواڑ کیوں کر کھولوں۔

تم سیتا کی سہیلی ہونا۔ میں سر ہلا دیتی ہوں۔ مجھ سے بات نہیں ہو پاتی۔

ریڈیو پر ناچ کی دھن بج رہی ہے۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی ہیں۔ چھت پر بوندیں تال دے رہی ہیں۔ دیواروں پر پھولوں کی تصویریں سوگندھ پھیلاتی لگتی ہیں۔ مہاراجکر کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ وہ ننگے پاؤں قالین پر بیٹھا اپنے بڑے بڑے ہاتھ پھیلا کر آگ تاپنے لگا ہے۔ شعلے کپکپا رہے ہیں۔ اسکے سفید سر پر پڑی بوندوں میں لپکتے اور کانپتے جیسے بادلوں میں آکاش کو چھونے والی پتنگ کے رنگ ہوں۔

ماں کھلے دروازے میں حیرت سے کھڑی مہاراجکر کو دیکھ رہی ہے جس نے اُسے نمسکار کیا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اسی پھاٹک پر جھکا کھڑا ہے جس میں سے گزر کر ماں مندر سے لوٹتے سمے گزرتی ہے

ماں یہ ڈاکٹر مہاراجکر ہیں۔ میں انہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ سیتا بھی انہیں جانتی تھی۔

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اُسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے مہاراجکر پاگل ہو۔

پانی بہت دور سے پڑنے لگا ہے۔

میرے پاس مہاراجکر کی سفارش کے لئے اور کوئی بات نہیں۔ میں اس کے لئے جو بھی سنا تھا سیتا سے سنا تھا۔ سیتا کوئی دو سال پہلے ہمارے اسکول میں کلکتے سے آئی تھی جہاں وہ کسی کانونٹ میں یا جانے کہاں پڑھتی تھی۔ میں نے تو آج تک کوئی بڑا شہر نہیں دیکھا۔ میں یہاں سے بہت کم باہر گئی ہوں مجھے کیا معلوم کلکتہ بڑا شہر ہے۔

ہم سب سے نکلتے قد کی بہت بڑھیا کپڑے پہنے ٹھاٹھ سے چلتی وہ پہلے پہل ہمیں کوئی مہارانی سی لگتی۔ جماعت میں اس کا جی ذرا نہ لگتا۔ استانیوں کو اس کی باتوں کا جواب نہ سوجھتا اور وہ پچھلے ڈیسک پر بیٹھی پنسل سے کاغذ پر لکیریں بناتی رہتی۔ جب گھنٹی بجتی تو بہت بیزاری سے اوپر دیکھتی۔ جماعت میں اگر اس سے کچھ پوچھا جاتا تو انگریزی میں جواب دیتی۔ سب لڑکیاں اس سے دور دور رہتیں۔ جہاں سے وہ گزرتی ایک طرف ہو جاتیں اور پیچھے سے اسے چپ چاپ دیکھتی رہتیں۔ وہ کبھی آتی اور کبھی دنوں غائب رہتی۔

ایک بار آئی تو چہرہ اترا ہوا بہت ہولے چلتی ہوئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

میں نے کہا سیتا دیوی اتنے دنوں کہاں گم تھیں۔

جماعت میں اس کی جگہ میری جگہ کے برابر تھی۔

کہنے لگی میرا جی یہاں اسکول میں نہیں لگتا۔ میں نے بابا کو بہت کہا ہے، ضد کی ہے کہ مجھے واپس کلکتہ بھیج دیں مگر وہ بھی بہت ضدی ہیں نہیں مانتے۔ وہ اب میرے ناتے اپنا گھر بسانے کی فکر میں ہیں اکیلے میں اب انہیں میرے بنا اچھا نہیں لگتا نا۔ اور اسی لئے مجھے اس جیل خانے میں ضرور رہنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ ہمارا اسکول بہت اچھا ہے مگر تم کو اپنی انگریزی کو بھلانا ہوگا۔ یہاں بہت اچھی لڑکیاں ہیں رونق ہے سادگی ہے اور پھر ہمارے یہاں بہت عمدہ ڈرامے ہوتے ہیں۔ استانی درگا کی بیٹی کرشنا بہت اچھا ناچتی ہے اور تم بھی تو یوں چلتی ہو جیسے ابھی ناچنے لگو گی۔ کسی ڈرامہ

میں حصہ لو پھر دیکھو کتنی لڑکیاں تمہاری سہیلیاں بن جائیں گی۔

اسنے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس دن سے ہم ساتھ ساتھ رہنے لگیں۔

اب اس کا دل کتابوں میں تو نہیں مگر جماعت میں ضرور لگنے لگا تھا۔ چیلوں کے اسٹیجوں کے اسکیچ بنانے میں بھی شریک ہو گئی۔ کھیلوں اور ڈراموں میں وہ بہت تیز تھی۔ پڑھنے کا کام اُسکے بس کا نہ تھا اور وہ پڑھتی بھی کیا، ہم لوگ تو اسکے سامنے بچے تھے۔ اُسے اتنی ڈھیروں باتیں پتہ تھیں اُسنے گھوم کر اتنی دنیا دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے کوئی ایسی بات نہیں جو اُسے معلوم نہ ہوگی۔

استانیاں اس سے گھبراتی تھیں وہ یونہی بحث کرنے لگتی تھی۔

استانی درگا نے پڑھاتے میں ایک بار کہا "بھگوان جو چاہے سو کرتا ہے اسی کے لئے سب کچھ ہوتا ہے آدمی کے اپنے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں"

سیتا نے پچھلی قطار میں بیٹھے بیٹھے زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگی "استانی جی بھگوان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ تو پھر اسکے کئے کیسے سب کچھ ہونے لگا۔ آدمی نے اپنی تسلی کے لئے یہ ساری باتیں گھڑلی ہیں ورنہ بھگوان کہیں ہے ہی نہیں"

استانی نے کہا "سیتا اگر بھگوان نہ ہوتا اور وہ نہ چاہتا تو تم اس وقت اپنے انگریزی اسکول میں بیٹھی ہوتیں۔

میں نے سوچا تھا سیتا کو چپ کرانے کے لئے یہ بات کافی ہوگی۔

مگر اسنے اسی لاپرواہی سے جواب دیا "میں نے آپ سب کچھ چاہا تھا یا میرے بابا نے چاہا تھا بھلا بھگوان تیسرا کون ہے جسکو ہماری مرضی کے بنا ہمارے کاموں میں دخل دینے کا ادھیکار ہو گیا۔

استانی بڑی گیانی دھرماتما دھوا عورت تھیں اور ان کا سہارا سوائے اس سوچ کے کچھ نہیں تھا کہ "بھگوان کی لیلا اپرم پار ہے" سیتا کی بات سنکر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا کہ اگر اسے ایسی باتیں کرنی ہیں تو جماعت میں نہ کیا کرے۔

اس دن سے اسے کھلی چھٹی ہو گئی۔ اسکول کے پچھواڑے خوبانیوں، آلوچوں اور سیب کے درختوں کا باغ تھا اور تالاب میں پانی کسی چشمے سے آتا تھا۔ مالی نے بہت محنت کر کے

پھولوں نے اسے چاروں طرف سے یوں ڈھانپ دیا تھا کہ دو آدمیوں کے بیٹھنے کی ایک جگہ ہی باقی رہ گئی تھی۔ ہم دونوں وہاں چلی جاتیں وہ انگریزی کی کہانیاں پڑھتی اور میں پنسل کے ادھورے اسکیچ پورے کرتی۔ بیچ بیچ میں ہم باتیں بھی کرتے جاتے۔

جب استانی درگا نے مجھے بلا کر ڈانٹا ہے اور سنیتا کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے سے منع کیا ہے تو تب مجھے پتہ چلا کہ وہ تو سارے ٹولے میں بدنام تھی۔ اسکول سے اُسے اس لئے نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ اس کا باپ اپر ٹولے کا رئیس آدمی تھا اور ہر سال اسکول کو بہت بڑی رقم دیا کرتا تھا اور آس پاس کے علاقے میں بڑا اہم دل مشہور تھا۔

پھر اور لڑکیوں سے سُنا کہ لوگ سنیتا کے لئے بہت بُری بُری باتیں کہتے ہیں۔ اس کی چال اس کی سندرتا اس کی موہنی سب ہی تو اعتراض کئے جانے کے قابل باتیں تھیں ٹولے میں ہی کیا اور کہیں بھی کون اس کا پاسنگ تھا۔

میری اور اسکی سنگت کی خبر ماں تک بھی پہنچی۔

ماں بہت نرم مزاج کی اور پیاری ہے اسنے مجھے یہ نہیں کہا کہ تم سنیتا سے نہیں بولو۔ کہنے لگی بیٹی لوگوں کا کیا ہے بُری باتیں کہنے میں بھگوان سے ذرا نہیں ڈرتے یوں مجھے تو سنیتا بہت بھلی لگتی ہے۔ کتنی سندر ہے۔ ہاں ذرا بنا جھجک کے چلتی ہے نا۔ بس اسی لئے لوگ اسکے پیچھے ہو گئے ہیں۔ دنیا میں جس نے بھی دل کی بات کہہ دی۔ اور بنا ڈرے اپنی سوچ کو آواز بنا لیا اس کا یہاں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پر دیکھو تم اپنی پڑھائی میں دھیان لگایا کرو۔

میں نے وعدہ کر لیا کہ میں خوب دل لگا کر پڑھوں گی۔

ایک دن یوں ہی میں نے سنیتا سے کہا "سنو یہ لوگ کیا کہتے ہیں کہ تم ڈاکٹر مہارا کے گھر سے چھپ چھپ کر ملتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

سنیتا نے میری طرف بہت غور سے دیکھا پھر ہنسنے لگی اور اتنے زور زور سے کہ درختوں میں بیٹھی چڑیاں اڑ گئیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر اسنے میرے ہاتھ سے ادھورا اسکیچ لے لیا اور چپ چاپ پنسل چلانے لگی۔

میں نے کہا سنیتا میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔

اسنے اسکیچ پر جھکے جھکے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "تم نے مہالا جبکر کو دیکھا بھی ہے۔

میں نے کہا۔ بچپن میں نے ان وادیوں میں کھیل کر گزارا ہے میں یہاں کے ایک ایک پتھر کو جانتی ہوں۔ ڈاکٹر کو یہاں آئے بہت دن تو نہیں ہوئے پر ہاں ذرا بوڑھا ہے۔

ستیا نے کہا" تم بھی یہی سوچتی ہو جو لوگ سوچتے ہیں۔ اچھا تو مجھے ڈاکٹر اچھا لگتا ہے اس میں کیا خرابی ہے۔ پھر ہم دونوں ناستک بھی تو ہیں۔ نہ وہ مندر میں جھانکتا ہے اور نہ میں۔

کمرے میں بہت خاموشی تھی آگ مدھم ہو چلی تھی اور ڈاکٹر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

ٹھکرائن اسنے ماں کو مخاطب کر کے کہا" ستیا میری مدھومتی کی طرح تھی ویسی ہی سندر اسی کا سا عام لڑکیوں سے نکلتا ہوا قد چہرے پر وہی بھولا پن۔ اگر میری بیٹی کو مرے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہوتا تو میں سوچتا اسنے دوبارہ جنم لے لیا ہے۔ میں اپنی بیٹی کا دکھ بہلانے یہاں چلا آیا تھا۔ وہ اکیلی میری زندگی کی روشنی تھی۔ بہت دکھی ہوں ٹھکرائن۔ اس کی ماں اسے چھوڑ کر میرے ایک کمپوڈر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں نے اسے پالا تھا وہی میرا سہارا تھی میں اسی کے لئے جیتا تھا۔ یہاں تو زندگی کی گن گن بھی کم ہی ہے۔ میں سوچتا تھا شاید جگہ کی دوری سے یادیں مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیں اور یہاں آکر میں نے ستیا کو دیکھا تو لگا جیسے میری مدھومتی ہی ہو۔ جب ستیا اسکول سے گھر جاتی ہیں مندر کے سامنے سے گزرنے والی راہ پر اس چاٹک کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ وہ تیز تیز چلتی گنگناتی ہوئی گزرتی چلی جاتی۔ جھرنے کے پتھروں کو پھلانگتی ہوئی پھٹپٹاتے ہوئے پلو کو سنبھالنے سے بے پرواہ جیسے کوئی جل پری ہو۔ بہت دنوں اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں صرف اسے دیکھنے وہاں کھڑا ہوتا ہوں۔ اور جب اُسے معلوم ہوا تو اسنے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ چھٹی کے وقت دکان بند کر کے یہاں آتے ہیں میں ذرا چکر دار راہ سے چلی جایا کروں گی آپ کیوں کشٹ کرتے ہیں۔

اور پھر اسنے آسان راہ کی بجائے جو ندی کے پل پر سے ہو کر جاتا ہے میری دوکان کے سامنے سے گزرنا شروع کر دیا روزانہ اور مجھے پرنام کر کے نکل جاتی۔

بیاہ کے بعد بھی جب کبھی وہ اسکول آئی ہے اسنے وہ راستہ نہیں چھوڑا۔ شام کو جب

بہاری اور وہ سیر کرنے نکلتے تو وہ ضرور کہیں نہ کہیں مجھے ملتی۔ جیسے وہ ڈھونڈ کر مجھے ہی دیکھتے اِدھر اُدھر گھوم رہی ہو۔

بیٹی، اسنے میری طرف دیکھ کر کہا ہے " تم نے بہاری کو دیکھا تھا"

میں نے بھلا بہاری کو کہاں دیکھا تھا" نہیں میں نے بہاری کو نہیں دیکھا۔

ستیا اور بہاری جیسے رادھا اور کرشن ہوں۔ گٹھیلے جسم کا مضبوط فوجی جوان تھا پر آنکھوں میں اتنی نرمی تھی جو صرف پریم کرنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے وہ آس پاس یوں گھومتے رہتے جیسے دو بچے ایک دوسرے میں مگن اور دنیا سے بے پرواہ ہوں۔ ان دنوں مجھے مدھومتی بہت یاد آئی ہے اگر وہ ہوتی تو میرے گھر کے آنگن میں بھی سہاگ کے گیت گونجتے۔ میرے دالانوں میں بھی کوئی شرمیلا سا لڑکا میرا داماد آکر بیٹھتا۔ میرے گھر میں بھی پریم کی روشنی ہوتی اور رنگ ہوتے۔

لوگ کہتے ہیں بھگوان ہے اگر بھگوان کہیں ہوتا تو مدھومتی کو مجھ سے چھین نہ لیتا۔ اگر وہ ہوتا تو ستیا نہ مرتی۔ ہمارے چاروں طرف اندھیکار ہے۔" اُسنے ہاتھ پھیلا کر یوں کہا جیسے اندھارا ٹٹول رہا ہو۔ اگر کہیں کوئی روشنی ہوتی تو کوئی کرن میرے حصے میں بھی آتی۔

ماں جلد جلد مالا پھیر رہی ہے وہ ڈاکٹر مہار اعکر کی بات کا کیا جواب دے۔ یہ بحث کہ بھگوان ہے یا نہیں ہے کون کرے۔

ایک دن کسی لڑکے نے دیوار کے پار سے غلیل مار کر ایک لال کو مار دیا اُسے تڑپتے دیکھ کر ستیا نے کہا تھا" ارے تمہارا بھگوان اس ایک لال کی حفاظت بھی نہ کر سکا دیکھو تو کیسے تڑپتی ہے۔

میں نے کہا تم تو سب وقت الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو اور بھگوان کے لئے کیا کچھ نہیں کہتی ہو۔ کیا اب بھی تمہیں اسپر وشواس نہیں آتا اگر اس کی مرضی ہوتی تو یہ لال کچھ دنوں اور جیتی رہتی۔

پلٹ کر کہنے لگی۔ تم ابھی بہت بھولی ہو۔ تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ یہ ساری باتیں آدمی اپنے آپ بنا لیتا ہے۔ مرنے اور جینے سے کسی کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں اتنا دکھ ہے اتنی خرابی ہے۔ اتنی بھوک ہے اتنی پریشانی ہے کہ آدمی پاگل ہونے لگتا ہے۔ اگر تم وہ سب

جان جاؤ تو مرنے کو جی چاہنے لگے۔

میں تو نہیں جانتی پر تم تو جانتی ہو اور تم ابھی تک جی رہی ہو۔

سیتا نے لاکی کی طرف سے منہ موڑ کر تالاب کے کنارے بیٹھتے ہوئے کہا تمہیں کیا پتہ میں کیوں جی رہی ہوں۔

تمہارے دل کی بات بھلا مجھے کیسے پتہ چل سکتی ہے۔

"میں پریم کرنا چاہتی ہوں۔ یہ سب بھلانے کے لئے یہی ایک سہارا باقی رہ جاتا ہے۔"

وہ یہ سب ایسے کہہ رہی تھی جیسے اس سے بڑا بھید اور کوئی نہ ہو اور اس کی آتما پر ایک بڑا بوجھ تھی۔

میری آنکھوں میں حیرت دیکھ کر اسنے کہا۔

پریم کرنا بری بات نہیں آدمی کا اپنے میں وشواس اس سے بڑھتا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہر کسی کا مرنا۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سننے کی عادی تھی۔ ایسی عجیب باتیں جس کی سمجھ مجھے کبھی نہیں آئی۔ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اور اس کی سوچ کا راستہ بہت لمبا تھا عجیب الجھا ہوا جیسے کسی دوکان کے سامنے سے ہو کر گزرنے کے لئے ہو۔ اسنے بھگوان کو اپنے راہ سے ہٹانے کے لئے یہ ساری باتیں آپ سے آپ بنالی تھیں۔ ایسے راستے جن پر بھگوان کا گزر ہی نہ ہو سکے۔

اچانک اسنے اسکول آنا چھوڑ دیا۔ ہمارے سالانہ امتحان سر پہ تھے۔ ماں مجھے ڈانٹتی رہتی راتوں کو جگائے رکھتی۔ آپ بھی بیٹھی رہتی کہ میں خوب پڑھوں۔ کتابوں کے ڈھیروں سے سر اٹھانے کا وقت نہ ملتا۔ کبھی سیتا یاد آتی تو میں سوچتی اسے امتحان کے ملکڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں نا۔ اسی لئے کبھی دکھائی ہی نہیں دی۔ چھٹی لکھنے اور اطلاع دینے کی تو اسکی عادت ہی نہ تھی۔

جب بادلے کی جھم جھماتی اوڑھنی کو ساڑھی کے اوپر سنبھالتی بند یا اور سیندور کا رنگ چھپکے پر جھبک کر وہ آئی ہے تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا۔

"ہمارا وندنا ہو گیا ہے۔"

میں چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

گہری اور بڑی بڑی آنکھیں جیسے اندھیرے پانی میں کنول کھلے ہوں۔ چاندنی کے

رنگ کی کرچولی کی سُرخی کے نیچے نازک سی اور جیسے کہ پر نرمی کے ساتھ ایک کانپتی ہوئی چمک مانو پلکوں کے نیچے دیئے جل رہے ہوں۔ جیسے کلی نے ابھی ابھی اپنی پتیاں کھولی ہوں۔

سپنے میں دیکھی صورت کی طرح میں نے اُسے سچ ہی نہیں جانا۔

میرا کندھا پکڑ کر کہنے لگی اب تو تمہارا امتحان ہو گیا ہے اب تو تمہیں کوئی نہیں روکے گا آؤ باتیں کریں۔ وہ تالاب میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے پیروں سے لال رنگ چھوٹنے لگا اور ان کی سفیدی سے جیسے پانی میں روشنی سی ہونے لگی۔

میرا تو ناچ ناچ کر بُرا حال ہو گیا ہے۔ تلوے ادھڑ گئے ہیں۔ اسنے ناک میں پڑی بڑی سی کیل کو گھماتے ہوئے کہا۔

تم نے ہمیں تو بلایا ہی نہیں، ہم تم سے بولیں ہی کیوں۔

دیکھو پدمنی مجھے معلوم تھا تم بُرا مان جاؤ گی۔ پر تمہارا تو امتحان تھا۔ اور پھر ہمارے گھر میں تو مہینہ بھر شور ہوتا رہا ہے۔ بہاری کی پسند کا بابا کو بہت خیال تھا۔ میں نے رات دن ناچ ناچ کر مشکل سے توڑے سیکھے ہیں۔ اور اب سنا ہے اُسے واپس بلایا جا رہا ہے لڑائی ہونیوالی ہے۔ بہاری لوٹ جائے گا اور میں یونہی تھکی۔

میں نے کہا شکایت کرنے لگی ہو بہاری کی۔

کہنے لگی ارے نہیں میں بہاری کی شکایت کیوں کروں گی۔ اس کے لئے تو اپنی جان دے سکتی ہوں۔ جانتی ہو مجھے اس سے پریم ہو گیا ہے۔

میں نے کہا تم چاہتی تھیں کسی نہ کسی سے پریم تو تمہیں کرنا ہی تھا۔ بہاری سے ہو گیا ہے ٹھیک ہے۔"

سیتا نے کہا۔" یہی تو ٹھیک نہیں ہوا۔"

میں نے کہا" تم عجیب لڑکی ہو بھئی سیتا میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پہلے کہتی تھیں پریم سے آدمی کا اپنے میں وشواس بڑھتا ہے اور اب کہتی ہو یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ آخر کچھ بتاؤ گی کیا چاہتی ہو؟"

وہ تالاب کے کنارے جھک کر یونہی پھولوں پر ہاتھ پھیرنے لگی اور پھر یوں ہولے سے جیسے

اُسے ڈر ہو کوئی سن لے گا۔ کہنے لگی۔

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے سانس رک جائے گا۔ جیسے جیون کی یہی گھڑیاں پوری کمل ہوں جیسے کسی شے کی کمی ہی نہ رہی ہو جیسے کچھ اور چاہتے ہی نہیں اور تم جانتی ہو تمہارا بھگوان جس کو میں نہیں مانتی سدا ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

"تم وہمی کب سے ہو گئی ہو" میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اِدھر اُدھر یونہی گھومتی رہیں۔ سیب کے درختوں پر پھول تھے اور خوشبو سے بوجھل بسنت کی ہوا نیچے وادی سے سہاگن بنی اوپر تک اپنے سریوں میں آئی تھی اور اب کھیلتی ہوئی چل رہی تھی۔

کچھ اور بتاؤ سیتا کچھ بہاری کی بات بتاؤ۔

سیتا نے کہا۔ بھئی اب میں چل دوں مجھے اسکے آنے سے پہلے واپس پہنچنا ہے وہ اپنی چھٹی کو بڑھانے کی تار دینے گیا ہوا ہے۔

اوڑھنی کو سر پر جمائے ساڑھی کو سنبھالے وہ دھنک کے رنگوں کی طرح موڑ پہ سے اوٹ میں ہو گئی اور اس اوٹ کے اُدھر سے پھر میں نے سیتا کو نہیں دیکھا۔

ہم نئی جماعتوں میں کتابیں لے کر خوش خوش جا رہے تھے۔ اسکول میں میلہ سا لگا تھا جب ہم نے سنا سیتا مر گئی ہے۔

بازار بند ہو گیا اسکول میں چھٹی ہو گئی اور میں کتابیں پٹخ کر چپ چیخنے لگی ہوں تو مجھے پتہ نہیں چلا کب ہوش میں آئی۔ بخار نے دونوں ہلنے نہیں دیا۔ شیشوں میں سے چھن کر آتی روشنی میں بھی آنکھیں بند کئے پڑی رہتی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہوتے جیسے سب کچھ تباہ ہو رہا ہو۔

استانی درگا جماعت میں کہنے لگیں یہ سب کرموں کا پھل ہے بھگوان سب کو معاف کر دیتا ہے پر اپنی ہتیا آپ کرنے والے کو نہیں۔ سیتا نے اپنے بابا کو بدنام کیا اور بنا کسی خیال کے جو جی میں آیا کر لیا۔ وہ سدا کی خود غرض تھی۔

میں نے کہنا چاہا۔ اب آپ اس کا ذکر چھوڑ نہیں سکتیں۔ مگر پھر چپ رہی یہ بیکار کی باتیں

کہنے سے کیا حاصل جو سوچتا ہے سوچے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

ماں کو کسی کام سے اپر ٹوپے جانا پڑ گیا تو میں نے بہت منت کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلے۔ ڈاکٹر صاحب۔ ماں نے بجھتی ہوئی آگ پر لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا۔ میں خود وہ گھر دیکھنا چاہتی تھی اور اسی لئے جب اپر ٹوپے گئی ہوں تو سیتا کے ہاں بھی گئی۔

وادی کے ایک طرف ڈھلوان پر بنا وہ گھر نہیں دور سے مندر لگتا ہے۔ چاروں طرف باغ سے گھرا جیسے سورگ ہو۔ ہر طرف پھولوں کے رنگ اور بھیگی ہوئی باس سے بوجھل ہوا۔ سامنے بنے تالاب میں کبھی کنول رہے ہوں گے پر اس دن تو پتوں سے اٹا ہوا تھا جو سیتا کے مرنے کے بعد سے وہاں اکٹھا ہو رہے تھے۔ سب طرف چپ چاپ تھی ایسا سناٹا جیسے اجاڑ مندروں میں ہوتا ہے۔ گھاس جنگلی پھولوں اور بیلوں نے بڑھ کر ہر طرف قبضہ جما رکھا تھا۔ میں اور پدمنی ایک آدمی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے جو باڑ کے پاس یوں چل رہا تھا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی آتما کتنے جگ بعد لوٹی ہو اور پرانے ٹھکانے کو دیکھ رہی ہو۔

سایہ ہماری طرف بڑھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔

سیتا پارسال اپنے بابا کے ساتھ میلہ گھومنے آئی تھی۔ یہاں سامنے بڑے بازار میں دونوں باپ بیٹی گھوڑوں پر گزرے تھے وہ اسکی چھوٹی بہن جان پڑتی تھی۔ اور جس آدمی کو میں نے اس ویران گھر پہ دیکھا اس کا سر برف کی طرح سفید تھا داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور خالی خالی آنکھیں بجھتے دیوں کی طرح تھیں۔

پدمنی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ تم سیتا کی سہیلی ہو اس سے ملنے آئی ہو گی۔ پر بیٹی سیتا تو گھر پہ نہیں۔ میرا تو بھگوان سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ پر اس کا تما اور وہ جھگڑا چکانے گئی ہے وہ باڑ کی طرف چلا گیا۔ زخمی جانور کی طرح کی تڑپ اور چیخ تھی اسکے آس پاس مڑا اور پھر ہمارے پاس آیا۔

ٹھکرائن تم ہی بتاؤ بھگوان بھی کبھی آدمی کی طرح غصہ ہوتا ہے۔

میں نے کہا بھیا کوئی لوٹ کر تو نہیں آتا۔ پر سیتا جانے والی نہ تھی۔

یہ تو مجھے پتہ نہیں چلتا۔ بہاری اور ستیتا بہت مگن تھے اپنے میں ڈوبے ہوئے۔ جیسے انہیں اب اور کوئی چِنتا نہ رہی ہو۔ کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ستیتا غصہ ور اور تیز مزاج تھی۔ اپنی مرضی کرنے والی پر بہاری کے سامنے دھیرج اور شانتی سے بہنے والی ندی کی طرح تھی۔ اسے بیاہ کر میں نے سوچا اب سب سپھل ہو گیا ہے۔ مجھے بھی کوئی چِنتا نہیں۔ پر بہاری اس کی آنکھوں سے ذرا سا پرے ہوتا تو وہ اداس ہو جاتی اور اسکے چہرے پر کی زردی سے لگتا مہینوں بیمار رہی ہو۔ فوجی کب تک گھر پر رہ سکتے ہیں اور میں من ہی من اُسے بہاری سے بیاہنے پر پچھتاتا بھی۔

بہاری کے جانے کے بعد وہ بجھ سی گئی میں اسے بہلانے کے لئے سارے جتن کرتا۔ ہنس کر کہتی۔

"آپ تو یونہی پریشان ہوتے ہیں بابا میں خوش ہوں اتنی خوش۔"

مرنے سے کچھ دن پہلے یوں چلتی جیسے سپنے میں چل رہی ہو چہرہ زرد کچھ سوچتی ہوئی۔

جس دن اُسنے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے اسکے دوسرے دن بہاری کے مرنے کی خبر آئی اور تیسرے دن مجھے یہ کاغذ باڑ میں اٹکا ہوا ملا ہے۔ اور اسنے پھٹا ہوا میلا سا ایک کاغذ ہمارے سامنے کر دیا۔

بیٹی کیا یہ ستیتا کے ہاتھ کا لکھا ہی ہے تم تو اسکی سہیلی ہو۔

کاپی میں سے پھاڑے کاغذ پر جگہ جگہ مٹی تھی اور ایسے نشان جیسے بہت سے پاؤں اس پر سے گزرے ہوں ہوا نے اسے اڑایا ہو۔

لکھا تھا۔" میں کئی راتوں سے ایک ہی سپنا دیکھ رہی ہوں۔ میں نے بہاری کو اپنی ان آنکھوں سے گولی کھا کر گرتے زخمی ہو کر تڑپتے اور چیخ چیخ کر چپ ہوتے دیکھا ہے اور آخری دم تک اسنے مجھے پکارا ہے۔ بھلا میں اسکی پکار کو کیسے ان سنا کر دوں۔ اسکے بعد اس دنیا میں کوئی شے ہے جسکے لئے میں جئے جاؤں۔"

"کیوں بیٹی یہ ستیتا کے ہاتھ کا لکھا ہی ہے نا۔" اس کی آواز میں اتنی منت تھی۔

ڈاکٹر صاحب میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دیا۔ میں اور کیا کہتی ہو سکتا ہے وہ لکھا ہوا اسکے

ہاتھ کا نہ ہو۔ لوگوں نے اسکے مرنے کے بعد کتنی ہی کہانیاں آپ بنا ڈالی ہیں آدمی اپنی تسلی کے لئے کہانیاں بناتا ہے اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈنا پاتال تک میں اتر جاتا ہے۔

بھگوان ہوتا تو سیتا بھی ہوتی۔

مجھے ڈر ہے میری سوچ کی آواز اگر ماں نے سن لی تو کہے گی۔ سیتا مجھے بھلی لگتی ضرور تھی پر تم تو اپنے بھگوان پر وشواس رکھو۔

اور میں کس شے پر وشواس کروں ؟

سالانہ:۔ ۱۶ روپے

قیمت فی پرچہ:۔ ۳ روپے

شائع کردہ:۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی ۵

اگنی دا

جمیلہ ہاشمی

کرنل مرزا کا ہیلی کاپٹر گوپے کے سامنے پہلی اور تپش سے سیاہ پڑتی گھاس پر سے ابھی اڑا تھا ٹھاکر تیج سنگھ کی تلاش میں صحرا کے اوپر لمبی اور نیچی پرواز کے لیے انھوں نے پروگرام کے مطابق اپنی دُوربینیں اور بھری ہوئی بندوقیں گولیوں کے راؤنڈ بھی ساتھ لیے تھے ہم کئی دنوں سے اس ٹوبے کو اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے تھے کیوں کہ یہ ٹوبہ رنہال پوسٹ اور جے پور کی سرحد کے قریب تھا۔ دونوں حکومتوں کو ٹھاکر تیج سنگھ کی ضرورت تھی اس کے سر پر ایک بہت بڑا انعام مقرر تھا جس کا اعلان کئی بار ہو چکا تھا مگر سردار صحرا کے ہونے کے غرور طبیعت کی بے باکی اور جرأت مندی نے اسے اپنی جان سے بھی بے پروا بنا دیا تھا وہ کڑے پہرے اور تنگ گھیرے کے باوجود جو چاہتا کر گزرتا۔

گرم ہواؤں کے ابلتے ہوئے چکر کھاتے اور آگ اگلتے اس موسم میں جب سورج تمھارے سر پر چمک رہا ہو اور ریت کی لہریوں میں سے آگ کے شعلے لپکتے ہوں وہ اپنے تیز رفتار اونٹوں کے جھنڈ لے کر جس پوسٹ پر موقع ملتا حملہ کر دیتا۔ ہم تقریباً پچاس آدمی اس جنگ میں لگا چکے تھے اور کرنل مرزا کے لیے یہ اب زندگی اور عزت کا سوال بن گیا تھا۔ مُردہ یا زندہ تیج سنگھ۔

جھکڑوں اور خونی آندھیوں کے گھیرے میں۔ تیز رو لہروں میں ہونکتا ہوا سناٹا ہمارے چاروں طرف ہے بدطینت دشمن کی سی چالاکی سے وہ آدمی کو گرفتار کرتا اور فنا کرتا ہے۔ صحرا کی بے چین روحیں پل پل لمحہ لمحہ زندگی کی کھوج میں گھومتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کی طرح ٹیلے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوا غصہ ور دیوانی اپنا سر جھٹکتی شور مچاتی ہے، ریت کے ابلتے ہوئے فواروں میں سورج اپنا زور اور توانائی لگاتا ہے مگر شامیں اپنی مہندی لگی پوروں سے رات کی اوڑھنی پر ٹھنڈے ستارے ٹانکتی ہیں آسے سجاتی ہیں پھر خاموشی کی ڈھولک پر لمبی تانوں والے راگوں کی پھوار ریت کے ذرّوں کو رجھاتی ہے کمال کر بھی بولتی ہے۔

سارے ٹوبے سیاہ کیچڑ بن جاتے ہیں جو اندر کی تپش سے پھٹ جاتی ہے اور کالے چرمرانے ہوئے برتنوں کی طرح کھڑکھڑاتی ہے تو ریت اس ساز پر اپنے وحشی گیت اور موت کے ترانے گاتی ہے مگر یہ ٹوبہ۔

چنگاری ۱۳

جس کا پانی پاتال سے ملا ہے کبھی نہیں سوکھتا کیونکہ اس اونچے ٹیلے کی خطرناک ڈھلوان سے نیچے کی طرف جنڈ اور کریر رائی اور پھوگ کے پودے بڑے بڑے چھتنار جال کے درخت میں الجھے ہوتے اس پر گرے پڑتے ہیں اور پانی پر سایہ کیے ہوتے ہیں۔ جیسے پیاس بجھانے کو جھکے ہوں ٹھنڈا اور میٹھا پانی آسمان کی نگاہوں سے چھپا سخت موسم میں بھی اس میں ہلکورے لیتا ہے۔ صحرا میں گم ہوئی گائیں۔ راہ بھولے ہوتے اونٹ۔ بھٹکے ہوتے ہرن سب اس پانی پر کبھی نہ کبھی جمع ہوتے ہیں۔ دوست اور دشمن اس چشمے پر اکٹھا ہوتے ہیں۔ خدا کی اس فیاضی پر خوش ہوتے ہیں۔

اور اس اونچے ٹیلے پر بنے گوپے پرپیچ راہوں سے ایک دوسرے سے ملے ہیں یوں لگتا ہے ایک شہر آباد تھا۔ اناج اور اسلحہ اور کپڑے اور تصویریں بنانے کا سامان۔ پنسلیں اور برش کاغذ اور کینوس۔ سنگار کا پٹارہ گھنگرو اور ستار، ڈھولک شہنائی اور انگریزی کتابیں بے شمار لوٹ کے ڈھیر، نایاب چیزیں پھیلی ہوئی زندگی کا سمٹا سا نقشہ۔

شام قریب تھی۔ دھوپ کے زور میں ذرا کمی تھی۔ جب بیلی کا پٹ بلند ہوا ہے تو دھلی ہوئی فضا میں تیر کی طرح سنسناتا ہوا دور تک دکھائی دیتا رہا پھر افق نے اُسے اچک لیا اور نظر کی حد سے پرے اس کی بھربھر بھی بند ہوگئی۔ میں نے باہر گوپے میں آکر ادھر ادھر دیکھا بندوق کو چٹائی پر رکھ دیا اپنے اکڑے ہوئے اعضاء کو سیدھا کرنے کی خاطر سر سے اوپر ہاتھ اُٹھا کر انگلیوں کو چٹخا۔ دائیں بائیں گھوما۔ ہوا کے آنے والے سوراخوں سے آنکھ لگا کر دیکھا سپاہی بندوقیں لیے مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ٹھنڈی ریت پر اوندھے لیٹ کر اپنا جلتا ہوا چہرہ چٹائی پر رگڑا۔ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور پھر جانے کب مجھے نیند نے آلیا۔

جناب! یہ عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ سپاہی کی آواز توپ کے گولے کی طرح میرے کان میں داغی گئی۔ گھبرا کر میں نے بندوق پر ہاتھ مارا۔ اکڑی ہوئی ٹانگوں نے ہلنے سے جواب دے دیا۔ سوئی ہوئی انگلیاں بے جان سی بندوق کے گرد مردہ گھاس کی طرح بکھر گئیں۔

تنگ راستے میرے مجھے ایک گھاگرے کی گوٹ دکھ گئی اور گھیر برا کیے ہوتے ملگجے کرتے کے دامن پر لٹکے ہوئے ہاتھ تڑے مڑے کاغذ کی طرح زاویوں اور مثلثوں اور ٹکڑوں اور شکلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لمبی انگلیاں پتلی تھیں جیسے کسی زمانے میں یہ ہاتھ ساز بجاتے رہے ہوں۔ ان انگلیوں نے برش اور قلم سے تصویریں بنائی ہوں۔ پتھر کو تراش کر اس میں سے مورتیاں نکالی ہوں۔ یہ ہاتھ کمزور نہ تھے مگر مضبوط و رجب جوان ہوں گے تو جانے کیا ہوں گے۔ اب بھی ان سے گھبراہٹ نہیں جھلکتی تھی۔ چہرہ مجھے اس وقت تک دکھائی نہیں دے سکتا تھا جب تک میں باہر نہ جاؤں یا آنے والی کو اندر نہ بلاؤں۔ بندوق کو اپنے سامنے تانے جب میں جھک کر باہر آیا تو میرے سامنے ایک دھندلے بھولے ہوئے خواب کی سی صورت تھی۔ پرچھائیں۔ مورتی جو پتھروں تلے دبی دبی ریزہ ریزہ ہو چکی ہو مگر بکھری نہ ہو۔ سفید

بالوں میں کہیں کہیں سیاہی تھی اور گوندے جاتے ہوتے چمکیلے بالوں میں مانگ گم ہوئی پگڈنڈی کی طرح تھی سفید بھویں پپوٹوں پر چھائی ہوئی تھیں اور چھوٹے بے پلکوں کی آنکھوں پر گرے گرے تھے نگاہ لٹ سے جھانکتی کرن تھی اور دھیرے دھیرے دیکھے جانے والی شکا کو اجالتی تھی گردن سیدھے کندھوں پر ٹکی ہوئی ذرا آگے کو جھکی ہوئی تھی جیسے کوئی وجود صدیوں پرانے پردوں کو ہٹا کر آج کی دنیا کو دیکھ رہا ہو۔

میں "اگنی دا" ہوں تیج کی داتی ماں، ٹھاکر تیج سنگھ کی داتی ماں۔

میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔

"کیا تم نے اسے کھوج لیا ہے یا وہ تمہارے پاس ہے"؟ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ لفظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"اچے بسر سے آئی ہوں۔ کیا تم بیٹھنے کا نہ کہو گے"؟

مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔

"تم اپنی بندوق کو پرے کر لو۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کھلونے سے ڈر آتا ہے میں بہت تھک گئی ہوں پھر وہ اپنا بھاری گھاگرا سمیٹ کر اس کے گھیروں پر بیٹھ گئی جوتیاں اتار کر اپنے سامنے رکھ لیں اور پاؤں کو دبانے لگی۔

"تمہیں اپنے سے کسی بڑے افسر کا انتظار ہو گا کہ تم خود مجھ سے بات کر سکو گے"۔

مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا"۔ میرا بچہ سیدھا اور بھولا ہے، ہٹیلا بالک۔ ہوائیں اُسے چک پھیریاں دیتی ہیں اپنے ساتھ اڑائے اڑائے پھرتی ہیں"۔

"ہوائیں بھی کسی کو قید کر سکتی ہیں"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں سچ کہتی ہوں یہ ہوائیں اپنی لہروں اور آوازوں سے ایسا جادو جگاتی ہیں، ایسی ہانک لگاتی ہیں یہ کبھی نہ ختم ہوتے۔ صحرا پر دن رات ناچتی ہیں تم نے کبھی ریت پر ناچ کے چکر نہیں دیکھے نا ورنہ تمہیں پتہ ہوتا کہ ان پر اگر کوئی ایک بار پاؤں دھر دے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ پھر کسی کی نہیں سنتا۔ اپنی داتی ماں کی بھی نہیں"۔

عجیب بات ہے"۔ میں نے جواب دینے کے لیے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے نا دکن سے ہوا گھلے تو بارش ہوتی ہے گھنیرے کالے بادل امنڈ گھمنڈ کر آتے ہیں۔ بجلی کے لہریے زمین کو چمکا دیتے ہیں ایسے ہی چکروں کی بھی کہانی ہے۔ مگر تم شہروں کے رہنے والے یہ سب کیا جان سکتے ہیں"۔

اچھا! اب میں دلچسپی اور توجہ سے بات سن رہا تھا۔
ہوا آدمی کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے اپنی بلاؤں کو اس پر بٹھا دیتی ہے اس کے سر میں گھومنے پھرنے اور آزادی کے خیال بھر دیتی ہے۔ وہ جوانوں کے دل کو آبادیوں سے پھیر دیتی ہے وہ دیوانے ہو کر بستیوں سے نکل آتے ہیں۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھی رہی۔
کرنل خشک لمبی لیٹی ہوئی سوکھی چرمراتی گھاس پر سے چلتا ہوا روشنی ملی نیلاہٹ کے گلابی پڑتے اجالے سے ہماری طرف آیا۔ گوپے کی طرف چبوترے پر قدم دھر کر وہیں کھڑا ہو گیا۔
"یہ تیج سنگھ آف اجے سر کی دائی ماں ہے اگنی دا۔" میں نے فراغت کا سانس لیا اور بندوق کو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلا۔
کرنل نے گہری سوچتی ہوئی نگاہ سے اگنی دا کی طرف دیکھا جو اپنی ادھ مندی آنکھیں کھول کر بیخوفی سے کرنل کی طرف دیکھ رہی تھی۔
کرنل کے ماتھے پر ایک رگ زور سے پھڑک رہی تھی شاید اسے غصہ آ رہا تھا۔
"کیا کہنے کی ضرورت ہے تیج سنگھ کے لیے وہ اگر کسی بڑی ریاست کا راجہ ہو تو بھی سزا سے نہیں بچ سکتا وہ پورا اپنی ایڑی پر گھوم گیا اور ٹیلے کی بلندی سے اس نے نیچے پاتال سے ملے ڈوبے پر نگاہ دوڑائی جہاں جال میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور شام کی ہوا سے پانی گیت کی بے پرست مانجھی کی طرح تال کے بیچ ٹھہرا ہوا تھا۔
"میرا سوال سن لو جواب دینا نہ دینا تمہارے اختیار میں ہے۔" اگنی دا کی آواز میٹھی تان کی طرح کرنل کے پیچھے سے اٹھی۔
"مگر یہ سب ناممکن ہے۔ تم یہ چاہو گی کہ میں اس کا پیچھا نہ کروں۔" کرنل نے جھنجھلا کر اپنا پاؤں زمین پر مارا۔ میں مہینے سے اس جلانے والی گرمی اور پیڑوں کو کملا دینے والے صحرا میں ڈیرے ڈال کر یونہی نہیں پڑا ہوں۔"
اگنی دا نے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو سر پر برابر کیا۔ "بھکشا ناتے بات کرنے کا ادھیکار تو دو۔ تم بہت غصے میں ہو۔ تمہیں ہونا ہی چاہیے۔ تم بہت دنوں سے اس صحرا میں گھوم رہے ہو۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ تم تیج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی کھوج میں ہو۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گئی۔ "میں نے تین نسلوں سے اس کی چاکری کی ہے۔ تین نسلوں کی رگوں میں میرا دودھ ہے۔ کیا مجھے کچھ کہنے نہ دو گے؟"
"مگر تمہاری بات ایسی ہو گی جو میں کبھی نہیں مان سکتا۔ پھر ایسی باتیں سننے سے کیا ملے گا۔" کرنل نے

بہت آہستگی سے کہا جیسے اگنی داسے زیادہ اپنے آپ سے بحث کرکے اپنے آپ کو منوا رہا ہو۔

"دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی جس سے تمہاری راہ میں مشکلیں پیدا ہوں۔ سوچ کر جواب دو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ اجے سر میں اب میرا کون بیٹھا ہے"

"کیوں اجے سر میں تمہارا خاندان ہوگا، بہوئیں، بیٹیاں، بیٹے، پوتے، گھر"۔ کرنل نے کہا۔

میرا سب کچھ اس صحرا میں ہے۔ صرف تیج میرا ہے، میرا ٹھاکر۔"

کرنل نے کہا۔ "ٹوبے میں چٹائیاں سیدھی کردو دیئے جلاؤ" ہم اگنی دا کی بات سن ہی لیں اور میری طرف دیکھ کر کہا "ٹوبے کے چاروں طرف پہرہ دوگنا کردو۔ میں سارے ٹوبوں اور پانی کے ٹھکانوں پر دیکھ آیا ہوں ایک بوند کہیں نہیں ہے سوائے اس ٹوبے کے رکن پور کے پانی کے ذخیروں کا بھی یہی حال ہے۔"

میں نے سر جھکا دیا۔ ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی سیاہ آسمان دوج کے چاند کی روشنی میں خالی خالی سا تھا ڈھلوان پر درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی اور کم سرے ابھرتی تو بال بکھرائے بگنی کی طرح ہمارے چاروں طرف چک پھیریاں لیتی۔ مدھم زردی میں ستارے ایک دم نہیں جیسے اندھیری راتوں میں ہوتا ہے ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں ہمارے سروں پر جمع ہو رہے تھے۔

"ناتواں اگنی دا کسم سر تک کا لمبا راستہ تم نے کیونکر طے کیا گرمی اتنی بے پناہ تھی اور تم تو ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ جاؤ۔"

دیئے کی لو سیدھی اس کی زمانوں سے بھی پرانی آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور وہاں ہیرے کی چمک اور پھر الگ الگ ٹکڑے ہیں الگ جیسے ہیروں کے ریزوں سے بنی مورتی پھر دیوں کی لو کانپے اور دکھائی دے۔ اگنی دا نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"کسم سر میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔ پھر سانس لینے کے لیے رک کر اس نے کہا۔ "پہلے یہ سارے ٹوبے آباد تھے جیتے جاگتے لوگ یہاں رہتے تھے۔ اجے سر سے اکثر کسم سر آیا کرتی تھی، میرے ٹھاکر کے دادا کے وقتوں میں یہ آبادیاں تھیں۔ راج محلوں کی سی رونقیں تھیں۔ پھر اور لوگ، خراب موسم، وقت سب نے مل اجے سر کو ایک گڑھی بنا دیا۔"

سیٹی کی آواز کرنل کے منہ سے نکل گئی۔

"تمہیں وشواس نہیں ہے نا۔ میں بھگوان کی سوگند اٹھا کر کہتی ہوں۔ یہ سب سچ ہے۔"

"ان ویرانوں کو دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہوتا"۔ میں نے کہا۔

اس دھرتی پر تماشے ہوتے ہیں اور آکاش یہ تماشے دیکھتا ہے سوچتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتا

ہے راجے ڈاکو بن جاتے ہیں۔ عزت دار بڑے لوگ بس مٹی میں مل جاتے ہیں۔" اگنی دا کی مدھم مگر مضبوط اور صاف باتیں سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ تو ہے، یہ تو ہے" کرنل نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ جب تم یہ سمجھ گئے ہو تو آگے کی بات بھی تمہیں سمجھ آ جائے گی۔"

"اگنی دا میں تمہاری بات سمجھتا ہوں اور پھر بھی مجھے پتہ ہے تیج سنگھ کو دنیا کی کوئی حکومت معاف نہیں کرے گی"

کرنل کی آواز الجھی ہوئی، جھگڑالو، تیز اور قطعی تھی۔

"میں نے کہا ہے تم ٹھاکر کو چھوڑ دو؟" اس نے ہم سب کے منہ کی طرف دیکھا۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اصل میں سارا قصور میرا ہے۔ اس ساری کہانی کی مصیبت میرے لائے لائی ہوئی ہے۔ بڑے ٹھاکر کو میں نے بچوں کی طرح پالا تھا۔ امر سنگھ کو تیج سنگھ کے باپ کو میں نے اپنا دودھ پلایا ہے اور اس سینے میں آگ جلتی ہے الاؤ لپکتے ہیں۔ جب میں وہ سب یاد کرتی ہوں جو ہوا۔" وہ سر جھکا کر چپائی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"امر سنگھ سیدھا تھا۔ بھولا اور وشواس کرنے والا اور اس لیے جب اس کے گھر میں وشواس گھات ہوئی تو اسے پتہ ہی نہ چلا۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ بہو جس کو سہاگ رات سے میں نے اپنے ہاتھوں کا سایہ کیا جس کے قدموں میں آنکھیں بچھائیں جسے اپنی کوکھ سے جنم لینے والی بیٹیوں سے زیادہ پیار کیا۔ وہ مجھے ہار دے گی میرے دل کو اپنے پیروں میں مسل کر آگے نکلے گی وہ اس کی پروا نہیں کرے گی جو اس کا سہاگ تھا پہلے پہل میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہوں۔ میرے کان کم اور غلط سنتے ہوں۔ یہ صرف دیور اور بھابی کی چھیڑ چھاڑ ہو۔ ذرا سی دل لگی، تھوڑا سا دلار یونہی مان اور کھیل۔ پتہ نہیں امر سنگھ کو کیوں شبہ نہیں ہوا۔ میں اُسے بتا سکتی تھی، ہوشیار کر سکتی تھی مگر اس گھرانے میں خون کی ہولی دیکھنی نہیں چاہی۔ جب سمے بیت جاتا ہے تو بس بیت ہی جاتا ہے اور میرا دل یونہی اندر باہر ہوتا رہتا تھا۔ خوف کے مارے یونہی دھڑکتا تھا۔ جب سب ختم ہو گیا۔ بہو کے سولہ سنگھار اور پور پور سوگندھ اس کے پاؤں کے پائل، اس کے ماتھے کی بندیا۔ اسکی مانگ کا سیندور، اس کی آنکھوں کا کاجل اس کی ستی ساوتری ہونے کی چالیں اس کی ہستی کی موہنی اس کے ہونٹوں کے میٹھے بول سب مل کر وہ زہر بنے جو ٹھاکر امر سنگھ کی جان لے گئے۔

رام سنگھ اور بہو نے مل کر ایک جال پھیلایا تھا جس میں امر سنگھ پھنسا اور اس سے پہلے کہ وہ پھڑکتا وہ نہ رہا۔ آج اس گھڑی سوچتی ہوں جب اس نے ان دونوں کو اپنے پاس دیکھا ہو گا ان کی ظالم آنکھوں میں اپنے انت کا لکھا پڑھا ہو گا۔ اس ایک لمحے اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اسکا دل تو خود ہی پھٹ گیا ہو گا۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے میں نے رام سنگھ سے کہا تھا چھوٹے بھیا یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ اپنی فتح کی خوشی میں اپنے مکمل اور طاقت ور ہونے کی اس گھڑی میں اس نے مجھے دھکیل کر پرے کر دیا زور سے ہنسا اور کہا۔

تو تم اگنی جانتی ہو ناکہ سب کیا ہوا ہے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ جو دیکھا ہے بھول جاؤ۔ اب سر کا ٹھاکر میں ہوں، میں ہوں اور اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ اور پھر وہ لوٹ گیا تھا۔

اچے سر رام سنگھ کا تھا۔ اچے سر کی راج گدی سوگ کے بعد اسے مل گئی۔ سال بیتنے پر بہو بھی اس کی ہو گئی۔ اپنے بھائی کے خون میں ڈوبا۔ ہنستا اور خوش اچے سر کا ٹھاکر بن گیا۔"

"ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ رام سنگھ کو زہر نہ دیا گیا ہو۔ تمہاری سوچ ہو" کرنل نے کہا۔

"پہلے پہل میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ میں جلن کے مارے دیوانی ہوں ایسی کوئی بات نہیں مگر وہ رات وہ گھڑی بھلائے نہیں بھول سکتی۔ رام سنگھ کا سہاگ، گھر کی سیڑھیوں سے اترنا، مجھ سے ملنا۔ اس کی خوشی۔ یہ سب برا خواب سمجھنے پر بھی سمجھے نہیں جا سکتے۔ بھلائے نہیں جا سکتے۔"

"مجھے پینے کو پانی کا ایک گھونٹ دو بھگوان کے لیے۔ میرا گلہ سوکھ رہا ہے"۔ اگنی دا نے ہاتھ پھیلایا میں نے اٹھ کر صراحی سے مٹی کا کٹورا اس میں بھر کر اسے تھما دیا۔ "ہاں یہ کسم سر کا پانی ہے۔ امرت جیسا پاتال کے سارے سوتے اکٹھے ہوتے ہیں"۔

"سارے ٹوبوں میں کڑوا اور بدبودار پانی ہوتا ہے صرف کسم سر کا پانی پینے کے قابل ہے کبھی سیاہ نہیں پڑتا۔ کبھی سورج کی گرمی سے سوکھتا نہیں اور کبھی کسی پر بند نہیں کیا گیا۔ صرف اب ہم اس پانی کو گھاٹ بنا کر تیج سنگھ کے منتظر تھے"۔

"اچے سر کی گڑھی کا مالک تو میرا ٹھاکر ہے۔ میں نے اسے بھوک کے سائے سے بھی جدا رکھا اب سوچتی ہوں ہو سکتا ہے اگر یہ ماں کی گود میں رہتا تو حالات دوسرے ہوتے۔ مگر نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا رام سنگھ تو اس کی جان کا لاگو تھا۔ اگر اس کے رونے کی آواز اسے کوٹھیوں اور آنگنوں کے پار سے کبھی سنائی دے جاتی تو بس پر بگڑتا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا وہ بھلا اسے کہاں برداشت کر سکتا تھا۔

میں اسے چھپا کر رکھتی۔ جب یہ کھلکھلا کر ہنستا تو مجھے ڈر لگا رہتا۔ یہ میرے دل کے وہم تھے۔ میری بھول تھی میں سمجھتی تھی رام سنگھ اب بچے کو بھول گیا ہے۔ مہتاب اور شستاب پیدا ہوئے تو اس نے مجھے بلایا تھا۔ پالنے پر جھکے ہوتے اور دونوں ایک سی صورتوں کو پیار کرتے ہوتے اس نے کہا تھا۔

اگنی دا۔ دیکھو یہ میری وجہ ہے۔

چنگاری ۱۹

"ٹھاکر بھگوان سدا سکھی رکھیں" میں نے دور کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"قریب آؤ اور دیکھو یہ تیج سے زیادہ خوب صورت نہیں ہیں کیا۔؟

دل اچھل کر میرے حلق کے قریب خون خون ہونے لگا۔ میں نے ہاتھ منہ پر بھینچ لیا اور جھک کر ان دونوں کو دیکھا پھر سیدھے ہو کر کہا" یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اور میرا ٹھاکر بڑا ہے۔ بڑا اور بہت سُندر۔"

"اگنی! رام سنگھ نے مڑ کر کہا تمہاری یہ جرأت۔ تم ہمارے ہی منہ پر ہمارے بچوں کو برا کہہ رہی ہو۔"

"چھوٹے بھیا" میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں ابھی کیا پتہ چل سکتا ہے۔"

"ہم چھوٹے بھیا نہیں ٹھاکر رام سنگھ ہیں۔ اس گڑھی کے مالک اور یہ شیر کے بچے ہیں۔ ان کا پتہ تمہیں پالنے میں بھی چل سکتا ہے۔" اس نے گرج کر کہا۔

بہو لیٹے سے اٹھ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ باندیاں منہ ڈھانپ کر کونوں میں چھپ گئیں۔ صرف میں کھڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

"جب تیج بڑا ہو گا تو وہ ٹھاکر ہو گا۔ چھوٹے بھیا یہ اس کے باپ ٹھاکر امر سنگھ کی گڑھی ہے۔ میرے سارے شریر میں سے جان نکل گئی تھی" ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ پسینے سے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ مگر میں نے بڑے ٹھاکر کو گود میں کھلایا تھا رام سنگھ اور امر سنگھ دونوں کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ مجھے اپنے حق اور اپنی شکتی پر بڑا مان تھا۔

"اس تھپڑ کے نشانوں میں آج بھی آگ سلگ اٹھتی ہے۔ جب میں یہ سب یاد کر رہی ہوں۔ چھوٹے بھیا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں جل اٹھتی ہیں" اگنی دا نے اپنا تڑا مڑا زمانوں پرانے کاغذ کا سا گال سہلایا۔

"اگنی دا۔ اگنی دا۔" وہ چیخنے لگا۔ "یہاں سے چلی جاؤ۔ اگنی دا۔ مگر میرا سارا جسم یوں ڈھے گیا تھا جیسے بارش میں کچی دیوار بیٹھ جائے۔

اس کے بعد ہر دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا۔ رام سنگھ تیج کو بلاتا ڈانٹ پیٹتا اسے ڈانٹتا پھٹکارتا کبھی حکم دیا جاتا کہ تیج کو گڑھی سے باہر نکلنے نہ دیا جائے اس پر نت نئے عذابوں اور نت نئی پابندیوں کی آزمائش ہوتی۔

ہو سکتا ہے اگر میں اپنی زبان بند رکھتی تو ہم پر یہ عذاب نہ ٹوٹا کرتا ان سارے زمانوں، لمبے سالوں میں یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ اصل دشمن میں تھی۔ جب دوسرے آپ کا حق چھینتے ہیں تو وہ ساری راہیں بند کر دیتے ہیں۔ ان کے اپنے دل تنگ جانے والے راستوں پہ بھی بہرے ہوتے ہیں وہ نرمی، محبت، رشتہ حق ہر شے کو بھول جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں جو کسی اور دیس میں، کسی اور جنم میں زندہ ہوتی ہیں۔

میں جب تیج کو مہابھارت کی کتھائیں سناتی تو وہ ہنس دیتا۔ "اگنی دا، جو آدمی چھٹپنے میں کچھ نہ کر سکے جوانی میں بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ اگنی دا میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ تم ایسے ہی اپنی جان کھپاتی ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے یہی تمہارے سپنوں کا سورویر بن کر گڑھی کا مالک بن جائے گا۔ میں کورَو ہوں۔ پانڈوؤں کی ماں کا بیٹا۔"

جب میں منہ لپیٹ کر لیٹ جاتی اور اس سے نہ بولتی تو وہ کہتا۔ "اگنی دا اگر تم کہتی ہو تو میں بہت بڑا اونچا سورویر بن جاؤں گا۔ میرا سر چھت سے بھی اونچا ہوگا۔ بازو پھیلا کر یہ ساری جگہ گھیر لوں گا۔"

اگر تم روک سکو تو مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔ میں نے اسے جھوٹے سپنوں میں الجھائے رکھا۔ میں چوری چوری اسے گھوڑوں پر سواری کے لیے بھیجتی۔ اسے تیر چلانا اور وہ سارے کرتب جو گڑھی کے ٹھاکر کو آنا چاہئیں سکھاتی رہی۔ میں نے اسے اندر سے نہیں باہر سے ٹھاکر بنا دیا۔ ایک تراشا اور گھٹن اور بنا محبت کے پلا ہوا بچہ۔ سہما ہوا ڈرا ہوا۔ ڈرایا دھمکایا بچہ وہ آزادی اور دل کہاں سے لاتا جو ٹھاکر بننے کے لیے ضروری ہے۔ وہ چپ ہو گئی جیسے کھو گئی ہو۔ ایک دوپہر جب رام سنگھ کے باز گڑھی کا چکر لگا رہے تھے اڑ رہے تھے تو تیج نے ان میں سے ایک کو اپنے تیر سے زخمی کر دیا۔ میں منع کرتی رہی اور اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے اپنے تیر کا صحیح نشانہ آزمانے کے لیے اس اڑتے باز کو نشانہ بنایا۔

دیواریں بھی کانپ رہی تھیں اور خوف سے سہمے ہوئے نوکر ان میں گھسے جاتے تھے جب رام سنگھ نے میرے آنگن کا دروازہ توڑ ڈالا۔ اس نے تیج کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا وہ چیختا رہا اور وہ اسے ٹھوکریں لگاتا رہا۔ ایسی گھڑیوں میں بھگوان سو جاتا ہے کیا؟"

بہت دیر تک اگنی دا خاموش رہی۔ تھکی ہوئی چڑیا کی طرح زور زور سے سانس کھینچتی ہوئی یادوں کے دیوں میں خون ملاتی ہوئی۔

جب بہو اسے دیکھنے آئی تو جانے رات کا کون سا پہر ہوگا۔ تیج رہ رہ کر چیختا تھا اور ڈر کر سسکنے لگتا تھا۔ ذرا سا بچہ ستار کے تنے ہوئے تار کی طرح ہوا سے بھی بج اٹھتا ہو۔ کوفت اور شرمندگی اور بے عزتی کے احساس سے روندے جانے ٹھکرائے جانے کی اذیت سے سوجے ہوئے چوٹ کھاتے ہوئے جگہ جگہ سے ابھرے ہوئے زخموں کی وجہ سے سو نہ سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ صرف خشک سسکیاں تھیں جن کو روکے ہوئے بیٹھی میں سنکائی کر رہی تھی۔ روشنی کی چبھن سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میں نے دیا بجھا دیا تھا۔ عجیب سنسناتی ہوئی بے تاب رات تھی۔ ناگن کی طرح پلٹ پلٹ کر جس کی تنہائی پلٹ پلٹ کر مجھے ڈستی تھی۔ تیج کا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا کوئی نہ تھا۔ ہم بھگوان کی اتنی بڑی دنیا میں اکیلے تھے اکیلے اور بھولے ہوئے۔ میں امر سنگھ کو اور بڑے ٹھاکر کو اور سارے گزرے ہوؤں کو یاد کر رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا

کوئی نہیں ہے کچھ نہیں ہے۔ میں اور تیج پاتال میں گھر گئے ہیں۔ بھگوان میں یہاں سے کیسے نکلوں۔ کسے پکاروں کسے آواز دوں۔ بہو نے دیا تپائی کے نیچے رکھ دیا۔ میں کھڑی ہو گئی۔

"اگنی دا تیج کا کیا حال ہے۔"

"اچھا ہے رانی ماں۔ ٹھیک ہے" بہو نے سر جھکا کر کہا۔

"اگنی۔ میں تمہاری بہو ہوں۔ تیج کی ماں ہوں۔ رانی ماں نہیں ہوں۔" بہو میرے پاؤں کے قریب بیٹھ گئی جو آ گیا رانی ماں میں نے اپنے پاؤں گھاگرے کی گوٹ کے اندر کر لیے۔ "تیج کی ذرا دیر ہوئی آنکھ لگی ہے اگر برا نہ مانیں تو آنگن میں چلیں وہ روشنی دیکھ کر جاگ جائیگا۔" ہم دونوں باہر آ گئیں۔

اگنی، اس میں میرا کوئی دوش نہیں تم نے تیج کو روکا ہوتا۔ ٹھاکر کے باز پر تیر کیوں چلایا۔"

"دیکھو بہو میں تمہیں دوش نہیں دیتی مگر تم شتاب اور مہتاب کی ماں ہو اس بنا ماتا پتا کے بچہ پر کچھ تو دیا کیا کرو۔ اسے جینے کا حق تو وہ تمہاری کرپا ہو گی۔ اگر تم اپنے پتی سے کہہ کر اسے کسی سکول میں بھجوا دو دیں جہاں پر امر سنگھ کو بھجوایا گیا تھا۔"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہیں چھڑایا۔ ٹپ ٹپ آنسو میری ان انگلیوں کے بیچ سے گرتے رہے۔ دونوں ہاتھوں کو بھگوتے رہے میں بنا بلے کھڑی رہی سالیبی ہی رات تمی کالی اور دکھ بھری گو بجوں سے کراہتی ہوئی۔

اگنی دا۔ تم کچھ بھول نہیں سکتیں مجھے تیج سے ملنے دو، اس کے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ یہ دیکھو میں یہ لائی ہوں" اس نے ایک ڈبیہ میرے ہاتھ میں دے دی۔

"جانے اس میں کیا ملا ہو۔ تمہارے پتی دیو کو پتہ چل گیا تو تیج کو جیتا نہ رہنے دیگا اسلیے تم یہ واپس لے جاؤ اور خود بھی جاؤ۔" میں نے اُسے اپنے آنگن سے تقریباً دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

تیج اچھا ہوا تو مجھے اُسے گڑھی سے باہر بھجوانے کی جلدی لگ گئی۔ میں نے آپ ہی آپ پرانے دنوں کی یادوں کے سمے۔ اس کے کپڑے اور دوسرا سامان ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ سامان جو کبھی میں نے ٹھاکر امر سنگھ کے لیے تیار کیا تھا۔ ایسا ہی سامان جو میں نے بڑے ٹھاکر کے لیے بنایا تھا۔ اپنے زمانوں میں میرا دل ہلکا ہوتا مگر اب بھاری اور ڈوبتا ہوا تھا۔

اگلی صبح اسے روانہ ہونا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں میں تیج کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی، جانے اب کب ملنا ہو اور ہو بھی سکے کہ نہیں۔ جینا اور مرنا تو بھگوان کے بس میں ہے پر میں پل پل مر رہی تھی۔ آج تک مر رہی ہوں۔ تیج کو اپنے سینے سے لگائے میں نے پرارتھنا کی تھی۔ بھگوان تو اس کی رکشا کرے گا۔ میں اسے تجھے سونپتی ہوں۔ چاروں دشاؤں میں طوفان اور ہوائیں اور بلوان دشمن ہیں۔ میرا اکیلا بچہ تیرے حوالے ہے بھگوان میرا یہ آنگن سُونا نہ ہونے دینا۔ یہ دیا جلتا رہے۔ امر سنگھ کا یہ نام مٹ نہ جائے۔ بھگوان تو نے مرت

بنائی ہے اور زندگی بھی۔ تو نے آشائیں دی ہیں اور ان کو پورا کرنے کا بھی نعود تیرے پاس ہے۔" پھر میں نے اور تیج نے مل کر مورتی کو پرنام کیا۔ میں نے آسن سے اٹھا کر سیندور کا ٹیکا اسے لگایا جیسا گرھی کے ٹھاکر اپنی پیچدار پگڑی پہنتے سمے لگاتے ہیں۔ امر سنگھ کی پگڑی اس کے سر پر رکھی تو اس نے کہا۔

"اگنی دا میں کسی شے پر وشواس نہیں رکھتا۔ نہ بدلہ لینے میں نہ گرھی کا سردار بننے میں اتنی لمبی چوڑی دنیا ہے اس میں مجھے بھیج رہی ہو تو وعدوں میں قید نہ کرو۔ اب ہم یہاں سے باہر کہیں ملیں گے تمھیں پتہ ہے میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ میں کس لیے واپس آؤں۔ اگنی دا، دیکھو رو کر نہیں اب ہنس کر مجھے وداع کرو اجے سر کی گرھی ہی تو ساری دنیا نہیں ہے؟ جانے کیا کیا تمھاری اور میری آنکھوں نے نہیں دیکھا جو ہے"

میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ یہ ذرا سا بچہ جو میرے سینے کے ساتھ لگ کر سوتا تھا اور جب بھوک لگتی تھی تو منہ بسور کر کھانا مانگتا تھا۔ یہ ایک دم اتنا بڑا اتنا سمجھ دار کیسے ہو گیا۔ یہ بڑی بڑی باتیں جو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آتیں اس نے کب کہاں سے سیکھی ہیں؟ میں نے تو اسے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

تمہیں پتہ ہے اگنی دا جب میں گھوڑوں کو بھگانے کے لیے باہر جاتا ہوں تو میں ہوا کے چکر میں اپنا پاؤں ضرور دھرتا ہوں۔ مہاراج کہتا ہے کہ اس چکر میں پاؤں دھرنے والا ہوا کے جادو کے زور سے باقی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے خوب گھومتا ہے مسافر بنا رہتا ہے۔"

"بھگوان میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔" تو یہ مہاراج تھا جس نے میرے تیج کو ہوا کے چکر میں پاؤں دھرنے کا بتایا تھا:

"یہ چکر کیا ہوتا ہے" کرنل نے پوچھا۔

"صحرا میں رہنے والوں کے اپنے وہم ہیں:" میں نے اگنی دا کی جگہ جواب دیا" ہر جگہ کے چھوٹے چھوٹے وہم ہوتے ہیں شگون اور اشارے"۔

تیج اسکول سے کبھی واپس نہیں آیا۔ چھٹیاں ہوتیں تو وہ اپنے کسی استاد کے ساتھ پہاڑ پر بھجوا دیا جاتا سردیاں ہوتیں تو وہیں پڑھائی کی کمی پوری کرنے کے خیال سے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹکا رہتا۔ میں بولائی ہوئی دیوانوں کی طرح اپنے آنگن کے اندر دالانوں میں اور دالانوں سے باہر چھت پر نیچے پھرتی رہتی۔ آس لگائے لگائے راہ دیکھتے دیکھتے سول پر لٹکے لٹکے مجھے نیند بھی نہ آتی لمبی دوپہروں کو جب سوچیں میرا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ ہے بھگوان اب کیا ہو گا؟ کبھی تو، کبھی تو سکھو اور تیج مجھے آن ملیں گے۔

جب اسے سرکی گرلمعی کے باہر ایک سنسان رات میں تیج مجھے ملا ہے۔ تو اسے دیکھتی رہ گئی "تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ گھر چلو۔ میرے سُونے آنگن میں بہار آئے۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہی ہوں۔

"اگنی دا"۔ اس نے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور تمہارے آنگن میں سما نہیں سکتا۔ تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ تم سوئد بیر ہو۔ اب تم مجھے کس آنگن میں لیے جاتی ہو۔"

وہ اتنا بڑا۔ ایک دم عقلمند ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ میں اس کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی، کھڑی رہی۔ اس کے پسینے کی سوگندھ اس کا بھرا ہوا جسم یہ سب میرے تھے۔ ہاں میں اب اس پر مان کر سکتی تھی۔ شتاب اور مہتاب کی ماں نہیں ہو نہیں۔ میں تیج کی ماں تھی۔ وہ مجھے کمزور بچہ سمجھ کر میرے سفید بالوں پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میرے ماتھے اور گالوں کو چوم رہا تھا مجھے گھڑی گھڑی اپنے سے لگا رہا تھا۔ تیج میرا بچہ تھا۔ میرا اپنا تھا۔

"تیج! میرے بچے آخر تم کہاں جا رہے ہو۔" جب اس نے مجھے اپنے سے الگ کیا تو میں نے پوچھا۔

"یہ گھمبیر، بڑی اور گہری رات ہے اس میں کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس میں کیا ہے۔ نہیں معلوم نہیں بس میں یہی کھوجنے نکلتا ہوں۔ دا، انجانے کا جادو، ہوا کا جادو، زور سے ٹکر لینے کا جادو مجھ کو گھیرے ہوتے ہے۔" اس نے مجھے پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"مجھے بہلاؤ نہیں تیج۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو۔ راتوں کو کہاں گھومتے ہو۔ کچھ مجھے جاننے کا ادھیکار ہے۔ ہے کہ نہیں"۔ میں نے پوچھا تھا۔

اس نے ہنس کر کہا تھا۔ "سارے ادھیکار تمہارے ہیں مگر ان سوالوں کے جواب کسی اور وقت دوں گا۔ جب کبھی پھر ملیں گے۔ صرف یہ کہتا ہوں کہ جب میرے زخموں کے نشان ابھرتے اور دکھتے ہیں۔ جب ان میں پھر سے ٹیسیں اُٹھتی ہیں تو میں ان لوگوں کے لیے دوا کھوجتا ہوں جو دُکھی ہیں اور جن کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ میرے لیے کسی گڑھی کی ضرورت نہیں، کسی نیلے ہیرے کی ضرورت نہیں۔"

"بے کار کی باتیں"۔ کرنل نے چٹائی پر اپنا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مجھے تیج نے یہی کہا تھا۔ تب سے اب تک۔ اس گھڑی تک جانے کتنا سمے بیت گیا ہے۔ میری اور اس کی بھینٹ کہیں نہیں ہوتی۔"

"میں تمہارے تیج کو ڈھونڈتا تو پھر رہا ہوں۔ کرنل نے بات ختم کی ہی تھی کہ گولی چلنے کی آواز آئی ہم نے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ بندوقیں اٹھائیں اور باہر کی طرف بھاگے۔ ستاروں کا غبار روشن اور زیادہ چمکنے والے تاروں کے درمیان آبشار کی طرح ہمارے سروں پر گر رہا تھا۔ جال میں سوتی ہوئی

چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں۔ بے چین ہو کر جاگ اٹھی تھیں، کہیں جنڈ اور کریں کی خشک ٹہنیوں پر پانی کے کھارے ٹڈوں نے اپنی چرچر پھر شروع کر دی تھی۔

بھاگتے قدموں، اونٹوں کے بلبلانے اور گولیوں کی ہر طرف سے آوازیں گھوم پھر کر سناٹے کو توڑ رہی تھیں۔ ہوا جس رخ چلتی آواز اُدھر ہی پلٹتی تھی۔

ہمارے پیچھے سے اگنی دا کی آواز گونجی۔ "تیج ٹھاکر میں یہاں ہوں۔ تمہاری اگنی دا۔"

ہمارے ہاتھ بندوقوں پر جم گئے۔ سانس رُک گئی۔ جس طرف سے آواز ابھرے گی ہم اُدھر ہی نشانہ باندھیں گے۔

اور ہم ٹھیک ہی منتظر تھے۔ ٹوبے کے کنارے سے کسی نے زور سے کہا۔

"اگنی دا۔ سورگ میں۔" اس سے پہلے کہ ہم شست باندھتے بات ختم ہو گئی۔

رنہال پوسٹ پر جس اگنی دا کو ہم نے دشمن کے سپاہیوں کے حوالے کیا اس کا وزن چڑیا سے بھی ہلکا تھا۔ بند آنکھوں کے گرد عجیب مسکان تھی۔ بے دانتوں کا چہرہ بھرا بھرا تھا اور گلابی جیسے بھور کا مکھ ہو۔ الجھنے کے اور ہوا کے چکروں میں جانے کون قید تھا اور کون آزاد تھا۔ سورگ کہیں ہے بھی کہ نہیں۔

OO

سلسلۂ مضامین

اکیسویں صدی میں جدید اردو افسانے کے تخلیقی نقوش

—— مبین مرزا

—ا—

اکیسویں صدی کے ابتدائی دس بارہ برسوں کے اردو ادب کے تجزیے کا یہ سوال بالعموم اور افسانے کے جائزے کا بالخصوص کئی اعتبار سے غور طلب اور اہم ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی یہ صدی اپنی کیفیت، رجحان اور آثار کا بالکل الگ نقشہ اپنے اوائل ہی سے ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اس کے ابتدائی برسوں میں رونما ہونے والے انسانی مسائل کو دیکھتے ہوئے آج اس حقیقت کو سمجھنا ایسا دشوار نہیں کہ یہ نقشہ دراصل اُنھی خواہشوں اور خوابوں کی عملی تعبیر سے ترتیب پا رہا ہے جن کا اظہار پہلے بیسویں صدی کی دوسری عالمی جنگ میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر بہیمانہ بمباری سے ہوا اور اس کے بعد پانچویں دہائی میں اسرائیل میں صہیونی بستیوں کی نئی آبادکاری سے ہوتے ہوئے نویں دہائی کے اواخر میں سوشلسٹ نظام کے انہدام تک بتدریج جن کی صورت واضح ہوئی تھی۔

اس کے بعد نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاح وضع ہوئی جس کی گونج گزشتہ صدی کے آخری عشرے میں چار دانگ عالم میں سنی گئی۔ جڑواں ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کی تباہی سے، افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ کی یورش اور لیبیا اور مصر کے بعد اب شام میں حکومتوں کی تبدیلی میں پس پردہ کام کرنے والے سی آئی اے، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے کردار اور اس صدی کے بارہویں برس کے اختتام تک پاکستان میں جاری امریکی ڈرون حملوں تک نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاح اپنے معانی تہ در تہ منکشف کیے جاتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج ہم انسانی تاریخ کی اس صدی میں جی رہے ہیں جو ایک طرف تسخیر کائنات اور انسانی امنگوں کی تکمیل میں ماقبل زمانوں سے ہزار فرسنگ آگے ہے تو دوسری طرف فطرت اقتدار میں ظاہر ہونے والی وحشت، بربریت اور سفاکی کے لحاظ سے بھی تاریخِ عالم کا کوئی دوسرا دور عصرِ حاضر سے آنکھ ملانے کی تصور تک نہیں کرسکتا۔

چنانچہ اس دور میں عامۃ الناس کی تالیفِ قلب ہی کے لیے نہیں بلکہ انسانی تمدن کی تاریخ کے سفر کو

باطل ہونے سے بچانے اور انسانیت پر اپنے اعتبار کو قائم رکھنے کے لیے بھی تہذیبی اوضاع اور ثقافتی مظاہر پر نگاہ رکھنا ناگزیر ہے۔ جملہ فنونِ لطیفہ اور خصوصاً ادب کے توسط سے ہمیں یہ نگاہ فراہم ہی نہیں ہوتی بلکہ نگاہ رکھنے میں بھی یہ ہماری کفالت کرتے ہیں۔ چنانچہ اکیسویں صدی کے ان دس بارہ برسوں میں ادب کی صورت حال کا جائزہ اسی طرح کی ایک بامعنی کوشش سے عبارت ہوگا۔ یہ کوشش اس لحاظ سے بھی اہم اور معنی خیز ہو سکتی ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں اپنے ادب اور اس کی عصریت ہی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع نہیں ملے گا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی طرزِ احساس کے زمین میں جڑ پکڑنے والے رجحانات کا شعور بھی ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ جو آج اس کے قلب و نظر کی فضا کو متغیر کر رہے ہیں اور جن کے توسط سے آنے والے ادوار کے انسانی مزاج کی بھی کسی نہ کسی درجے میں پیش بینی کی جا سکتی ہے۔ یوں اس مطالعے اور تجزیے کی بنیاد پر ہمیں اپنے امروز ہی کے نہیں، فردا کے خط و خال کا بھی اندازہ ہو پائے گا اور یہ اندازہ مستقبل کی انسانی صورت حال کے بہتر شعور کی بنیاد بن سکتا ہے۔

ادب کا معاملہ یوں تو افراد، اشیاء، عناصر اور عوامل کے براہ راست اظہار سے نہیں ہوتا، لیکن وہ جو ناول اور افسانہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سطح پر زندگی نامہ ہوتے ہیں، اس رو سے دیکھا جائے تو اس دورانیے کے ادب اور بالخصوص افسانے کی صورت حال ہمیں اس عہد میں انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے ارتعاشات کی نوعیت، کیفیت اور اس عہد کے انسان کے دل و دماغ پر اُن کے اثرات سے آگاہ کر سکتی ہے۔ اس طرح ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ اس عہد میں انسانی تہذیب و تمدن کے مظاہر کے عقب میں، دراصل کون سے محرکات کارفرما ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اس نوع کے مطالعے کے توسط سے یہ بھی جاننے اور سمجھنے کا موقع مل سکتا ہے کہ نئے انسان کے ذہنی رجحانات اور اس عہد کی سماجی اقدار کی تشکیل میں کون سے عناصر کس نوع کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ آج کے انسان کا شعور کن تغیرات سے گزر رہا ہے اور اس کے احساس کا منطقہ اب کس حد تک اُس کے تجربات سے روشن ہے، اور یہ بھی کہ شعور و احساس کے مابین ترسیل و ابلاغ کا عمل عہدِ جدید کے انسان کی زندگی میں کس نہج اور کس سطح پر ہو رہا ہے۔ غرض یہ اور ایسے ہی کچھ اور سوالوں کی تفتیش اس مطالعے کے ذریعے کی جا سکتی ہیں۔

تاہم اس موضوع پر کام کرنے سے قبل ہمیں اس بات پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ کیا اس تفتیش کے ذریعے حاصل ہونے والے نتائج واقعی اور پوری طرح قابل اعتبار ہوں گے؟ اس سوال کا جواب اگر واضح طور پر اور کلیتاً نفی میں نہ ہو تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اس مطالعے سے حاصل کردہ نتائج ہمارے کس کام آئیں گے؟ یہ دونوں سوال بے حد اہم ہیں اور ہماری اس تفتیش و جستجو کی ضرورت اور اہمیت کا تعین کرتے ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب چونکہ سیدھا اور دو ٹوک ہے، سو اسی کو پہلے

دیکھتے ہیں۔ اس مطالعے کی بابت، جیسا کہ ہم نے سوچا کہ اس کے ذریعے حاصل ہونے والے نتائج ہمیں اپنے عہد کی انسانی صورت حال کو عقلی، جذباتی اور روحانی سطح پر دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کریں گے، یوں ہم جان پائیں گے کہ آج انسانیت اور اس کی تہذیب کس مرحلے میں ہے اور آئندہ اُسے کیا مراحل پیش آنے جا رہے ہیں۔ گویا اسے ایک لحاظ سے انسانیت اور اس کی اقدار کی بقا کے سوال کی تفتیش کہا جا سکتا ہے۔ اب آئیے پہلے سوال پر۔ ادب اور اس کا کسی بھی طرح کا مطالعہ ہمیں براہِ راست جوابات یا نتائج فراہم نہیں کرتا، کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ یہ ادب کا منشا اور مصرف ہوتا ہی نہیں۔ البتہ ادب سے ہمیں جو کچھ شعور اور احساس کی سطح پر حاصل ہوتا ہے، وہ بے مصرف اور بے اعتبار نہیں ہوتا۔ تاہم یہاں ایک بنیادی نکتے کو ہمیں واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے اور اس کا تعلق ہے ادب کے مخصوص اور محدود زمانی تناظر سے۔

تقویم ماہ و سال کے مختصر ضابطے کو بنیاد بنا کر ادب کے سنجیدہ مسائل اور عمیق رجحانات کا کوئی فکر افروز اور جامع مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب میں رویوں، رجحانات، طرزِ احساس اور اسالیب کی تشکیل اور ظہور کا عمل اپنی خارجی سطح پر خواہ کتنا ہی سادہ نظر آتا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسانی احساس اور اس کے اظہاری سانچوں کی تہہ میں یہ عمل خاصا پیچیدہ ہوتا ہے۔ تشکیل وظہور کے اس عمل کے محرکات عام طور سے بہ یک وقت کئی ایک ہوتے ہیں۔ مزید برآں، یہ ضروری نہیں کہ اُن سب کا باہمی تعلق ہو یا اُن میں تطبیق کا رشتہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ ان میں کچھ محرکات ایک دوسرے کی ضد پر قائم ہوں اور اس تضاد یا تصادم سے وہ طرزِ احساس پیدا ہو جو کسی رویے، رجحان یا اسلوب کا جواز ٹھہرے۔ چنانچہ ادب میں رجحانات اور اسالیب کی تبدیلی کو سمجھنے کے لیے اُن کے محض خارجی دائرے اور ظاہری سطح پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ ان کے داخلی عوامل اور تہ نشین عناصر کی تفتیش، تفہیم اور تجزیہ بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔

تو کیا ایک زمانی تناظر کو ادب کے مطالعے کی بنیاد ہی نہیں بنایا جا سکتا؟ یہ سوال یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہم کسی خاص عہد کے سیاق میں ادبی رویے، رجحان، طرزِ احساس اور اسلوب کے تغیرات کا مطالعہ کرنا چاہیں تو اس کے مخصوص تقویمی ضابطے کے تعین کے بغیر یہ کیونکر ممکن ہوگا؟ اصل میں یہی بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب کے مطالعے میں تقویمی ضابطے یا زمانی تناظر کی ممانعت تو بہر حال نہیں ہے، بلکہ یہ تک تسلیم کرنے میں باک نہیں ہونا چاہئے کہ اس نوع کے مطالعے بھی ایک حد تک اور ایک رخ سے ادب کی تفہیم میں اپنا محدود اور ایک طرح سے مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ذریعے ادب کے عصری مسائل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس امر کو سمجھا جا سکتا ہے کہ اپنے عہد کی انسانی اور تہذیبی صورتِ حال کے حوالے سے وہ کتنے زندہ سوالوں کا سامنا کر رہا ہے اور انسانی تجربے کی

سچائی کو سہارنے کی کتنی سکت رکھتا ہے؟ یہ اُن دو تین بنیادی سوالوں میں سے ایک ہے جو کسی عہد کے ادب کی قدر و قیمت کے تعین میں سب سے پہلے پوچھے یا دیکھے جاتے ہیں۔

گویا زمانی تناظر کا سوال نقدِ ادب کے زمرے میں نہ صرف یہ کہ ممنوعات میں نہیں آتا بلکہ ایک حد تک مفید مطلب بھی ہوتا ہے۔ البتہ جب ہم ادب میں اُن تبدیلیوں کی تفتیش کرتے ہیں جو انسانی شعور میں ہونے والے تغیر کا اظہار کرتی ہیں، یا تہذیبی اوضاع اور اقدار میں تبدل کا اشارہ دینے والے ادبی مظاہرہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ادب کے زمانی تناظر کا سوال ثانوی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایسے سوالوں پر غور کرتے ہوئے وقت کی اکائی مہینوں یا برسوں والی نہیں رہتی بلکہ اس ضمن میں چھوٹی سے چھوٹی اکائی بھی دہائیوں کے اسکیل پر طے ہوتی ہے۔ یوں تقویمِ ماہ و سال کا ضابطہ ادب کے بڑے سوالوں اور ہمہ گیر رجحانات کو سمجھنے میں کچھ اس طرح مؤثر نہیں رہتا جیسے ادب کے سال بہ سال لیے جانے والے اخباری جائزوں میں۔ تاہم حقیقت احوال کے مکمل اظہار کے لیے یہاں اس امر کی نشاندہی میں چنداں مضائقہ نہیں کہ سالانہ ادبی جائزوں کی بدعت کے فروغ کا سہرا صرف اخبارات کے سر نہیں باندھنا چاہیے، اس کام میں اُن پروفیسر حضرات کا بھی معتدبہ حصہ ہے جو ادب کی تفہیم کے لئے سال بہ سال دائرے بناتے اور ان میں اپنے پسندیدہ ناموں کے حاشیے چڑھاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ادیبوں، شاعروں کے ناموں کی کھتونی اور کتابوں کے شماریاتی قسم کے حوالے ادب کے بحرِ ناپیدا کنار میں تموج پیدا کرنے والے سوالوں کو نپٹانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تنقید میں ابتذال پسندی کا جیسا مظاہرہ ایسے جائزوں اور ایسی ادبی تاریخوں میں دیکھنے میں آتا ہے، وہ ہماری تنقیدی ندامتوں کا ایک الگ باب ہے اور اپنی مثال آپ۔

بہر حال، ہم بات کر رہے تھے، محدود زمانی تناظر کے ادب میں نمایاں ہونے والی تبدیلیوں کی۔ اب تک کی گفتگو سے ہم چند نکات کو واضح طور پر طے کر سکتے ہیں۔ اول، اس نوع کی تبدیلیاں ادب کی سطح پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ دوم، ان سے کچھ نتائج بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں، جو بذاتہ قابلِ اعتبار بھی ہوں گے۔ سوم، اس لیے انھیں عصری انسانی احوال اور تہذیبی اقدار کے دائرے میں ظاہر ہونے والے تغیر کو سمجھنے کا ذریعہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ چہارم، یہ تبدیلیاں عصری شعور اور زمانے کے مسائل کے ادراک کے لیے مفید ہو سکتی ہیں، لیکن انھیں ادب و تہذیب کے مجموعی ضابطے میں رونما ہونے والی تبدیلی کی تفہیم کی بنیاد نہیں بنایا جانا چاہیے اور نہ ہی انھیں قائم بالذات اقدار پر حکم بنایا جانا چاہیے۔

یہاں ضمناً اور بر سبیل تذکرہ اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ اکیسویں صدی میں ادب کی صورت حال کے اس مطالعے کا مقصد ادیب سے کسی طرح کے مطالبے کا اظہار ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مطالعے اور جائزے کے ذریعے ادیب کو ایسا کوئی چارٹر آف ڈیمانڈ پیش نہیں کیا جا رہا ہے کہ اُسے

بہرصورت اپنے زمانے اور اُس کے مسائل سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتا ہے، یا پھر یہ کہ اُسے ثابت کرنا ہے کہ اُس کے عہد کے حالات نہ صرف اُس کی نظر میں ہیں، بلکہ اُن کے بارے میں وہ سنجیدگی سے سوچتا اور انہیں ہر ممکن اپنے فن کا حصہ بناتا ہے، تاکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچے کہ وہ ایک زندہ اور سنجیدہ ادیب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف نہ صرف یہ کہ اس انداز سے اور ان اصطلاحوں میں خود سوچتا نہیں، بلکہ وہ ایسے کسی بھی فرمائشی پروگرام کو سراسر لغو سمجھتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب حالات، سماج یا حکومت یا کسی سیاسی و نظریاتی پارٹی لائن کے خارجی مطالبے پر تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو سراسر کسی تخلیق کار کا داخلی اور فطری داعیہ ہوتا ہے جو اُس کے فن اور نگارش کا جواز بنتا ہے۔ پارٹی لائن یا خارجی مطالبے پر جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، اُس کا معتد بہ حصہ trash کی صورت میں سامنے آتا ہے اور بالآخر تاریخ کے کوڑے دان میں جگہ پاتا ہے۔ اس لیے کہ اُس کی نہاد میں فن کار کے داخلی تقاضے اور باطنی احساس کا وہ لمس نہیں ہوتا جو کسی تحریر کو ادب بناتا ہے اور دیگر سماجی اور افادی نوع کی تحریروں سے الگ کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ترقی پسند تحریک اور اس کی پارٹی لائن کے زیر اثر پیش کیا جانے والا وہ تحریری انبار ہے جسے کبھی ادب عالیہ کے غلغلے کے ساتھ ابھارا جاتا تھا لیکن پھر وقت کے عمل نے اُسے ایسا کوڑا ثابت کیا کہ آج اُس کی طرف کسی کی اچٹتی ہوئی نگاہ بھی نہیں جاتی۔ استثنیٰ کے اصول کا اطلاق ترقی پسندوں پر بھی ہوتا ہے، پر یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی داخلی آواز اور سچے انسانی اور فنکارانہ احساس کو اپنے فن میں ڈھالا۔ فیض کی شاعری، عزیز احمد کے فکشن اور سجاد ظہیر کے مطالعۂ بیدل کو ایسے ادب کی مثالوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

خاطرنشان رہے کہ یہاں ادب اور ادیب کے عصری رجحان کی نفی بھی کسی طور پر مقصود نہیں۔ ہر عہد کا ادب اپنی عصریت کی بھی ایک جہت رکھ سکتا، بلکہ رکھتا ہے — اور اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ ایک سطح پر تو بلکہ اس کی اپنی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہاں صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ کوئی مخصوص زاویہ اور محدود دائرہ مقرر کر کے ادب تخلیق کرنے یا اپنے وقت کے فیشن کا بار ڈھوتی تحریروں کو ادب کے نام پر پیش کرنے سے ادب کو بذاتہٖ گزند پہنچتی ہے، وہ یوں کہ اس طرح اس کی سطح پست اور تاثر مبتذل ہو جاتا ہے۔

—۲—

اب آیئے اکیسویں صدی کے ان دس بارہ برسوں میں تخلیق کیے گئے افسانوی ادب کے مطالعے اور جائزے کی طرف۔ اس ضمن میں ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ اگر ہم یہ جاننا اور دیکھنا چاہیں کہ اس عرصے میں افسانوی ادب کے اہم رجحانات کیا رہے ہیں اور آیا وہ موضوعاتی، اسلوبیاتی اور فکری سطح پر کسی طرح کی تبدیلیوں کا اظہار کر رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اہم رجحانات یا تبدیلیوں کو جاننے اور سمجھنے کا طریقہ کیا ہوگا؟

اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جس عہد کے ادب کا مطالعہ مقصود ہو، اُس کے نمائندہ ادیبوں کے کام کو، یعنی اس عرصے میں شائع ہونے والی اُن کی کتابوں کو فرداً فرداً سامنے رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ براہ راست اور نسبتاً آسان نوعیت اور اسلوب کی سطح پر کس قسم کی تبدیلیوں کا سراغ دیتی ہیں۔ یہ کام براہ راست اور نسبتاً آسان نوعیت کا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس مطالعے کے لئے افراد کے بجائے ان مسائل، عناصر، عوامل اور محرکات کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اُن پر اس تجزیے کی بنیاد رکھی جائے جو اُس عہد کے ادب میں اسالیب، بیانیے، موضوعات، اشارات، علامات، کنایات اور استعارات وغیرہم میں کسی نہ کسی سطح پر تغیر و تبدل کا باعث بنے ہیں، اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ اس عہد کے انسانی شعور پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں اور ان کے اثرات کا اظہار انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کس طور منعکس ہوا ہے۔

یہ کام ذرا پیچیدہ اور قدرے دشوار تو بے شک ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ دیکھا جائے تو اصل میں یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں پورے ایک عہد کو اس کی کلیت میں بہ یک وقت عقلی، جذبی اور روحانی جہتوں کے ساتھ سمجھنے کا موقع فراہم کرسکتا ہے۔ اس طرح ہم ایک عہد کے اجتماعی شعور، اس کے تہذیبی ضمیر اور روحِ عصر سے آگہی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہیں نہیں بلکہ غور کیا جائے تو فطرت انسانی کو انفرادی درجے سے لے کر اجتماعی دائرے تک بہ یک ساعت گرفت کرنے کا موثر منہاج بھی یہی ہوسکتا ہے۔ سو اس مضمون میں مؤخر الذکر طریقے ہی کو بروئے کار لاتے ہوئے اکیسویں صدی کے عشرۂ اولیں میں اردو افسانے کی صورتِ حال، فکری مسائل اور اسلوبیاتی تجربات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی، تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ اس زمانی تناظر میں ہم عصر اردو افسانے کے تخلیقی نقوش کس نہج پر اُجاگر اور کس درجہ روشن ہو کر سامنے آتے ہیں۔

اکیسویں صدی کا آغاز ہی، جیسا کہ عرض کیا گیا، دہشت، بربریت، اور جنگ و جدل سے ہوا۔ تاہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جانا چاہئے کہ افراد کی طرح ادوار یا زمانے بھی isolation میں ظہور نہیں کرتے اور نہ ہی اُن میں رونما ہونے والی تبدیلیاں آناً فاناً یا شب آفریدہ ہوتی ہیں۔ افراد کے رویوں کی طرح زمانے کا مزاج بھی مختلف عوامل کے زیر اثر اور درجہ بدرجہ ترتیب پاتا اور تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے۔ لہذا اکیس ویں صدی کے اولین عشرے کے سیاسی، تہذیبی اور سماجی رجحانات جو آج کی انسانی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں یا اُس کی صورت گری کر رہے ہیں، اُنہیں اس وقت تک بہتر انداز سے سمجھا ہی نہیں جاسکتا جب تک گزشتہ صدی کی کم سے کم دو دہائیوں کے حقائق ہمارے پیش نظر نہ ہوں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ادب کے مطالعے کے ضمن میں بھی ملحوظِ خاطر رہنا ضروری ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں ادب کی کسی صنف میں ہونے والے کام کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بیسویں صدی کے آخری برسوں کو

بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا۔

اس تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم جان پاتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ ہے جب ایران انقلاب سے گزر چکا، روس افغانستان سے برسوں جنگ میں رہنے کے بعد بالآخر شکست تسلیم کر چکا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ روس کے گھٹنے ٹیکنے کے بعد افغان قبائل اب آپس میں طاقت کے کھیل میں مصروف ہو چکے، عراق کی کویت پر مسلح جارحیت بھی اپنے منطقی نتائج کو پہنچی، سوشلسٹ روس جو دنیا کی دوسری بڑی طاقت تھی اور نظامِ عالم میں کسی نہ کسی طور اس کا طاقت کے توازن میں ایک کردار بھی تھا، اب اُس کے انہدام کے بعد دنیا یک قطبی ہو چکی اور ایران امریکہ کے مابین حربی قوتوں کا ٹکراؤ ختم ہوا۔ یہاں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ واقعات برسوں پرانے ہو چکے، لیکن اقوامِ عالم کی صورتِ حال بتا رہی ہے کہ ان کے اثرات کا دائرہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا ہے۔

اسی دوران پاکستان چاغی میں چھ ایٹمی دھماکے کر کے اپنے ایٹمی قوت ہونے کا اعلان بھی کر ڈالتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں ممالک کی اسٹریٹجک پوزیشن اور عالمی طاقتوں کے مفادات نے پہلے ہی یہاں کے حالات دگرگوں کیے ہوئے تھے۔ ان دھماکوں کے نتیجے میں ہندوستان پاکستان کے مابین صورتِ حال، جو پہلے بھی اچھی نہ تھی، اب تو باقاعدہ اور سخت کشیدہ ہے۔ ایسے میں یہ دونوں ممالک ہی نہیں بلکہ عالمی برادری بھی جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ یہی نہیں، حالات کا دباؤ یہ خطرہ بھی محسوس کرا رہا ہے کہ اب چھڑنے والی جنگ محض مقامی یا علاقائی نہیں ہوگی، اس کے عالمی جنگ میں تبدیلی ہونے کا خاصا امکان ہے، اور خوف یہ کہ ایسا ہوا تو یہ دونوں عالمی جنگوں سے بدرجہا مہلک اور تباہ کن جنگ ہوگی، اس لیے کہ جوہری ہتھیار اب دونوں طرف ہیں۔

یہ وہ مرحلہ ہے جب ہم اپنے ادب اور خصوصاً افسانے میں ایک بار پھر ادیب کی سماجی ذمے داری اور عصری تقاضوں کے شعور کو پوری طرح بیدار ہوتے اور بروئے کار آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی صفِ اول سے انتظار حسین کا افسانہ ''مورنامہ'' شائع ہوتا ہے۔ حکایت اور علامت کے امتزاج سے تخلیقی اسلوب پانے والا یہ افسانہ جنگ اور اس کے زیرِ اثر تخریبی سائیکی کو موضوع بناتا ہے۔ انسان کے اندر تخریب اور شر کے عنصر کی نشاندہی کرتا ہے اور اُن حالات کو بیان کرتا ہے جن کے دباؤ میں جنگ کرنے والے کسی مرحلے پر رُک کر تحمل سے وقت کی ضرورت اور احوال کی نزاکت کو سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تب ورثہ، عزت، راحت کچھ باقی نہیں بچتا۔

> جنگ آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اشوتھاما کو دیکھو اور عبرت کرو۔ درونا چاریہ کا بیٹا۔ باپ نے وہ عزت پائی کہ سارے سورما کیا کورو کیا پانڈو، اس کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے، چرن چھوتے تھے۔ بیٹے نے باپ سے ورثے میں کتنا

کچھ پایا مگر یہ ورثہ اسے پچا نہیں۔ اس جنگ کا سب سے ملعون آدمی آخر میں یہی شخص ٹھہرا۔

اس ذلت اور ندامت کا اہم ترین سبب جنگ کی وہ مخصوص فضا اور اس کے زیر اثر رو بہ کار آنے والی سائیکی ہے، جس کا شدید ترین اظہار، فتح وشکست سے قطع نظر جنگ کے اُن لمحات میں ہوتا ہے، جو فیصلہ کن یا نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ بقول انتظار حسین:

> جنگ کے آخری لمحوں سے ڈرنا چاہئے۔ جنگ کے سب سے نازک اور خوف ناک لمحے وہی ہوتے ہیں۔ جیتنے والے کو جنگ کو نمٹانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہارنے والا جی جان سے بیزار ہوتا ہے تو وہ خوف ناک ہتھیار جو بس دھمکانے ڈرانے کے لیے ہوتے ہیں آخری لمحوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بے شک شہر جل کر ہیروشیما بن جائے دل کی حسرت تو نکل جاتی ہے۔ جنگ کے آخری لمحوں میں دل کی حسرت کبھی جیتنے والا نکالتا ہے، کبھی ہارنے والا۔ کروکشیتر میں آخر میں دل کی حسرت اشوتھاما نے نکالی اور برہم استر پھینک مارا۔

جنگ، اُس کی کیفیت اور اثرات پر گزشتہ بارہ پندرہ برسوں میں ہمارے متعدد لکھنے والوں نے توجہ کی ہے۔ موضوع کی اہمیت اور وقت کی ضرورت اپنی جگہ تاہم ادب کے سروکار اور اس کے طریقِ اظہار دونوں ہی سطحوں پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مستقل نوعیت کی شے بنیاد میں کارفرما ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مسئلہ چاہے کتنا ہی time binding کیوں نہ ہو، ادب میں بیان کی سطح پر آتے ہوئے اس کا timeless عنصر بہر حال نمایاں ہو جاتا ہے۔ دراصل یہی وہ شے ہے جو صحافتی رپورٹنگ اور ادب کے مابین امتیاز قائم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خبر پرانی ہو کر obsolete اور کبھی تو مضحکہ خیز یا گمراہ کن ہو جاتی ہے، جبکہ ادب نہ صرف یہ کہ پرانا ہو کر بیکارِ محض نہیں ہوتا، بلکہ اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ بڑے ادب کی معنوی تہیں آنے والے ادوار میں کھلتی ہیں جو بعد کے زمانوں سے اُس کی relevance کو اجاگر کرتی ہیں۔ خیر، ہم بات کر رہے تھے عصرِ حاضر میں جنگ اور اُس کے اثرات و کیفیات کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں کی۔ یہاں اس موضوع پر لکھے گئے، تمام افسانوں کا جائزہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اُس کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ہم اس موضوع کے ضمن میں اردو افسانے کا اشاریہ مرتب نہیں کر رہے۔ ویسے بھی یہ کام تنقید کا نہیں ہے، ہاں مدرسین نقادوں اور محققوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تنقید تو ایک عہد کی ذہنی کیفیت کو اس کے اظہار کی اعلیٰ سطحوں پر دیکھتی ہے اور اُن کی بابت کلام کرتی ہے۔ سو ہم اس ضمن میں دو ایک افسانہ نگاروں کی نگارشات پر اور نگاہ ڈالتے ہوئے آگے چلیں گے۔

اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جنگ کے حوالے سے جیلانی بانو کا افسانہ ''عباس نے کہا'' بھی غور طلب ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس افسانے کے ڈسکورس میں جنگ کے دونوں معانی روشن کیے گئے ہیں، ایک جسے ہم جنگی جنون اور انسان دشمنی کہیں گے اور دوسرا بقا اور مقاومت کا سوال۔ دیکھا جائے تو کسی بھی جنگ کے یہ دونوں پہلو بیک وقت غور طلب ہوتے ہیں۔ ایک فریق غلبے کی خواہش کے ساتھ بربریت کا اظہار کرتا ہے، جبکہ دوسرا ایسا اوقات نخواہی اس جنگ کا حصہ بنتا ہے کہ اُس کے پاس اب بقا کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے — یہ کہ وہ مغلوب نہ ہو۔ جیلانی بانو کے افسانے کی فضا میں جنگ کی قیمت چکاتے ایک کردار (عباس) کا یہ فقرہ ''بش نے میرے ہاتھ کاٹ دیے ہیں، مگر میں اُسے لات مار سکتا ہوں۔'' دراصل بقا کے سوال سے جڑی مقاومت کی ضرورت کا اظہار ہے۔ اپنے مکانی تناظر میں یہ افسانہ عراق کی سرزمین کا نقشہ ابھارتا ہے جہاں یک قطبی دنیا کی بدمست سپر پاور نے جھوٹ اور فریب کو بنیاد بنا کر جنگ مسلط کی تھی۔ تاہم افسانہ نگار کی فنی گرفت اسے دوسری طرف ایران کے مذہبی و ثقافتی منظرنامے سے بھی مربوط کرتی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ارضِ خدا کے ہر اُس گوشے سے مربوط کرتی ہے جہاں مذہب اور اُس کی پاسداری کا احساس تصورِ حیات کا جزوِ اعظم ہے۔ اس افسانے میں کردار اور اُن کا مزاج انہیں کربلا کی تلمیحاتی، تشبیہاتی اور استعاراتی فضا سے بھی جوڑ دیتا ہے اور یوں اس افسانے کی معنویاتی توسیع ہو جاتی ہے۔ ویسے کربلا جیلانی بانو کے یہاں ایک اہم اور مستقل حوالے کا درجہ رکھتا ہے۔ اُن کے ایک اور افسانے ''دشت کربلا سے دور'' میں بھی یہ حوالہ ایک معاشرے میں سول وار کی صورت حال کو استعاراتی سطح پر خوبی سے بیان کرتا ہے۔

امریکہ عراق جنگ (حالانکہ اسے امریکہ کی عراق پر جنگی جارحیت کہا جانا چاہیے) کے پس منظر خالدہ حسین کا افسانہ ''ابن آدم'' بھی تخلیقی اور فکری دونوں لحاظ سے ایک اہم اور غور طلب بیانیہ ہے۔ سرتاسر سیاسی مزاج رکھنے والے اس موضوع کو خالدہ حسین نے ایسی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ افسانے کے پورے بیانیے میں جنگ کے حالات اور اُن کے تحت انسانی مسائل میں جان لیوا اضافے اور انسانی احساس میں ہولناک توڑ پھوڑ کرنے والے عوامل سے ہماری توجہ ہٹنے ہی نہیں پاتی۔ خالدہ حسین نے بہت کامیابی سے ان عوامل کے دباؤ کے تحت انسانوں کی ہونے والی کایا کلپ کو موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کردار جن کا سیاست سے کوئی تعلق ہے اور جو نہ ہی کسی طرح کی حربی سرگرمیوں میں ملوث ہیں، حالات کا جبر اور اندوہناک معاشرتی و ذاتی تجربات ایک سفاک قوت کی طرح دھکیلتے ہوئے انہیں لے جاتے ہیں اور پھر جنگ سے نفرت کرنے والے ہی لوگ جنگ کا ایندھن بننے پر خود بہ رضا و رغبت تیار ہو جاتے ہیں۔

ابوحمزہ اس روز اپنے آپ کو خودکش حملے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ لیلیٰ اور قدوس بھی وہیں تھے۔ وہ اس

تباہ شدہ عمارت کی چھوٹی سی کوٹھری میں تھے جو ملبے میں گھری نظروں سے اوجھل تھی۔ اس روز وہ بڑی مشکل سے روٹی کے چند پھپھوندی لگے ٹکڑے کوڑے کے ڈھیر پر سے چن کر لایا تھا۔ وہاں سب اپنے اپنے ٹکڑے ٹھونگنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیلیٰ کے رخسار پر ایک لمبا گہرا شگاف تھا۔ ایک بم دھماکے میں شیشے کا ٹکڑا پیوست ہو گیا تھا۔ ابوحمزہ نے اپنی ڈائی سیکشن کی چمٹی سے اسے نکالا تھا۔ لیلیٰ کے ہاتھ تکلیف کی شدت سے بالکل برف ہو رہے تھے اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس روز اس کے باپ اور چھوٹی بہن ہنکا کر لے جائے گئے تھے۔ حالانکہ وہ سب دراصل ابوحمزہ اور لیلیٰ کی تلاش میں تھے۔ دہشت گردی کے نام پر محلے کے محلے زندانوں میں ٹھونس دیے گئے تھے۔ اس سے پہلے انہیں کب خبر تھی کہ زندان آبادیوں سے زیادہ بڑے ہیں۔ یوں بھی ان کے نزدیک جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔

ابوحمزہ نے پھپھوندی لگی روٹی کی ایک چٹکی منہ میں ڈالی اور اسے ابکائی آ گئی۔

''اس میں تمام بیکٹیریا بھرے ہیں۔ اس سے مرنے سے بہتر ہے کہ آدمی بہتر موت کا انتخاب کرے۔''

جبر کو جان لیوا بنانے اور زندگی کو تذلیل کی پستی تک پہنچانے والے یہی وہ حالات ہوا کرتے ہیں جو آدمی کے اندر اتنا دھواں بھر دیتے ہیں کہ پھر موت اُس کے لیے ایک بہتر انتخاب بن جاتی ہے۔ خالدہ حسین کے یہاں اول تو سیاست اور اُس کے عوامل واثرات سے دلچسپی ہمیں زیادہ نظر نہیں آتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر یہ موضوع اس سے پہلے اُن کے یہاں آیا ہے تو انہوں نے اسے اپنے علامتی اسلوب میں اس طرح ڈھالا ہے کہ اس کا اظہار معنویت کے ایک الگ ہی دائرے میں ہوا ہے۔ اس افسانے میں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سیاست اور جنگ کا موضوع انہوں نے سماجی حقیقت نگاری اور راست بیانیہ کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ اُن جیسے فن کار کے لیے تو تلوار کی دھار پہ چلنے کے مترادف ہے، لیکن یہاں اُن کا فن جس سلامت روی اور معنی آفرینی کا ثبوت دیتا ہے، وہ مثال کے درجے کی بات ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں اپنے فن کارانہ تجربے اور نفس انسانی کی غیر معمولی آگہی سے نہایت خوبی سے کام لیا ہے۔ زندگی اور موت کے بیچ حد فاصل کے مٹنے اور ترجیحات کے بدلنے کا یہ منظر دیکھئے:

> اس وقت لیلیٰ اپنی کمر کے گرد وہ بیلٹ باندھ رہی تھی۔ ''مگر اس سے حاصل کیا ہوگا۔ تم خود اور کچھ وہ ...... اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیسے اور کتنے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی دوسرے بے فائدہ قسم کے لوگ ہوں جو اس دھماکے کی لپیٹ میں آ جائیں اور سب سے بڑھ کر تمہاری بہن اور بابا کو اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا؟''
> اس نے لیلیٰ سے کہا تھا۔

''ان کو تو اب کسی بات سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔'' لیلیٰ نے جواب دیا تھا۔
''مجھے معلوم ہے اب سکینہ اگر زندہ ہے تو کس حال میں ہوگی اور میرا باپ......!'' وہ خاموش ہو گئی۔
''کیا تم چاہو گے کہ میرا بھی وہی حال ہو جو سکینہ کا ہوا؟''
''نہیں نہیں!'' اس نے فوراً کہا تھا اور پھر خود اٹھ کر اس کی ڈیوائس سیٹ کرنے لگا۔ لیلیٰ بالکل پر سکون تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس وقت اس میں ایک نرم گرماہٹ تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں اور بھی گہری نظر آ رہی تھیں۔

اس افسانے کی ایک اور بہت اہم فنی جہت یہ ہے کہ حالات کے بدلتے ہوئے رُخ کے ساتھ افسانے کے کرداروں میں زندگی کی خواہش اور جینے کے تصور میں تبدیلی، دونوں چیزیں ایک سطح پر باہم مربوط ہو جاتی ہیں۔ خالدہ حسین نے حالات کے جبر میں انسانی نفسیات کے ردِ عمل کی مختلف صورتوں کا اظہار بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ چنانچہ افسانے میں اگر ایک طرف لیلیٰ کے دل میں اُس کے اہل خانہ کے الم ناک انجام سے زندگی کی لایعنیت کا خیال حب وطن اور مقصدیت کے جذبے کے ساتھ مل کر پروان چڑھتا ہے تو دوسری طرف ہمیں امین کا کردار بھی ملتا ہے، جسے محبت اور رومان کی ناکامی، حسد اور بغض کے جذبات اور جینے کی تمنا ذلت آمیز زندگی کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ تب وہ وطن دشمن قوتوں کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ زندگی اس کے لیے آخرت کی کھیتی نہیں رہتی، بلکہ حرص و ہوس کی جولاں گاہ بن جاتی ہے۔ یوں یہ کردار اپنی سرشت میں محض ایک کردار نہیں رہتا بلکہ فطرتِ انسانی کے اسفل میلان کا ایسا سانچا بن جاتا ہے جسے ہم اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے مذہبی، اخلاق اور تہذیبی وجود سے کٹ کر خود اپنوں کے خلاف کام کرتے اور دشمنوں کی فتح کا راستہ ہموار کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

یوں تو اس افسانے کا ہر کردار اپنی جگہ تخلیقی قوت کا حامل ہے، لیکن ابوحمزہ کو اردو افسانے کے زندہ کرداروں میں شامل کیا جانا چاہئے۔ یہ کردار جب فاعل ہے اور اپنے قول و فعل کے ساتھ سامنے آتا ہے، تب بھی اہم اور معنی خیز نظر آتا ہے اور جب دشمنوں کے ہتھے چڑھ کر مجبورِ محض ہو جاتا ہے، تب بھی اس کا صبر، استقامت اور ظرف اس کے قامت کو بلند کرتے ہوئے اسے ایک علامت میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ علامت ہے انسانی عزم و ہمت کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی، اس لیے کہ دشمن قوتیں اُسے تشدد اور ذلت کی بدترین سطح پر لے جانے کے باوجود نہ تو اُس سے کوئی راز اگلوا پاتی ہیں اور نہ ہی زندگی اور رحم کی بھیک کا سوال اُس کے ہونٹوں سے سن پاتی ہیں۔ یہ کردار ایک اور معنوی جہت بھی رکھتا ہے کہ عنصری برتری رکھنے والے افراد اور سماج لاکھ جتن کر لیں لیکن وہ کبھی انسانی روح اور اُس کے جوہر پر فتح نہیں پا سکتے۔ اس کا

دوسرا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جنگ جب ختم ہوگی تو انسانی جوہر پھر ظہور کرے گا اور پھر نمو پائے گا۔

—۳—

جنگ، اس کے ہتھیار، کردار، مسائل اور اثرات کے چھ پہلو تو وہ ہیں جنھیں ہم سطورِ گزشتہ میں انتظار حسین، جیلانی بانو اور خالدہ حسین کے افسانوں کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، لیکن دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اس کھیل کے شروع ہونے سے پہلے کی فضا میں بھی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جس کے تحت انسانی ذہن خوف اور مایوسی کے کسی تجربے سے گزرتا ہے۔ یقیناً ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن آنے والے مہیب حالات کے قدموں کی چاپ سن کر اس درجہ اعصاب شکن کیفیت میں ہوتا ہے کہ اپنے عزیز ترین رشتوں اور اُن کی قربت و محبت تک سے دست بردار ہونے پر آمادگی میں تأمل محسوس نہیں کرتا۔ اس کیفیت کو فردوس حیدر نے اپنے ایک افسانے ''خالی ہوا یہ دل'' میں بیان کیا ہے۔ یہ افسانہ تین نسلوں کے مابین انسانی مراسم کو واضح کرتا ہے۔ ان مراسم میں محبت، مقصدیت، لگن، وابستگی اور جذبے کے ساتھ ساتھ بشری تقاضوں کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی شخصی کمزوریوں اور مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اختتام تک آتے آتے افسانے میں بنیادی کرداروں کی کایا کلپ ہوجاتی ہے۔ اس تجربے کے پس منظر میں ان کرداروں کے عمر بھر کے رویے اور اصولوں کے درجے میں اختیار کیے گئے فیصلے تک لایعنی ہو جاتے ہیں۔ تب انسان کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ زندگی وہ نہیں جو کہ اب تک وہ سمجھتا رہا ہے اور یوں محبت کا مسئلہ بقا کے سوال کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔

جس دن چاغی کے علاقے میں ایٹمی تجربہ ہوا، ڈرائیور نے اخبار سب سے پہلے ان کے ہاتھ میں جا پکڑایا۔ اس سے پہلے کہ میں اُن کے ہاتھ سے اخبار لیتا، وہ خبر پڑھ چکے تھے اور بڑبڑا رہے تھے، ''پورا پہاڑ سفید ہوگیا!'' میں نے دیکھا اُن کا چہرہ سفید ہوگیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن کو سہارا دینا چاہا۔ وہ میری گود میں یوں گر گئے جیسے میں بچپن میں لوگوں کی باتوں سے پریشان ہو کر اُن کی گود میں گر جایا کرتا تھا اور رونے لگتا تھا۔ لیکن نانا جی روئے نہ لوگوں کی شکایت کی اور نہ آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہوگئے جیسے انہوں نے اپنے حصے کا کام ختم کر لیا ہو......

فردوس حیدر کا یہ افسانہ فنی لحاظ سے انوکھا تجربہ یا تخلیقی اعتبار سے کوئی شاہکار نہیں ہے۔ سیدھے سادے بیانیے میں لکھا گیا افسانہ ہے، البتہ یہ ایسے کی ایک قوت کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ ایک طرف انسانی رشتوں کی complex نوعیت اور اپنے اپنے زاویے سے زندگی کو برتنے اور بنانے کا انسانی مزاج اس افسانے کے تار و پود میں مرکزی مسئلے کی طرح گوندھا گیا ہے، جس کا اظہار افسانے کے آخر میں آ کر ہوتا ہے اور وہ بھی اُس وقت جب نانا (افسانے کا سب سے اہم کردار) حالات کی تبدیلی کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار نے مسلسل پیشِ نظر رکھا ہے کہ حالات کا خارجی دباؤ مختلف

کیفیات میں زندگی گزارنے والوں پر کس کس انداز میں اثر ڈالتا ہے۔ افسانے کے آخری حصے میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ نگار نے بنیادی طور پر یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ خوف اور مایوسی کے تجربے سے گزرتے وقت عمر بھر کے استحکام اور استقلال کو ہارنے والوں کے لیے کس طرح زندگی اور اُس کے مظاہر لایعنی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر بے بسی زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن جاتی ہے۔

چاغی میں پاکستان کے ایٹمی تجربات کے حوالے سے ہمارے یہاں کئی افسانے لکھے گئے۔ ان میں امراؤ طارق کا افسانہ ''آتش فشاں کی گود میں'' اس نوع کے وجودی تجربے کو سامنے لاتا ہے جو یوں تو far fatched معلوم ہوتا ہے، لیکن افسانہ نگار نے اسے ایک ایسے مسئلے سے جوڑ دیا ہے کہ قاری افسانے کی آخری سطریں پڑھتے ہوئے افسردگی محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ افسانہ قبائلی زندگی کے سیاق وسباق میں بنا گیا ہے۔ وہ لوگ جو سرحدی علاقوں اور اُن کی طرزِ معاشرت اور انسانوں کے باہمی مراسم کی نوعیت کو سمجھتے ہیں، وہ افسانہ نگار کے پیدا کیے ہوئے زاویے کی اہمیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ وہاں افراد کے رشتے قبائل کی دوستی اور دشمنی کی بنیاد بن جایا کرتے ہیں اور یہ دوستی اور دشمنی نسل در نسل سفر کرتی ہے۔ اس پس منظر میں اگر ایک شخص اپنی منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر دے تو اس کے نتائج کا تصور کچھ ایسا مشکل نہیں — لیکن اگر مسئلے کی نوعیت وہ ہو جو امراؤ طارق نے اپنے اس افسانے میں بیان کی ہے تو انسانی محرومی اور اذیت کی وہ کیفیت سامنے آتی ہے کہ جرگے کے افراد مہر بہ لب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

......میں اس وقت جھیل کے درمیان میں تھا اور جھیل کا پانی میرے ہونٹوں کو چھو رہا تھا، میرا پورا جسم پانی میں ڈوبا ہوا تھا...... اس وقت دھماکا ہوا، ایسا دھماکا جو اس سے قبل یہاں نہ ہوا تھا۔ پہاڑوں کے سیاہ رنگ سفید ہو گئے، درخت کھڑے کھڑے راکھ میں بدل گئے، کان بند ہو گئے، دانت ایک دوسرے میں کھب گئے اور جھیل کا پانی میرے گھٹنوں سے نیچے اُترا تو جھیل کے درمیان میں بے لباس کھڑا ہوا تھا اور میری ایڑیوں سے ایک برقی رو میرے گھٹنوں تک آ گئی تھی اور میرے پیر میرا بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہ گئے تھے، میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا کنارے تک لایا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جھیل کے کنارے تک آتے ہوئے برقی رو میرے گھٹنوں سے میری کمر تک آئی اور میری کمر کے گرد ہالہ بنا کر بیٹھ گئی۔''

اس نے سردار کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا، جیسے اب اُسے کچھ نہ کہنا ہو۔

''وہ برقی رو!'' قادر بخش نے کہا، ''وہ برقی رو اب بھی میری کمر کے گرد بیٹھی ہوئی ہے۔ میرے پاؤں اس قابل نہیں کہ میں رکاب سنبھال سکوں، میرے

گھٹنے اس قابل نہیں کہ میں ابلق پر جم کر سواری کر سکوں اور نہ میری کمر اس لائق رہ گئی ہے کہ میں شادی کر سکوں۔ میں نامرد ہو گیا ہوں۔ شہید مرزا ارسلان کا پوتا اور شیر دل خدا بخش کا بیٹا اپنی نسل آگے نہیں بڑھا سکتا، نامرد ہو گیا، اُسے گولیوں سے بھون دو، کیونکہ وہ شادی سے انکار کرتا ہے۔"

ایٹمی تابکاری اور تباہی کے موضوع پر اس سے قبل بھی اردو میں ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جو انسانی احساس کو متغیر کرتے ہیں۔ ان میں احمد ندیم قاسمی کا "ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد" محمد سلیم الرحمٰن کا "راکھ"، حسن منظر کا "زمین کا نوحہ"، زاہدہ حنا کا "تنہائی کے مکان میں" بالخصوص قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں انسانی تجربے اور احساس کے المیے کو تخلیقی ژرف نگاہی اور فنکارانہ صداقت سے بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ تمام افسانے دراصل عالمی جنگ کی تباہی اور امریکہ کے ایٹم بم کے استعمال کے سیاق و سباق میں لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا برصغیر، بلکہ یوں کہیے کہ جنوبی ایشیا کی زندگی کے تجربے سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔ تاہم ادیب اور فن کار کا معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ اُس کا مشاہدہ بمنزلہ تجربہ ہوتا ہے اور تصور و خیال بمنزلہ مشاہدہ۔ یہاں ان افسانوں کے ذکر کا مقصد اس امر کا اظہار ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی اور انسانی مستقبل کی ہولناکی کا یہ سوال آج، یعنی اُس وقت اردو افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز نہیں بنا کہ جب یہ آگ خود ان کے گھر تک آ پہنچی ہے، بلکہ اُنہوں نے اس مسئلے کی بابت اس وقت بھی بات کی تھی اور اپنا احتجاج ریکارڈ کیا اور تشویش ظاہر کی تھی، جب یہ مسئلہ صرف دنیائے اول کی جنگ میں سامنے آیا تھا۔ یہ تخلیقی صداقت اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ فن کار ایک سطح پر آ کر زبان، نسل، رنگ، قوم اور جغرافیے کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے اور اپنے فن میں انسانیت کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ انسانیت سے اس کی یہی وابستگی اس کے فن کو آفاقیت سے ہم کنار اور اُس جوہر سے بہرہ ور کرتی ہے جو اُسے جاودانی عطا کرتا ہے۔

—۴—

آج اس حقیقت کے اعتراف میں تأمل کی کوئی گنجائش نہیں کہ جنگ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا Phenomena ہے۔ اس جنگ کی نوعیت اور اُس کے تباہ کن اثرات کا دائرہ اب تک کی انسانی تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی اثرات سے بڑا ہے۔ اس کا سبب محض یہ نہیں کہ اپنی طاقت کے اظہار اور اسلحے کی دوڑ میں سبقت لے جانے کی خواہش نے اقوامِ عالم کی ایک بڑی تعداد کو بارود کے ڈھیر پر لا بٹھایا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست اور اہم ہے کہ آج کی دنیا ایک ایسے پہاڑ پر بسی ہوئی ہے جسے اس کی سیاسی اور فوجی مقتدرہ نے اپنے اپنے مفادات کے لیے آئیڈیالوجی اور deterrance کے نام پر بالآخر آتش فشاں بنا دیا ہے۔ تاہم یہ آج کی دنیا اور اُسے درپیش (تباہی کے) سب سے بڑے خطرے کا ایک رُخ ہے کہ اب اگر عالمی جنگ چھڑتی ہے تو وہ اس خطۂ ارض کے لیے ناقابلِ تصور حد تک تباہ کن ہوگی۔

آج کی انسانی صورت حال کو سمجھنے کے لیے، تباہی کے خوف کا ایک رخ اور بھی ہے اور وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ یہ رخ ہے آج کے سماج میں phenomenal سطح کو پہنچتی ہوئی تخریبی قوتیں۔
یہ کہنا تو خیر درست نہ ہوگا کہ انتشار اور دہشت صرف آج کی انسانی زندگی کا تجربہ ہے اور اس سے قبل تاریخ کے کسی دور میں اور کسی سماج میں یہ صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔ ماننا چاہیے کہ اب سے پہلے بھی تہذیبوں اور معاشروں پر انتشار اور دہشت کے دورانیے گزرے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اب سے پہلے کی جنگوں کے اثرات کا اظہار بھی ہمیشہ دو سطحوں پر ہوتا رہا ہے، ایک براہ راست جنگ کے نتائج کی صورت میں اور دوسرے جنگ کے دوران اور اس کے بہت دن بعد تک بھی نفسانفسی اور خلفشار کی صورت میں۔ اس کیفیت کا دائرہ بعض اوقات اس درجے تک بھی پہنچا کہ اسے سول وار کا نام دیا گیا۔ اکیسویں صدی کی دنیا ماقبل زمانوں سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ آج اس کے بعض خطے خاصے عرصے سے ایک مسلسل سول وار کی حالت میں ہیں۔ ان علاقوں میں دہشت گردی اور استحصال کی بدترین صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ دہشت گردی کی اس لہر نے ویسے تو ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، لیکن بعض علاقے جن میں بطورِ خاص وطنِ عزیز شامل ہے، اس کے شدید ترین عذاب کو جھیل رہے ہیں۔ یہاں آئے دن کتنے ہی معصوم اور بے گناہ شہری اس آگ میں ایندھن کی طرح جھونکے جارہے ہیں۔ سول وار کی علامتوں میں سے ایک اہم علامت یہ ہے کہ نہ تو مارنے والے کو معلوم ہوتا کہ وہ جس شخص کو مار رہا ہے، اُس سے آخر اس کا کیا جھگڑا یا دشمنی ہے اور وہ کیوں اسے مار رہا ہے اور نہ ہی مرنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ کس جرم کی پاداش میں اور کس نے اُسے مار ڈالا ہے؟
دہشت گردی کا یہ مظہر اپنی ماہیت اور تخریبی قوت ہر دو لحاظ سے بے حد مختلف اور نہایت بڑا ہے۔ عصرِ رواں کے اردو افسانے کی اس مسئلے پر خصوصیت سے توجہ رہی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو انتظار حسین کے افسانے ''ریزروسیٹ'' کا حوالہ دینا چاہئے۔ سیدھی سادی کہانی کی صورت سماجی حقیقت نگاری کا عام مگر نہایت مؤثر بیانیہ افسانے کے اس بنیادی مسئلے کو سامنے لاتا ہے جو افسانہ نگار کی توجہ کا مرکز ہے۔ بڑی بوا کے ڈراؤنے خواب سے شروع ہونے اور گھر کی گہما گہمی، رشتے ناتوں کی رونق اور بھرے پرے کنبے کی راحت و نعمت کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھنے والا افسانہ اختتام پر آکر ایک لخت دل الٹنے والی اذیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بڑی بوا کی فرمائش پر دوسرے شہر سے اُن کی عیادت کو آتے ہوئے بیٹا اُن کے پوتے (یعنی اپنے بیٹے) کو بھی دادی سے ملانے لے آیا تھا۔ بڑی بوا پوتے کو دیکھ کر نہال تھیں کہ باپ نے بیٹے کی مذہبی تعلیم پر بھی توجہ دی تھی۔ وہ شرع کے مسئلے مسائل سے بھی واقف تھا اور نماز بھی پابندی سے پڑھتا تھا۔ بس یہی نیک سیرتی اُس کا جرم بن گئی اور وہ مسجد میں آکر کلاشنکوف سے گولیاں برسانے والوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

بڑی بوا ابھی جانماز ہی پہ تھیں کہ محلے میں شور پڑ گیا۔ انہوں نے کلیجے پہ ہاتھ رکھا، ''الٰہی خیر، یہ کیسا شور ہے؟'' مگر خیر کہاں تھی۔ مسجد میں ابھی صف کھڑی ہوئی تھی کہ کچھ مسٹنڈے منہ پہ ڈھاٹے باندھے کلاشنکوفیں تانے اندر گھس آئے اور نمازیوں کو بھون ڈالا۔ کتنے تو سجدوں سے سر ہی نہیں اٹھا سکے۔
مار پیچھے پکار پڑی۔ خلقت مسجد کی طرف دوڑ پڑی۔ محلے والے ارتضٰی کو اٹھا کر گھر لائے۔ خون میں لت پت۔ فوراً ڈاکٹر کے لئے آدمی دوڑائے گئے، مگر ادھر وقت آ چکا تھا۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

بڑی بوا نے سینے پہ دو ہتڑ مار مار کے اپنا آپا دھن ڈالا۔ اپنے آپ کو کوسا کہ کیوں انہوں نے ارتضٰی کو ساتھ لانے کے لیے لکھا تھا۔ پھر دہشت گردوں کو کوسنے لگیں کہ ان کل مونہوں کو ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ کیسے شقی تھے کہ خانۂ خدا کا بھی پاس نہ کیا۔ ارے کم بختو! تم کیسے مسلمان تھے، بچے کو نماز تو ختم کر لینے دیتے۔ اور پھر بلک بلک کے بین کرنے شروع کر دیے۔

یوں تو اس افسانے کے توسط سے ہم دیکھتے ہیں کہ بازاروں، محلوں اور گلیوں سے گزر کر دہشت و بربریت کا یہ عفریت اب مسجدوں اور امام بارڑوں تک آ پہنچا ہے۔ وہ جگہیں جنھیں خدا اور اُس کے رسول ﷺ نے حرمت کا مقام ٹھہرایا، وہیں مذہب کے نام پر انسانی جانوں سے کھیلنے کا یہ کھیل معمول بنتا چلا جاتا ہے۔ انتظار حسین نے بڑی سہجتا اور سادگی سے اس عہد کے بدترین انسانی تجربے کو اپنے اس افسانے میں بیان کیا ہے۔ اُن کی فنکارانہ متانت کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے ایک ایسے مسئلے کو جو سفاکی کے بدترین اظہار کا درجہ رکھتا ہے، کسی طرح کی جذباتیت کی نذر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی اسے رد عمل کی اس سطح پر آنے دیا ہے کہ جب ادب، ادب نہیں رہتا، بلکہ نعرہ بن جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رزق اور موت دونوں ہی نصیب کے ضابطے سے انسان تک پہنچتے ہیں۔ جس طرح کسی کے حصے کا لقمہ کسی اور کو نہیں مل سکتا، اسی طرح کسی کی موت کا لمحہ ٹل کر کسی اور کے حصے میں نہیں آتا۔ تاہم عہدِ گزشتہ اور ہمارے زمانے میں یہ فرق تو بہر حال ہے کہ پہلے موت کسی کی طرف بڑھتی تھی تو صرف وہی نہیں شاید اور لوگ بھی اُس کے قدموں کی چاپ سن لیتے اور سمت کا اندازہ کر لیا کرتے تھے، لیکن اب دہشت گردوں کی برسائی ہوئی کوئی اندھی گولی جب کسی معصوم انسان کے جسم کو چھیدتے اور اُس کا لہو چاٹتے ہوئے نکلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس پر کس کا نام لکھا ہوا تھا۔ دہشت گردی یوں تو ہمیشہ ہی اور ہر معاشرے اور اس کے افراد کے لیے بھیانک تجربہ رہی ہے، مگر اس وقت جس بڑے اسکیل اور جس فریکوئنسی پر یہ تجربہ ہمارے معاشرے کے افراد کو ہونے لگا ہے، اُس نے اس کی اندوہناکی میں بدرجہا اضافہ کر دیا ہے۔ اب آئے دن اس کی لپیٹ میں ایسے لوگ آنے لگے ہیں کہ جن کے مرنے کی مثال اُس چراغِ خانہ کے بجھنے کے مماثل ہوتی ہے جس کے بعد پورے گھرانے کی قسمت میں تاریکیاں در آتی

ہیں۔

عہد جدید اپنی ترقی اور خوش حالی کو تو گلوبل ولیج کے انسانوں کا مشترک تجربہ نہیں بنا سکا، لیکن اس نے دہشت اور وحشت کے تجربے کو جغرافیائی سرحدیں اور مذہبی و تہذیبی حدیں مٹا کر دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے انسانوں کی قسمت کا مشترک factor بہر حال بنا دیا ہے۔ دنیا کے امن پسند، نہتے اور بے بس انسانوں کے ایک بڑے انبوہ کی زندگی میں اذیت اور ہزیمت شامل کرنے والا یہ factor ویسے تو اب بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا تخصیصِ مذہب و تہذیب جہاں بھی نظر آتا ہے، سراسر شائبہ تقدیر کی طرح نظر آتا ہے لیکن تیسری دنیا، پس ماندہ ممالک اور مذہب و لامذہب کی آویزش سے گزرنے والے معاشرے بطورِ خاص آج بڑی حد تک اس تجربے کا میدان بنے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے کی لپیٹ میں آنے اور اس کے بدترین نتائج بھگتنے والے لوگ مختلف زبانوں، علاقوں، تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کا مسئلہ اور اس مسئلے کا پیدا کردہ دُکھ ایک ہے۔ یوں درد و غم کی ایک مشترک اور دل کو مٹھی میں لینے والی زبان کتنے ہی لوگوں میں اظہار و ابلاغ کا وسیلہ ہی نہیں، ہم رشتگی کا حوالہ بھی بن گئی ہے۔ زاہدہ حنا نے اپنے افسانے ''رقصِ بسمل ہے'' میں اسی مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔

دہشت و بربریت کا طوفان ماؤں سے کس طرح اُن کی عمر بھر کی جمع پونجی، اُن کے بڑھاپے کا سہارا، اُن کی جوان اولاد چھینتے ہوئے آگے اور آگے بڑھتا چلا رہا ہے، کس طرح موت ایک ایک در جھانکتی اور کوچہ و بازار میں ناچتی پھر رہی ہے، اور یہ تجربہ رنگ و نسل اور ملک و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر پھیلتا جا رہا ہے اور درد کی سوغات نہتے، بے بس اور بے خطا انسانوں میں کس طرح بٹ رہی ہے، زاہدہ حنا کا افسانہ دکھ کے ساتھ اور فن کارانہ سبھاؤ میں ہمیں بتاتا ہے۔

شام ہوتے ہی وہ گھر آ گیا، exclusive shoot مکمل ہوگئی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے چل کر گیا تھا، آیا تو دوستوں کے شانوں پر۔ صبح جس تخت پر وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹا رہا تھا، وہیں اُسے لٹایا گیا۔ ناہید دیوار تھامے کھڑی تھی اور سارے بدن سے کانپ رہی تھی، اماں نجیب کے دوستوں کا گریہ سن کر ننگے پاؤں اپنے کمرے سے نکلیں تو کسی نے انھیں سہارا دے کر نجیب کے سرہانے بٹھا دیا۔ ناہید نے اماں کی خالی گود کو دیکھا، شامِ غریباں — کہیں دور سے آواز آ رہی تھی — ابھی تو سینے میں اک آگ سی لگی ہوگی — ابھی تو گود کی گرمی نہ کم ہوئی ہوگی۔ اماں اپنی استخوانی انگلیوں سے نجیب کے بال سلجھا رہی تھیں، اس کے رخساروں، اس کی بند آنکھوں کو جھک کر چوم رہی تھیں۔ پنکھے کی تیز ہوا نے نجیب کے سینے پر پڑی ہوئی خون آلود چادر اڑائی۔ سیاہ دھاگے سے سلا ہوا سینہ۔ صبح انہوں نے اسے جھڑکا تھا، یہ سوئی ابھی تمھیں چبھ گئی ہوتی۔'' اماں نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے چادر ذرا اور سرکائی۔ ''تم تو سارا سینہ ہی رفو کرا آئے نجیب۔'' ناہید نے اماں کا جملہ سنا اور چیخیں مارتی ہوئی زمین پر گر گئی۔

زاہدہ حنا نے اپنے معاشرے میں حد درجہ بڑھتے ہوئے دہشت گردی کے رجحان کو معرض بیان میں لاتے ہوئے متعدد فنی لوازمات سے اس طرح کام لیا ہے کہ افسانہ قاری کے اعصاب کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ تاریخ، تہذیب اور سیاست کے مختلف عناصر زاہدہ حنا کے افسانوں میں زیریں سطح پر معنویت کی تہہ کو دبیز کرتے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی انہوں نے ان عناصر سے بخوبی کام لیا ہے۔ تاہم افسانہ ہمیں درد کی لہر کے ساتھ چھوڑ کر اختتام پذیر نہیں ہوتا بلکہ مقاومت کی اور جہد للبقا کی صورت کو کچھ اس انداز میں سامنے لاتا ہے کہ زندگی لایعنیت کی طرف جانے کے بجائے معنویت کے مدار کی طرف لوٹ آتی ہے اور یہاں انسانوں کے درمیان زبان، رنگ، تہذیب سے ماورا خالص انسانی رشتہ اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو اماں اور خانم خجستہ اب لاؤنج میں نہیں تھیں۔ ٹیبل پر ٹی کوزی سے ڈھکی ہوئی چائے دانی رکھی تھی، پیالیاں، ٹوسٹ اور مکھن۔ اسے حیرت ہوئی ایک پیالی جھوٹی تھی، تو کیا اماں نے ناشتہ کرلیا تھا؟ اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر گئی، نجیب کی رخصت سے پہلے اماں روزانہ اسی وقت مونیسٹری کا رخ کرتی تھیں۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکیوں سے مالتی کی باڑھ کی طرف دیکھا جو گھر اور مونیسٹری کو تقسیم کرتی تھی۔ اسے کچھ بچے اچھلتے کودتے، پختہ روش پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیے، پھر اماں نظر آئیں، کلف لگی سفید ساڑی پہنے وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بچوں کی طرف جارہی تھیں، خانم خجستہ ان کا پرس اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے تھیں۔

—۵—

ٹامس مان نے کہا تھا کہ عہد جدید کے انسان کی تقدیر (اور اس کے احوال بھی) سیاست کی زبان میں بیان ہوگی۔ اس پر سوال دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کون سی سیاست کی اصطلاحوں میں؟ اس لیے کہ آج سیاست کے معروف اور مروجہ ادارے ہی سیاست نہیں کر رہے، بلکہ فلاحی اور سماجی تنظیموں سے لے کر اخلاقی و مذہبی اداروں تک سب ہی سیاست کے کھیل کا حصہ بن چکے ہیں۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ گمبھیر اور اذیت دہ ہے۔ اس عہد کی ایک بڑی اور ناقابل تردید سچائی یہ ہے کہ اب افراد ہی نہیں بلکہ پورے پورے شہر اور ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کہیں کہیں تو پورے پورے ممالک سیاست کی اس بساط پر محض پٹ جانے والے مہرے ہیں — ایسے مہرے کہ جنھیں یہ تک ٹھیک سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہیں اور انہیں کب، کہاں اور کون پیٹنے کے لیے بیٹھا ہے۔

نیرنگی سیاست دوراں کا یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ اب سیاسی بساط صرف سیاست کے نام پر نہیں بچھتی۔ یہ کہیں اصلاح احوال کا عنوان رکھتی ہے، کہیں فلاح عام کا۔ کہیں آزادی اظہار کا نام رکھتی ہے تو کہیں ترقی اور روشن خیالی کا۔ کہیں یہ سماجی اقدار کا بہروپ بھرتی ہے اور کہیں مذہب کو اپنے مقصد کے

حصول کے لئے استعمال کرتی ہے۔ نو ارب سے زائد انسانوں کی اس آبادی کے پچانوے فی صد سے زیادہ لوگ مطلق لاتعلقی اور لاعلمی کے باوجود نہ صرف اس کھیل کا حصہ ہیں بلکہ کھلاڑیوں کی ہار جیت کی قیمت بھی یہی بے چارے پچانوے فی صد لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں جذباتی اور معاشرتی استحصال کی صورت میں چکاتے ہیں۔

سیاست کے کھلواڑ کو یونس جاوید نے عہد در عہد سفر کرتے ہوئے اپنے افسانے ''ستونت سنگھ کا کالا دن'' میں بہت سنبھل کے اور فنی دروبست کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ دو عمر رسیدہ آدمیوں کی لاہور میں اچانک اور غیر متوقع ملاقات سے شروع ہونے والا افسانہ جب تہ در تہ کھلتا ہے تو اعلان آزادی کے دنوں تک فلیش بیک میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ تب ہم دیکھتے ہیں کہ مدتوں سے ساتھ رہنے اور رنگ، نسل، زبان اور مذہب کی تفریق سے بالاتر ہو کر نسل در نسل سماجی رشتے نبھاتے، افراد اور خاندان کس طرح سیاست کی بھینٹ چڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے زہرناک ہو گئے۔ پھر یہ ہوا کہ جو رشتے ناتے مان تھے، وہ دشمن جاں ہو گئے۔ اوتار سنگھ اور انور خاں دونوں سیاست کی بساط پر پٹے ہوئے مہرے ہیں، جنہیں عمر کے آخری مرحلے پر تقدیر نے اس طرح لا ملایا ہے کہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ تب ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں طرف کیا کیا زخم ہرا نہیں ہوا اور کون کون سا گھاؤ لو نہ دینے لگا۔ انور خاں نے تو کہہ بھی دیا اوتار سنگھ سے، '' کاش — تم مجھے نہ ملتے۔'' نیرنگی سیاست دوراں اس فقرے پر ضرور مسکرائی ہوگی۔ کیوں نہ مسکراتی کہ اسے اگلی بازی جو کھیلنی تھی۔ ساٹھ برسوں سے زیادہ طویل عرصے کی باتیں، یادیں، قصے سمٹتے سمٹتے افسانہ اپنے اختتام کو آ پہنچتا ہے، پر یہ اختتام کب ہے، سیاست ایک بار پھر ان پٹے ہوئے مہروں کو پیٹ ڈالتی ہے۔ گو یہ کھیل ختم نہیں ہوا، ابھی چل رہا ہے — لیکن اب اس کا عنوان کچھ اور ہے۔ یونس جاوید نے اس افسانے کی تخلیق کے دوران اپنے طویل فن کارانہ تجربے ہی سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامانگاری کے شعبے میں اپنی تکنیکی مہارت سے بھی خوب کام لیا ہے:

> دونوں کی آنکھیں ایک ہی قسم کی شرمساری سے مندی تھیں۔ دونوں ہلکی ہوا سے ایک نشہ کشید کر رہے تھے، تھوڑی دیر اسی مست پن میں گزری تھی کہ کمانڈوز کے دستے اندر کود ے — اور دونوں کو کچھ بولے کہے بغیر گھیر لیا۔ ایک بڑی گاڑی میں سائیکل سمیت دونوں کو اٹھا کر رکھا گیا تھا جب تک دوسری اسپیشل گاڑی قریب آ کر رکی — صاحب نے شیشے کو نیچے کیا اور صرف ''ہوں'' کہا۔
>
> کمانڈوز کا ہیڈ بولا "Red handed terrorists sir"
>
> ''احمدیوں کی عبادت گاہوں پر حملے کے مفروروں کو ہم ٹریس کر رہے تھے۔''
>
> اس نے اپنے حساس ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبایا — اور گاڑی کا شیشہ نیچے کرنے

والے آفیسر کے قریب کیا۔ اوتار کی آوازیں پھیلنے لگیں۔

اس افسانے کا اختتامیہ اگر اس ڈرامائی اسلوب میں نہ لکھا گیا ہوتا تو پورا امکان تھا کہ افسانہ ختم ہونے سے پہلے سیاسی بیانیے میں تبدیل ہو جاتا۔ یونس جاوید کی فنکارانہ کامیابی یہ ہے کہ وہ پوری کتھا کو سمیٹتے ہوئے فطرت انسانی کی سادگی اور سیاست کی اندھی اور سفاک جبلت کو آپس میں ٹکرا کے دکھا دیتے ہیں۔ یہ کرتے ہوئے انہوں نے فنکارانہ ضبط سے بھی پورا کام لیا ہے۔ کرداروں کو پیش آنے والی ان ہونی اور اس کے پس منظر کی صورت حال پر کوئی تبصرہ، کوئی غصہ، کوئی بیان، کوئی نعرہ، کوئی ملال — کچھ بھی تو نہیں آتا پورے افسانے میں افسانہ نگار کی طرف سے۔ بس قاری اور اس کے جھنجھناتے اعصاب کہانی کے روبرو ہیں، اور یہاں کہانی بے مہر تقدیر ہو گئی ہے۔

''مشرف عالم ذوقی کے افسانے ''ایک ان جانے خوف کی ریہرسل'' کا ایک کردار کہتا ہے، ''اصل بھارت تو جھگیوں میں بستا ہے صاحب!'' کچھ آگے چل کر وہ پھر لب کشا ہوتا ہے، ''سچ پوچھو تو ہم ڈر جاتے ہیں صاحب، بڑھتی ہوئی مہنگائی سے، روز ہونے والے دنگوں سے اور...... '' وہ ہنسا تھا — ''جمہوریت سے۔'' ذوقی نے افسانے کی زماں مکاں کو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر واضح کیا ہے۔ یہ ضروری بھی تھا کہ اس کے بغیر افسانے کی معنویت کا اظہار اور ابلاغ پورا نہ ہو پاتا۔ لیکن افسانہ پڑھتے ہوئے قاری کا دھیان از خود محسن حامد کی ان سطروں کی طرف جاتا ہے جنھیں ایک طرح سے افسانے کا سرنامہ بنایا گیا ہے۔ تب وہ خود سے سوال کیے بغیر نہیں رہ پاتا کہ کیا جھگیوں میں رہنے والی آبادی اور مہنگائی سے، دنگوں سے اور جمہوریت سے ڈرنے والے صرف بھارت میں ہیں؟ نہیں — بلکہ سیاست اور دہشت کے پنجے میں جکڑے تمام خطوں اور اُن کے باسیوں کی تقدیر اور احوال نامہ یہی ہے، بالکل یہی۔ گلوبل سوسائٹی کی بہت بڑی اکثریت کی مشترک تقدیر۔ ذوقی نے خوف کی اس ریہرسل کی ہمہ گیری اور شدت کو واضح کرنے کے لئے متعدد اجزا استعمال کیے ہیں — مزدوروں کا آندولن، اَن گنت مسائل، سوالوں اور اندیشوں سے سہمے ہوئے کردار کے بیٹے کی گم شدگی، اور بڑ کھابڑ ٹوٹے پھوٹے راستے، تخریب اور دہشت کے عالمی منظر نامے کے ٹکڑے اور دھماکے۔ بہت مسالا ڈالا ہے ذوقی نے اس افسانے میں۔ اس کے ساتھ ساتھ کہیں علامت سے، کہیں تجرید سے اور کہیں حقیقت کے بیان سے کام لیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ سیاست و دہشت کا یہ مسئلہ راست اور اکہرے بیانیے کی پکڑ میں نہیں آ پاتا۔''

—٦—

اسرار گاندھی نے اپنے افسانے ''غبار'' میں اسی مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ دو کرداروں پر بنیادی طور سے قائم ہے۔ ویسے تو افسانے میں بیک ڈراپ کے طور پر پورا ہندوستانی معاشرہ نظر آتا ہے۔ تاہم یہاں ہندوستانی معاشرہ محض علامت کا درجہ رکھتا ہے، ورنہ اسے جغرافیہ کی حدود سے الگ کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دراصل آج کے انسانی معاشرے اور اس کے نظام کی وہ عمومی صورت ہے جو عالمی سطح پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ البتہ اس اعتراف میں ہمیں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ یہ مسائل بالخصوص تیسری دنیا، ترقی پذیر اور پس ماندہ اقوام میں نمایاں طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک مدت کے بعد اپنے دوست کو ڈھونڈ رہا ہے۔ ملاقات نہ ہونے کا یہ وقفہ اتنا طویل کیوں ہو گیا؟ کیا راوی کہیں گیا ہوا تھا یا یوسف کہیں چلا گیا تھا؟ آخر اب یک لخت اُسے یوسف کیوں یاد آ گیا؟ ان سب سوالوں سے حذر کرتے ہوئے افسانہ براہ راست اپنے سروکار یعنی یوسف کی تلاش سے شروع ہوتا ہے اور آگے چل کر جب یوسف کے کردار کی گرہیں کھلتی ہیں تو اس طویل وقفے کا جواز بھی سامنے آتا ہے۔ بہر حال افسانے کے آغاز ہی میں راوی فلیش بیک میں تیس برس پیچھے لوٹ جاتا ہے، جب اُس کی یوسف سے ملاقات اور دوستی ہوئی تھی۔ یوسف معاشرے کے پست طبقے کا لڑکا تھا۔ طبقاتی تقسیم کے تلخ شعور نے یوسف کو زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ اس کے رویے میں بے رحم حقائق کی سفاکی سے پیدا ہونے والی کڑواہٹ صاف نظر آتی تھی، لیکن وہ سماجی نظام میں قائم کی گئی تقسیم کو مسترد کرتا تھا اور اسی بنیاد پر اُسے مذہبی رہنماؤں سے چڑھ تھی۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ وہ مذہب کو نہیں بلکہ مذہبی رہنماؤں کو برا سمجھتا ہے اور اس کا جواز اس کے پاس یہ ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ راوی کا ناسٹلجیا یوسف کی شخصیت کا ہم سے پوری طرح تعارف کرا دیتا ہے اور پھر فلیش بیک ختم ہوتا ہے اور تیس برس بعد کا یوسف راوی کے سامنے آ جاتا ہے لیکن یہ کون سا یوسف ہے؟ راوی بھی داڑھی اور کرتے پاجامے والے مولانا کو چہرے سے نہیں آواز سے پہچانتا ہے۔ ملاقات کے اختتام پر یہی مولانا یوسف اسے بتاتے ہیں:

> ''پھکن چکوا کا لونڈا یوسفوا دس سال پہلے جل کر مر گیا تھا اور اس کی راکھ سے میں پیدا ہوا ہوں، میں مولانا یوسف۔ گاؤں والے میرے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گاؤں کے تمام گھروں سے عورتیں میرے پاس دعا کرانے کے لئے آتی ہیں اور میں مولانا یوسف ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر ان کے لیے دعائیں کرتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

یہ ہیئت اجتماعیہ کی وہ قوت جو فرد کے جوہر کو، اس کی صداقت کو کچل ڈالتی ہے اور پھر اسے اپنے ڈھرے پر لے آتی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ کردار کا یہ بحران جس معاشرے میں پایا جاتا ہے، اس کے

تمام تر اسباب بھی دراصل اسی معاشرے کے داخل میں پائے جاتے ہیں اور اس کے نظام کا ایندھن خود اس کے افراد اور اُن کی زندہ روحیں بنتی رہتی ہیں۔

کردار کے اسی بحران کو اسد محمد خاں نے اپنے مخصوص تخلیقی اسلوب میں دیکھا ہے۔ افسانے کا نام ہے ''عون محمد وکیل، بے بے اور کا کا۔'' اسد محمد خاں نے بظاہر تو یہ افسانہ راست بیانیہ میں لکھا ہے لیکن جب ہم ذرا سا غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بیانیہ میں تھری ڈی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانے کا موضوع اپنی نزاکت اور حساسیت کے باعث داخلی طور سے یہ تقاضا رکھتا ہے کہ اسے ایک رخ سے دیکھنے پر اکتفانہ کیا جائے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس افسانے میں صرف اس کے کردار ہی کلام نہیں کرتے بلکہ ان کرداروں کا معاشرہ اور اس کی سائیکی بھی اکثر مقامات پر کلام کرتی سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ اس پورے تناظر کو فوکس کرنے کے لیے یک رخا بیانیہ ہرگز کفالت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک سے زیادہ زاویوں سے ان کرداروں، ان کے باہمی تفاعل اور سماجی رجحانات اور رویوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ ظاہر ہے، ایسا تھری ڈی تکنیک کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا تھا۔

اس افسانے کا موضوع blaspheme ہے۔ عصر حاضر کا یہ ایک حساس اور اہم موضوع ہے، خصوصاً ہندوستان اور پاکستان کے حوالے سے۔ افسانے کے تین بنیادی کردار تو وہی ہیں جن کے نام پر افسانے کا عنوان قائم کیا گیا ہے، یعنی عون محمد وکیل، بے بے اور اُس کا بیٹا یعنی کا کا۔ چوتھا اہم کردار پیش امام ہے۔ افسانے کا موضوع بادی النظر میں سادہ نظر آتا ہے، لیکن ایسا ہے نہیں۔ اس لیے کہ اپنی حساسیت اور نزاکت کے باعث یہ موضوع گہرے فنی شعور اور فنکارانہ چابک دستی کا تقاضا کرتا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی اسے اخباری رپورٹ یا کسی نیوز چینل کی بریکنگ نیوز میں تبدیل کرسکتی تھی۔ اسد محمد خاں نے نہایت متانت اور ذمے داری سے موضوع کو ہی نہیں سنبھالا، بلکہ وہ تلوار کی دھار پر قائم افسانے کے پورے ڈسکورس میں اور سب سے بڑھ کر کرداروں کے معاملے میں بھی کسی طرح کی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔

شموئل احمد نے اپنے ایک افسانے ''عنکبوت'' میں اسی مسئلے کو بیان کیا ہے۔ افسانے کا اختتامیہ کسی قدر جذباتیت اور خود افسانہ نگار کے شخصی غصے کا اظہار کرنے کے باوجود یہ افسانہ مؤثر بھی ہے اور ہمیں کئی طرح کے سنجیدہ سوالوں سے بھی دوچار کرتا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار میاں بیوی ہیں، جو الگ الگ چیٹنگ میں مصروف ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دونوں virtual reality کی اس دنیا میں دراصل رئیلٹی ہی کی نفی نہیں کررہے، بلکہ اپنی سماجی اقدار اور اپنے کردار کی بھی نفی کررہے ہیں — اور دونوں اس حقیقت سے بے خبر یا لاتعلق رہتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ ان کی آنکھیں کب کھلتی ہیں، اس وقت جب دونوں ایک دن لاعلمی میں ایک دوسرے سے chat کرتے ہیں۔ اس کے بعد شوہر کو گھر آکر کمپیوٹر پر کام کرتے

ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی تو اسی آئی ڈی سے chat کرتی ہے جس سے وہ ابھی اتنی برہنہ گفتگو کر کے آرہا ہے۔ یہ ہے غلاظت بھری اس تفریح کا ذلت سے بھرپور انجام۔ شموئل احمد نے سائبر پنک کے اس کھیل کو اس کی اصطلاحوں، زبان اور کنایوں کے ساتھ افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے افسانے کے واقعات کی رفتار بھی اتنی ہی تیز رکھی ہے، جتنی اس دنیا کے اعمال و افعال کی رفتار ہوا کرتی ہے۔ اس طرح وہ اردو ادب کو زندگی کے تازہ ترین اور نہایت وحشت خیز مسئلے کے حوالے سے ایک مؤثر افسانہ دینے میں کامیاب رہے ہیں۔

انٹرنیٹ کی اسی بے حقیقت اور vulgar رشتے داری پر ایک اور افسانہ بھی توجہ طلب ہے، وہ ہے مشرف عالم ذوقی کا ''واپس لوٹتے ہوئے'' Chat — کرتا ہوا شادی شدہ مرد ورچوئل ریئلٹی کی اس دنیا میں ایک نوجوان لڑکی کے قریب آجاتا ہے۔ دو اجنبی دل ملنے لگتے ہیں، لیکن یہ ملاپ بھی ورچوئل ہے اور اسی طرح اخلاقی قدروں اور حجاب داری کے لطف سے عاری۔ تاہم ذوقی نے آگے چل کر اسے ایک طرف سیاست کے زاویے سے جوڑ دیا اور دوسری طرف مرد اور عورت کے ازدواجی رشتے کے امور اس کے سماجی انسلاکات اور میاں بیوی کے رشتے میں وفا کے سوال سے مربوط کر دیا ہے۔ اس طرح یہ افسانہ ہمیں اس نئی دنیا کے کئی ایک سنجیدہ مسائل پر غور کرنے کا ایک زاویہ فراہم کرتا ہے۔

ان سب عناصر، عوامل اور مسائل کے انسانی دل و دماغ، اس کے اعصاب اور اس کی روح پر کیا اثرات ہیں؟ اکیسویں صدی کے افسانوی ادب کے مطالعے اور جائزے میں یہ ہمارا آخری سوال ہے۔ اس سوال کا یوں تو بلاواسطہ جواب ہمیں گزشتہ صفحات کے مباحث میں مل چکا ہے۔ تاہم اس سوال کی براہ راست ایک ذرا الگ تفتیش کی ضرورت یوں محسوس ہوتی ہے کہ ہم دیکھیں، عصری ادب نے اپنے عہد کے انسانی اور تہذیبی حقائق کو کس طور سے سہارا ہے۔ جتنا اہم یہ سوال ہے، اتنا ہی پریشان کن ہے اس کا جواب۔ اس لیے کہ اکیسویں صدی کا جدید اردو افسانہ متنوع صورتوں اور متعدد حوالوں کے ساتھ اس کا جواب فراہم کرتا ہے اور اس جواب کی ہر صورت ہمارے لیے ایک نئی تشویش اور نئی وحشت کی بنیاد بنتی ہے۔

جمیلہ ہاشمی

شیری

مہر کا تار اماں کے نام آیا "شیری کو برٹش ایرویز کی فلائٹ 32 سے لے لیجئے گا!"
سخت غصہ آیا میں نے اسے لکھا تھا۔ تم شیری کو یہاں کیوں بھجوا رہی ہو۔ اماں اپنا خیال تو ڈھنگ سے رکھ نہیں سکتیں۔ اس کا کیا کریں گی۔ تمیز سلیقے کا کوئی نوکر ان دنوں ملنا مشکل ہے اور جو ہیں وہ بھی بہتر جگہوں کی تلاش میں یہاں ان منے دل سے رہ رہے ہیں۔ جب تک پاپا تھے تو سب کچھ تھا اب تمہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا میں اکیلے یہ گھر کی کشتی کیسے کھے رہی ہوں۔ پریشانی اور شدید مصروفیت کا شکار رہتی ہوں امید ہے تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو گی اور ضدی ہونے کے باوجود میری بات میں تم کو وزن معلوم ہو گا۔
میری بہن ہمیشہ کی بدتمیز بے مروت اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی تھی اور مختصر نویس ہونے کے باوجود اس نے مجھے صفحوں کا کوسنوں طعنوں اور گالیوں سے بھرا خط لکھا تھا یہ کہ: "گھر پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کسی اور کا تھا۔ شادی کے بعد لڑکیوں کا میکے سے کوئی ناطہ ٹوٹ تو نہیں جاتا کہ اسے بھی اپنے لئے اتنی سہولت لینے میں کوئی مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ اماں بھی سب کی تھیں اور اگر ضرورت پڑے تو مدد بھی کر سکتی تھیں اور یہ کہ میں نے کب سے اپنے آپ کو اس گھر کا مالک تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا نہیں تھے تو کیا ہوا مکان پر تو اب بھی انہیں کا روپیہ صرف ہوتا تھا۔ شیری یہاں رہ سکتا تھا اور اماں خود ہی اس کے لئے مناسب دیکھ بھال کا بندوبست کر لیں گی۔ پھر آخر میں یہ کہ میری تنہا اجاڑ زندگی اور ویران دنوں کی ذمہ داری سوائے میرے اپنے کسی پر نہ تھی۔ میری تیز مزاجی اور زبان درازی اور دوسروں سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھنے اور نالائق دوستوں کی وجہ سے معاملہ یہاں تک پہنچا تھا ورنہ وہ کرنل کیا برا تھا جو تمہارے پیچھے پھرا کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے تم سے دوستی کے دوران دو چار اور لڑکیوں سے بھی تعلقات استوار کر رکھے تھے مگر تمہیں خود معلوم ہے تم پر تو مکمل بھروسہ آخر وقت تک نہیں کیا جا سکتا۔ تم تو بس خوب سے خوب تر کی تلاش میں سخت وفاداری کو کھوجتی رہی ہو' جو میری

جان اس جہان میں معدوم ہے۔ بھلا مردوں کو غلام بنا کر اور ان کا امتحان لے کر تم کبھی کسی نتیجے پر پہنچ سکی ہو! تم نے دنیا کے مردوں کو اپنے پاؤں میں رگیدا اور قدموں تلے دیکھنا چاہا ہے تم کو اپنے موہوم حسن پر کیا کیا ناز رہے ہیں جس نے دو کوڑی کو نہیں پوچھا۔ سمجھتی ہو تمہاری ان چمکتی ہوئی آنکھوں کے سحر میں کوئی گرفتار ہو گا۔ کبھی نہیں کبھی نہیں۔"

خط پڑھ کر میں نے سوچا ہٹاؤ مارو گولی اگر شیری کو وہ اماں کے پاس بھیجنا چاہتی ہے تو میری بلا سے میں نے اس بے ہودہ تحریر کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جب وہ عقل کی بات سننے کی تاب ہی نہیں رکھتی تو کاہے سنائی جائے اور پھر مہر سے خط وکتابت کی اس لڑائی میں ہار ہمیشہ میری ہوتی تھی۔ وہ اماں کی لاڈلی بہن بھائیوں کی چہیتی تھی۔ رستم نے اسے گھر کا سکون دیا تھا۔ جو اس کی طاقت اور اس کا مان تھا۔ پھر اس کی بیٹی نور تو اس کی دیوانی تھی اور اس لئے وہ میری ویران زندگی کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

اس کا تار پڑھ کر میں جل بھن گئی۔ اماں خود جاتی پھریں۔ شیری کو بلانے کراچی۔ کم از کم اس واہیات خط کے بعد میرا تو اس سارے واقعے سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ اماں جائیں اور مہر جانے۔ پھر ایک سہ پہر جب میں ابھی دفتر سے آئی تھی' اماں اپنے سوجے گھٹنے اور سخت ٹانگیں گھسیٹتی آئیں۔ اے لڑکی سیٹ بک کروا لی ہے۔

کیوں!

لو اور سنو کیوں بھلا اس حالت میں مجھ سے کراچی جایا جائے گا۔ تمہارے والد کے بعد سے یوں بھی مجھے اکیلے کہیں جانا مصیبت لگتا ہے۔ سفر کرنے کا مزہ تو ان کے ساتھ تھا' پورا ڈبا اپنا ہے۔ بس چلے جا رہے ہیں۔ کھاتے پیتے ہنستے ہنساتے جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ وہ یادوں میں گم سی ہو گئیں۔ گزرے زمانوں میں ریل کے ہچکولوں سے انہیں جیسے نیند آنے لگی ہو چپ چاپ دور دیکھتی ہوئی بیٹھی رہیں۔ پھر اچانک کہنے لگیں۔ "آخر تجھے جانا ہی پڑے گا۔ خرچ کا فکر نہ کر تو میرے لئے اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی؟"

بنا کوئی اور سوال کئے میں نے اسٹیشن فون کیا۔

فلائٹ لیٹ تھی میں انتظار گاہ میں لوگوں کے جم غفیر کے درمیان ٹہلتی رہی۔

دولت کی تلاش میں پرائے دیسوں کو جانے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور خواب' بچے اور سامان' ٹرالیاں' قلی' گرجتے ہوئے' لینڈ کرتے جہاز گڑگڑاہٹ سے سروں کے اوپر سے گزر کر منزلوں کو روانہ ہوتے ہوئے طیارے' آواز میں رونا ہنسی بچھڑنا وعدے چاہتیں مزید

آرزوئیں ایک گنگا جمنی بھیڑ۔

نئی روشنی کی تیز لڑکیاں عجیب تراش خراش کے لباس پہنے خود آگاہ بال جھلا جھلا کر سر کو گھما کر اپنے گردوپیش دیکھتی ہوئیں' کھنکتے قہقہے' گونجتی ہنسی تیز انگریزی اونچی گفتگو دکھاوا بناوٹ پسندیدہ نظروں کے حصار میں اپنے سحر سے آشنا جنہیں دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجانے کو جی چاہے۔

لڑکے مضحکہ خیز چوہوں کی طرح فلموں کے ہیرو' لڑکیوں کے گروہوں کے گرد چکر کاٹتے ہوئے اپنے باپوں کے ساتھ دلچسپی سے عریاں نگاہوں سے اپنے گردوپیش نگاہ دوڑاتے نیچے سروں میں باتوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے مگن مصروف' اوپر اوپر گھومتے پھرتے ہوئے گھاگ شکاریوں کے سارے داؤ پیچ سے آشنا۔

میں ٹہلتی ہوئی ذرا پرے جنگلے کے ساتھ دور چلی گئی اور اس سے سر لگا کر میلوں تک پھیلے ہوئے رن وے کی طرف دیکھنے لگی جہاں چھوٹے بڑے جہازوں کی بھیڑ تھی سیڑھیاں گھسیٹی اور لگائی جا رہی تھیں ایک بھگدڑ مچی تھی۔ عملے کے لوگ' موٹریں' سامان اور جانے کیا کیا۔ اس منظر سے تھک کر میں نے اپنے اطراف دیکھا۔

لڑکی کے رخسار' گھڑی گھڑی گلابی ہو جاتے کان سیبوں کی طرح سرخی سے چمکنے لگتے وہ دونوں چپ تھے ایک دوسرے سے بہت قریب بھی نہ تھے۔ لڑکا میری طرح اپنے سامنے دیکھ رہا تھا مگر جب وہ سر کو گھما کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ یوں چھوئی موئی سی اپنے ہاتھوں تک انگلیوں کی پوروں تک رنگین ہو جاتی۔ ہائے یہ نگاہ کی رنگینی تھی۔ بھیگی ہوئی چنری کی طرح کی یہ لڑکی رنگ میں ڈوبی تھی۔ سرشار' بے چین' پر سکون' وارفتہ۔

مجھے وقت گھسیٹ کر پیچھے لے گیا۔ اس جنگلے سے دور ان برآمدوں میں جہاں میں اونچی ایڑی کا جوتا پہنے کھٹ کھٹ کرتی چلتی تھی گویا زیبا اصفہانی کے دل پر چل رہی ہوں۔ زیبا کو اپنے حسن کا غرہ اور اپنے ایرانی ہونے پر ناز تھا۔ وہ ابھی نیا نیا آیا تھا اور لیکچر دیتے وقت جب وہ سمجھاتا اور سیدھا تمہاری آنکھوں میں دیکھتا تو دل سینے میں ڈول جاتا تھا۔ میں جسے اپنی شوخی پر اعتماد تھا سمجھتی رہی کہ وہ کہاں جائے گا چند دنوں میں اس کا غرور نیاز میں اور اس کا سر میرے قدموں میں ہو گا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی فتوحات سے تو میرا دامن بھرا ہوا تھا۔ زیبا تو اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھتی تھی۔ چند دنوں بعد مجھے اور اچھا لگنے لگا وہ کلاس میں جب بھی زیبا کی طرف دیکھتا میں محسوس کرتی کہ زیبا کی لمبی پلکیں رخساروں پر جھالر کی طرح جھک جاتیں اور وہ گلابی ہو جاتی۔ عجیب خود فراموشی سے وہ اس کی نگاہ کا جواب دینے کے

بجائے اپنے سامنے دونوں ہاتھ رکھے ناخنوں کی طرف دیکھتی جس میں سرخی تیزی سے جھلکنے لگتی تھی۔ اچھا تو اس کھیل میں کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ یہ عجیب بے قاعدہ مثلث تھی۔ درمیان میں وہ تھا اور اس کی نگاہوں کی ساری روشنیاں اس کے لئے تھیں اور میں تھی جو اس کے لئے کچھ نہ تھی اور جس کا دل کلاس میں آنے سے پہلے بعد میں سارا دن یونہی دھڑکا کرتا تھا۔ ایک دہکتی ہوئی گرمی میرے سارے وجود کو تڑپاتی رہتی۔ مگر میرا حسن جہاں سوز بیکار میری آج تک کی فتوحات غلط تھیں۔ میں نے اتنی ذلت کبھی نہ اٹھائی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزرتی بھی تو وہ میری طرف مڑ کر نہ دیکھتا روز میرے لئے ایک نیا مقابلہ ہوتا تھا۔ میں نے اپنا آپ آزمانا چاہا اور میں جہنم میں سے گزر گئی۔

میں نے اسے پیغام بھجوایا رات کو دروازہ کھلا رکھنا میں نے زیبا کا ایک خاص پیغام لے کر آؤں گی۔ وہ خوشی سے تقریباً دیوانہ ہو گیا تھا جیسے اس نے سرخ گلابوں کا عکس اندھیرے میں دیکھ لیا ہو۔ جیسے تاریک پانیوں پر ڈولتے کنول کے ہونٹوں کو سورج کی کرن چھوئے اور وہ ہولے ہولے کھلنے لگے۔ میرے سینے میں دل کو کوئی چپکے چپکے مسل رہا تھا۔ میں جیسے موت کے بند کواڑوں کو کھولنے جا رہی تھی۔ اپنے مقدر کے نوشتے کو پڑھنے کے لئے میں نے رو رو کر اسے اپنا حال دل سنایا میں نے کہا تھا زیبا ایک خواب ہے۔ تم اسے کبھی حاصل نہ کر سکو گے وہ پرائے دیس چلی جائے گی تو لوٹ کر نہیں آئے گی آنہ سکے گی اس کا وطن کوئی اور تھا۔۔۔ میں تمہاری زندگی سنوار دوں گی۔ میرے پاس ذرائع تھے خاندان تھا۔ وہ نگاہوں میں تمسخر لئے نہایت خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا اس گھڑی مجھے لگتا تھا۔ میری روح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کرچیاں ہو کر میری آنکھوں سے بہہ رہی ہے میں ٹوٹے ہوئے شیشے چبا رہی ہوں اور ابھی گر کر بے ہوش ہو جاؤں گی۔

اس نے ہنس کر کہا تھا "بی بی چاہت کو تم کیا سمجھتی ہو کہ جب چاہو قیمت چکا کر خرید لو۔ یا یہ چراغ ہے کہ جب تیلی دکھاؤ جلنے لگے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا اب تم جا سکتی ہو۔

جب وراڈن نے مجھے اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو میرا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے دھلا ہوا' آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں اور میں تقریباً گری جا رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

اس نے دو باتوں میں سے ایک کو چننے کا اختیار دیا گیا وہ مجھ سے شادی کر لے اور یہیں ٹھہرا رہے یا پھر خود استعفیٰ پیش کرے اور چلا جائے۔

ہائے کیسے اس نے انکار کر دیا تھا اور چپ چاپ چلا گیا تھا۔ اس نے میرے بدلے وہ ذلت قبول کر لی تھی۔ میری قیمت ذلت بھی کم تھی۔ ازاں ارزاں بے قیمت میں۔ اس کے جانے کے بعد سے مردوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا اپنے حسن کی چمک بھی دھندلی اور بیکار کا فسانہ لگی۔ میرے چاروں طرف خلا تھا جس میں لڑکیوں کے قہقہے گونجتے اور ان کی نگاہیں تیروں کی طرح میرے آر پار ہوتی جاتیں مگر میں سر اونچا کئے زیبا اصفہانی کے دل پر چلتی رہتی۔ بے پناہ خود اعتمادی کے ساتھ کیونکہ میں آگ کی محراب تلے سے گذر گئی تھی اور میں نے اپنا سارا ماضی سارا مستقبل جلا ڈالا تھا۔ میں نے محبت کی خوشبو کے بدلے انگارے سونگھے تھے اور دل جلن کی بو ساری عمر میرے دماغ میں تیرتی رہی ہے۔

ہائے مجھے کسی نے کبھی ایسے کیوں نہیں چاہا کہ میں رنگ سے بھیگی ہوئی چڑی لگوں۔

برٹش ایرویز کی فلائٹ کے لینڈ کرنے کا اعلان کیا گیا۔

طیارہ رن وے کے دوسرے سرے پر ایک بڑے پرندے کی طرح اترا۔ پھر وہ اسے اور قریب لائے سیڑھیاں مسافروں کو لانے کے لئے' لاریاں' سامان کے لئے گاڑیاں رونق اور چہل پہل ہو گئی' پھر لوگ اپنے سامان کے ساتھ باہر آنے لگے۔ سب سے آخر میں وہ اسے لائے۔ خوبصورت پنجرے میں چمکتے ہوئے سنہرے بالوں والا روشن اور ذہین آنکھیں' تھوتھنی نہ بہت لمبی اور نہ ہی چھوٹی' صاف ستھرا دھلا دھلایا۔ بے حد اسمارٹ کالر پہنے بڑی بے پرواہی سے اپنے گردوپیش دیکھتا ہوا کبھی سر اپنی اگلی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر رکھ لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ مجھے وہ بہت عمدہ لگا۔

میں نے پنجرے کے ساتھ ساتھ چلتے پکارا۔ شیری شیری۔

اس نے ہوا میں ناک اٹھائی کوئی مانوس سی بو سونگھی' غور سے مجھے دیکھا' عف عف کیا جیسے پکار کا جواب دے رہا ہو اور پھر منہ اپنی ٹانگ پر رکھ لیا اس کا سر ہل رہا تھا' جیسے وہ ہانپ رہا ہو۔ چل چل کر تھکا ہوا بیٹھا ہو۔ ائر ہوسٹس نے اس کی زنجیر مجھے تھمائی اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

"کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی اور شیری کو نہ بھیجا ہوتا۔ اس سے جدا ہوتے وقت ہمارا دل کٹ کٹ گیا ہے۔ رستم اداس ہے۔ نور بہت روئی ہے اور میں تو باقاعدہ غم زدہ ہوں۔ جب وین اسے لینے آئی ہے تو یہ ان سے چھٹ کر گھر میں گھس گیا اور غسل خانے میں چھپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے گھسٹ کر نکالا گیا' یہ ہمیں بہت عزیز ہے۔ تقریباً ایک فرد کی حیثیت سے اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ بہت محبت کرنے ولا ہے۔ اور

امید ہے تم اماں کے گھر میں ساری کوششوں کے باوجود اس سے نفرت نہیں کر سکو گی۔ تکلیف فرمائی کے لئے شکریہ۔ ہم لوگ کل جدہ روانہ ہونگے۔ الوداع' ائرپورٹ سے باہر آکر میں نے وہ زنجیر اس کے کالر میں اٹکائی اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا میرے ہاتھوں کو سونگھا۔ مہر کی اور میری مہک ایک سی ہونا چاہیے۔ اس نے بنا مزاحمت کے زنجیر کے ساتھ مجھے اپنا مالک تسلیم کر لیا۔ میں نے اسے بسکٹ دیا جو اس نے کھا لیا اور پانی پی کر ہم دونوں اماں کی طرف روانہ ہوئے۔

ٹرین میں وہ سیٹ پر بیٹھا شیشے کے ساتھ منہ لگا کر باہر جھانکتا رہا۔ کھیتوں ندی نالوں اور ان سب پر جھکا نیلا آسمان دھوپ روشنی کی طرح بھری ہوئی اور بہت تیز۔ وہ اس نئی زمین سے واقفیت پیدا کر رہا تھا۔ جس کی عام آدمی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اس کے رنگوں اور خوشبوؤں اور بدلتے مناظر درختوں اور ہواؤں کو زیر کر رہا تھا۔ جہاں ٹمٹماتی بتیوں پر اور دور جلتے چراغوں پر سیاہ ابر آلود رات چھائی ہوئی تھی اور چاند ستاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا پھرتا تھا۔

شیری کی تنہائی اور غریب الوطنی نے میرے دل کو آنسوؤں سے بھر دیا۔

اماں بیماری کے بعد سے خواب آور گولیاں کھانے لگی تھیں اور اس لئے دن چڑھے تک سویا کرتیں' میں دفتر جانے کے تقریباً تیار ہو چکی ہوتی تو وہ شیری کہہ کر پکارتیں نہایت تمیزداری سے میز کے قریب نیچے بیٹھ کر وہ اپنے پیالے میں کبھی دودھ اور ڈبل روٹی کبھی گوشت کھاتا نہایت چبا کر آہستہ آہستہ جیسے کوئی آہٹ بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اماں کہتیں مہر نے اسے کیا عمدہ پالا ہے آدمی کے بچوں سے زیادہ تمیزدار ہے۔

انہیں خواہی نخواہی مہر کی تعریف کرنے کی عادت سی تھی۔

موسم بدلا۔ درجہ حرارت بڑھنے لگا گرمی میں تیزی آتی گئی اور شیری بہت گھبرایا ہوا رہنے لگا۔ ہانپتا ہوا زبان لٹکتی ہوئی تیز سانس لیتا ہوا۔ اماں اسے اپنے ساتھ کمرے میں بند رکھتیں۔ شام کو مجھے کہتیں ذرا اسے ٹہلا دیا کر' بے چارا پردیس میں آن پھنسا ہے۔ مہر نے ظلم ڈھایا ہے۔ بھلا سرد ملکوں سے تو آکر یہاں تو لوگ یہ گرمی برداشت نہیں کر سکتے' یہ تو ذرا سا بے زبان جانور ہے۔

اور یوں شاموں کو جب گرم ریت کی ٹھنڈک ملنے لگتی' ہوا نرم نرم جھونکوں سے قابل برداشت ہو جاتی' شیری کو ٹہلانے لے جانے لگی۔ وہ سایوں پر بھونکتا' ٹڈوں کی چر چر سن کر خاموش کھڑا ہوتا جیسے کسی دور کے سیارے کی سمفنی یا کسی دیس کی موسیقی ہو پھر بھاگتا

اور اس کی چھوٹی سی دم اٹھی ہوئی ہوتی' گھاس پر الٹا لیٹ کر لوٹ لگاتا اور جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پھر عف عف کرتا اور میرے قدموں میں جھکتا پھر چک پھیریاں لیتا اور میرے ساتھ چلتا رہتا۔ بلیوں کے پیچھے بھاگنے میں اس کے سنہری بال سیدھے کھڑے ہو جاتے اور وہ تیزی سے ان پر جھپٹتا جب وہ دو بلیاں اکٹھی ہوتیں تو اس سے ذرا نہ ڈرتیں اسے تھپڑ مارتیں بیچارا چوں چوں کرتا اور دم دبا کر میری ٹانگوں سے لگ کر کھڑا ہوتا گویا پناہ گاہ میں ہو۔ کبھی چڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے سوتا بن جاتا' وہ اس کی گردن پر آ بیٹھتیں جیسے اس کی پرواہ ہی نہ کرتی ہوں۔ کبھی ایک آدھ کو پنجے میں دبوچ کر بیٹھا رہتا۔ جب وہ دل کی طرح خوف سے دھڑکنے لگتی تو یک بیک اسے اڑا کر تماشا دیکھتا۔ اس کی طبیعت میں ضرر رسانی نہ تھی' اس لئے گھر میں جو مہمان آتا شیری سے اس کا تعارف کروایا جاتا۔ اماں اس کی نسل اور ملک اور اس کے انگریزی زبان سمجھنے سے بہت مرعوب تھیں پھر اور خوبیاں تمیزداری' عمدگی' کھیل اور کھانے کے آداب سب اس کی وقعت میں اضافہ تھے۔ اماں کے صبح دیر میں اٹھنے کی عادت نے مجھے شیری کی طرف زیادہ توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ میں تیار ہو رہی ہوتی تو وہ پاس ہی ڈولتا رہتا۔ میرے جوتے لا کر قریب رکھ دیتا۔ میرے ہاتھ سے کوئی چیز چھٹ جاتی تو لپک کر منہ میں اٹھا کر مجھے پکڑا دیتا اور اب میں اکثر اس کے بالوں میں کنگھی کر دیتی اور ان کے سنہرے ملائم بہاؤ کو محسوس کر کے میرا جی خوش ہوتا۔ اگر کبھی میں مہر کی پسندیدہ خوشبو لگا لیتی بس دیوانہ ہونے لگتا میرے گرد گھومتا میرے دامن پر اگلے دونوں پاؤں رکھ دیتا مجھے سونگھتا یوں ہمکتا جیسے گود میں آنا چاہتا ہو۔ مگر میں نے کسی بھی بات سے متاثر ہونے اور مہر کی کسی شے کو پسند نہ کرنے کی جی ہی جی میں قسم اٹھا رکھی تھی اور شیری کی یہ ساری حرکتیں مجھے چھو نہ سکتیں۔ البتہ جانور کی جو ممکن دیکھ بھال ہو سکتی تھی اس میں میں اماں کا ہاتھ بٹاتی اور یوں میں نے ہولے ہولے اس کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔

شدید گرمی کے دن تھے لو چل رہی تھی جھلسائے دیتی تھی۔ دفتر سے آکر میں سخت ٹھنڈے پانی سے نہالی اور تقریباً بے ہوش ہو گئی پھر یکدم تیز بخار آگیا۔ اماں گھبرا ہی گئی ہوں گی کہ انہوں نے ادھر ادھر میری دوستوں کو فون کئے۔ کئی دنوں ہذیانی کیفیت رہی اور پھر لوٹ پوٹ کر میں تندرست ہو گئی۔ شیری مجھے دبلا لگا اور بہت ہی بے آسرار اداس بھی۔ اس دن میں نے پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے پیالے میں گوشت

اماں کہنے لگیں اسے دیکھو تم بیمار کیا ہوئیں اس کا تو کھانا پینا ہی چھوٹ گیا۔ دن رات تمہارے پلنگ کی پائنتی کے نیچے بیٹھا رہتا' جیسے اسے تمہاری بیماری کی بہت فکر ہو اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر'

ہنس کر میں نے شیری کی طرف دیکھا ایک احساس تشکر' اس بھرے پرے گھر میں کوئی تو ہے جو میرے لئے پریشان ہوا۔

اماں پھر بولیں چلو آج اس کے منہ پر رونق تو آئی مجھے تو سخت فکر لگ گئی تھی کہیں یہ مر ہی جائے۔ عجیب جانور ہے اپنے اصل مالکوں کو بھول کر تم سے اتنا ہل گیا ہے۔

میں نے چڑ چڑا کر اماں سے کہا کیا مطلب ہے آپ کا! مجھ سے اگر ایک جانور بھی مانوس ہو تو آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔

ارے نہیں بد نصیب مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے اگر تجھ سے کوئی انسان ایسے مانوس ہو تو میرا بوجھ نہ ٹل جائے مگر تیری سخت طبیعت کی وجہ سے کوئی تیرے قریب ہی کیوں آئے گا ہر کسی کو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے' لوگوں کو فرشتہ چاہتی ہے۔ ایسی عمر میں کون ایسا وفا دار ملے گا۔"

میری اور اماں کی خوب تو تو میں میں ہوئی کسی نے کھانا نہ کھایا ہم دونوں رقیبوں کی طرح ایک دوسرے پر چیختی رہیں۔ میرا جی چاہتا تھا خوب دھاڑیں مار مار کر روؤں اور دیواروں سے سر ٹکراؤں یا اس گھر کو آگ لگا دوں جو میرا قید خانہ بن گیا تھا۔ میں اس دن کو یاد کر کے اونچے اونچے بین کر کے روئی جب میں نے پاپا کی بیماری کی وجہ سے اماں کے مایوس کن خط پڑھ کر ایک دم امریکہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ مستقبل کے سنہرے اور روپہلے خوابوں کو اپنے پیچھے کشتیوں کی طرح جلا کر گھر واپس آگئی تھی اور اب اماں مجھی کو الزام دے رہی تھیں۔ دشمن کی طرح میری طبیعت اور میری عادتوں میں سو سو کیڑے نکالتی تھیں۔ امریکہ میں کیا کچھ نہیں تھا' مواقع' آزادی' چاہنے والے لوگ' نباہ کرنے کو تیار' میری رفاقت میں مسرت محسوس کرنے والے اور وہ بھی تو تھا میرا جرمن دوست۔

چھٹی کے دن اپنے کمرے میں جو اوپر کی منزل میں تھا' مجھے مدعو کرتا' وہ گٹار بجاتا' میں مشرقی کھانے پکاتی' پھر مل کر رائن وائن پیتے جرعہ جرعہ اور اپنے اپنے ملک کی کہانیاں لطیفے سناتے کبھی بحث چل نکلتی موسیقی اور آرٹ اور خدا جانے کیا کیا۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی تھیں۔ جہاں لوگ کشتی رانی کرتے۔ سیلنگ رنگ تھے'

فوارے تھے اور پارک میں لوگ نہایت پرانی دھنیں بجاتے تھے۔ کبھی کبھار ہم چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ اتنی خوبصورتی اور تکمیل میں باتیں کرنا بے معنی لگتا۔ بس اس کمرے میں اس لمحے میں ہم دونوں زندہ ہیں یہ بہت تھا۔ اس نے کبھی مجھے نہیں کہا کہ وہ مجھے چاہتا ہے چونکہ میں دوسروں سے مختلف تھی اسے اچھی لگتی تھی وہ بہت سیدھا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا: "تم اپنے دیس میں جا کر جب کسی سے شادی کرو گی تو وہ بہت خوش قسمت ہو گا۔ تم میں بہت خوبیاں ہیں مردوں کو سمجھنے کی، انہیں خوش رکھنے کی۔" ہم دونوں ہنستے رہتے وقت گزرتا رہا اور پھر وقت گزر گیا۔

آخری دن جب ہمارا امتحان ہو چکا تھا ہم وطنوں کو لوٹ رہے تھے۔ چھٹیاں گزر چکی تھیں گٹار میں رکے سب گیت گائے جا چکے تھے تو اس نے سیڑھیوں کے نیچے بڑی دوست داری سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

"کیا مجھ سے شادی کرو گی۔"

ہنس کر میں نے کہا تھا۔ "میں ساری عمر کھانا پکا کر تمہارا جی خوش نہیں کر سکتی۔ تم ہمیشہ مشرقی کھانوں کے دلدادہ نہیں رہو گے۔ گذری ہوئی صحبتوں اور ساتھ گذارے دنوں اور محبتوں کا شکریہ" وہ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتا رہا جہاں ہنسی ابل رہی تھی اور میرے رخسار انتہائی سردی کی وجہ سے گہرے گلابی ہو رہے تھے۔ پھر اس کا رنگ پھیکا پڑا اور زرد ہو گیا اور وہ کچھ کہے بنا اوپر کی طرف بڑھ گیا اور میں بھاری قدموں سے لوٹ آئی۔ اب بہت دیر ہو گئی تھی، اس نے اتنے لمبے عرصے میں کبھی بھی تو اشارے سے، کسی لفظ سے، یہ تک نہیں کہا تھا کہ مجھے چاہتا ہے۔ ہم بہت اچھے دوستوں کی طرح تھے۔ یہ میرا وہم تھا کہ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور کچھ کہے بنا مڑ جانے کا جواز یہ تھا کہ اسے جلدی تھی۔ میں نے ذہن میں بیکار کی تصویر کشی کبھی نہیں کی۔ سر کو جھٹک کر میں شام کی فلائٹ سے واپس وطن آ گئی اور اس ڈر سے کہ مبادا مجھے کوئی لوٹا نہ دے میں نے اسے لوٹا ہی دیا۔ ہائے برباد شدہ۔ میں کچھ دن اماں اور میں روٹھے رہے، شیری اماں کے بلانے پر بھی ان کی طرف نہ جاتا۔ میرے سوا اسے کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اماں خوب جزبز ہوتیں مجھے کوستیں ایک دو بار انہوں نے شیری کو ہلکے سے تھپڑ بھی مارے، وہ پٹ کر آتا اور میرے پاؤں کے قریب نہایت سعادت مندی سے بیٹھ جاتا۔ زبان نکالے سر ہلاتا ہوا ڈرا ہوا بے بس سا اور مجھے اس کی غریب الوطنی پر پیار آتا پھر میں اسے سمجھانے لگتی۔

دیکھو شیری تمہیں گھبرانا نہیں چاہئے تم تو بہت بہادر بچے ہو یہ برا اور جدائی کا زمانہ

ہے' گزر جائے گا پھر تم اپنے وطن لوٹ جاؤ گے۔ جہاں ٹھنڈ ہو گی تم اپنے نرم اور گرم بستر میں لیٹو گے۔ تمہارے ساتھ نور کھیلا کرے گی۔ وہ تمہیں نہلانے لے جایا کرے گی وہ تم سے بہت پیار کرے گی' اصل محبت جس میں دل کا پھول کھلتا ہے اور کوئی تمہاری پٹائی نہیں کر سکے گا۔ تم نور کے پاس ہر جلنے والی آنکھ سے محفوظ ہو گے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے اور وہ میری ٹانگوں سے اپنا سر ملتا میرے پاؤں کو سونگھتا۔

کیا وہ ابھی تک نور کا اور مہر کا اور رستم کا PET تھا؟ کیا اس کے جانے سے میں اداس نہیں ہو جاؤں گی۔ میں سر کو جھٹکتی مجھے برائے شیری سے جو محض وقت گزاری کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا اس لگاؤ کا کوئی حق نہیں۔ میں اٹھ کر اوپر کے کاموں لگ جاتی وہ میرا پیچھا کرتا۔ میں کہتی شیری میرے پیچھے مت آؤ' وہیں بیٹھو وہ اپنی شفاف نگاہوں سے میری طرف تکتا رہتا۔ عجیب مخمصے میں پھنس گئی تھی میں۔ جب وہ نور کو دیکھے گا تو اس سے بھی یونہی چاہے گا۔ یہ انسیت کا چکر بھی کیا ہے بھلا۔

میں انسانی فرض سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کرتی رہی اسے نہلانے لے جاتی رہی اس سے باتیں رہتی تاکہ وہ تنہائی محسوس نہ کرے۔ چند دنوں کے لئے مجھے کسی دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ پھر دوستوں کی ضد کی وجہ سے دو چار دن اور رکی رہی۔ گھر میں میرا تھا ہی کیا؟ اماں جن سے اکثر بات بے بات میرا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے خواہی نخواہی الجھتی تھیں اور میں بھی ان کی بات برداشت نہیں کرتی تھی۔ رسہ کشی چلی ہی رہتی۔ میں انہیں ایک بھاری بوجھ لگتی تھی۔ جسے محسوس کر کے ان کا جی دہلتا تھا وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مجھ میں کوتاہیاں اور خامیاں نکالتیں۔ میرے اکیلے پن کو میری بد نصیبی شمار کرتیں۔ اصل حساب تو آدمی کا اپنے سے ہوتا ہے اور اماں کے اپنے حساب میں کہیں گڑبڑ ضرور تھی۔ مجھے دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ بہت اداس اداس رہتیں مجھے کچھ بھلانے ہی نہ دیتیں حالانکہ ان کی دوسری بیٹیاں ان کے بیٹے اور بہوئیں کوئی سال دو سال میں ایک آدھ بار ہی اس گھر میں جھانکتا تھا۔ وہ ان سب کو یاد کر کے روتی رہتیں انہیں پکارتیں خط لکھتیں ان کے لئے دعائیں کرتیں اور میں غصے کے مارے اپنے کمرے میں ابلتی اور جلتی رہتی۔

آخر مجھے اسی قید خانے میں واپس آنا ہوتا تھا۔ میری واحد پناہ گاہ تھا۔

بھونک بھونک کر شیری نے برا حال کر لیا۔ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ میرا بیگ اپنے قبضے میں کر لیا۔ پرس کو مارے غصے کے قالین پر گھسیٹتا رہا۔ صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور مجھے

کونے سے باہر جاتے دیکھ کر کود کر کندھوں پر دونوں اگلے پاؤں سے لٹک گیا۔ عجیب دیوانہ پن سے روتا رہا جیسے خوشی کے بوجھ تلے نہایت پریشان ہو۔ رات جب میں لیٹی ہوں دن بھر کی دھول جھاڑ کر خیالوں کی یورش سے بچنے کے لئے میں نے کروٹ بدلی تو شیری آنکھیں بند کئے میرے ساتھ لیٹا تھا۔ میں ہولے ہولے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ طمانیت سکون اور راحت کے شدید احساس کے ساتھ۔ پھر وہ اور قریب آگیا اور اس نے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے وہ لڑکا یاد آیا جو بحری سفر کے دوران جہاز کے عرشے پر مجھے ملا تھا۔

آغاز شباب میں قدم رکھتا ہوا الہڑ سا شرمایا ہوا سا وہ ہوا خوری کے درمیان مجھ سے باتیں کیا کرتا۔ بچوں کی سی بے ضرر باتیں سمندروں اور ہواؤں طوفانوں اور لہروں کی بادلوں اور آندھیوں کی جھکڑوں اور سمندری مخلوق کی' دریاؤں اور پہاڑوں سے اسے عشق تھا۔ رنگ اسے بے حد پسند تھے۔ مجھے خوبصورت کپڑے پہنے دیکھ کر کھل اٹھتا فرمائش کر تا کہ کل میں نیلے رنگ کی ساڑھی پہنوں یہ بے ضرر سی خواہش مجھے بھی خوش کرتی۔ اسے پھول اچھے لگتے تھے۔ مجھے کہتا اس رنگ میں تم ڈیزی لگ رہی ہو۔ عجیب دیوانہ سا بچہ تھا۔ بیک وقت سمجھدار بھی اور سیدھا بھی۔ ایک شام اس نے فرمائش کی کہ میں اس کے ساتھ ناچوں۔ لہروں کی تیز موسیقی پر ہم قدم سے قدم ملائے اوپر بانہوں کے سہارے جھولتے رہے اور جب ہم ایک نسبتاً تاریک گوشے میں گئے تو اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ مجھے اپنے کمزور بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور مجھ سے اسی طرح لگا کھڑا رہا۔ عجیب کیفیت تھی۔ سکون کی لہریں سرشاری کے ساتھ اس کے سر سے نکل کر میری ساری ہنسی کو ہلکورے دے رہی تھیں۔ سمندر کی طرح اس کی معصوم چاہت نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مجھ پر سے گزرنے لگی۔ سیپ میں بند موتی کی طرح وقت کی موجیں ہم پر سے بہتی رہیں۔

اور اب شیری میرے سینے سے لگا تھا۔ آنکھیں بند کئے گھبرا کر مجھ میں سکون ڈھونڈتا ہوا۔ یہ نور کا اور مہر کا اور رستم کا نہیں میرا شیری تھا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اسے کبھی نہیں لوٹاؤں گی' ہرگز نہیں۔

تعطیلات اور شدید گرمی کے دنوں میں وہ لوگ اماں سے ملنے آئے۔ شیری کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اس ایک سال میں اس نے خوب قد نکالا تھا۔ اس کے ڈر کی وجہ سے کسی اجنبی کو گھر میں آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے آنا کم کر دیا تھا۔ اماں سخت خفا

تھیں۔ آخر سیزر بھی تو اس گھر میں رہا تھا ان دنوں خان صاحب زندہ تھے اور اسے انہوں نے سر پر نہیں چڑھایا تھا۔ مہر سے کہنے لگیں عجیب جنگلی ہو گیا ہے۔ تم اب کے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں چپکے سے یہ سب سنتی رہی۔

میری طرف مڑ کر کہا "جب تم گھر نہیں ہوتی ہو اور میں اسے کھانے کو کوئی چیز دوں تو بالکل نہیں کھاتا مجھ پر بھونکتا ہے اور برآمدے میں بیٹھا رہتا ہے جب تم آتی ہو تو یہ دکھائی ہی نہیں دیتا چاہے بلیاں گھر میں بھری رہیں اور آوارہ کتے دوڑیں لگاتے رہیں۔

مگر اصلی مالکوں کے آنے پر بھی شیری نے کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دم ہلا کر ان کے گرد نہیں گھوما۔ نور سے بھی بس واجبی سا اظہار محبت کیا۔ وہ کھینچ کر باہر لے جاتی تو چلا جاتا اور پھر فوراً آکر میرے پلنگ کے نیچے گھس جاتا۔ وہ چیختی ہوئی مہر سے کہتی "مما شیری بہت بدل گیا ہے۔ بالکل جنگلی ہو گیا ہے۔"

اور مہر کہتی "تسلی رکھو بچے اب ہم اسے ساتھ لے جائیں گے تو اس کی پرانی خوش طبعی عود کر آئے گی۔ یہ تمہارا پیارا شیری بن جائے گا۔ میں چپ رہتی ان کے ارادوں پر جی ہی جی میں ہنستی اور کڑھتی' بھئی کیا' میں نے مہر کو منع کیا تھا کہ وہ اسے یہاں نہ بھجوائے اور میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ ہمدردی کا ان دیکھا رشتہ جو اس کے اور میرے درمیان قائم ہوا تھا' اس میں حالات کا دخل تھا نہ شیری کا اور نہ میری مرضی کا۔ جیسے وقت کے سمندر پر بہتے دو تنکے کسی تند ہوا کے زور سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو جائیں۔ محبتیں جو مجھ سے کی گئی گئیں ان میں میری مرضی تو شامل نہ تھی میرے لئے تو اب ہر شے بیکار تھی اور پھر کسی نے مجھے اتنا کب چاہا تھا کہ میں اس کے دامن سے لگ جاؤں۔ مجھے اس رات کی اپنی زرد روتی ہوئی صورت اکثر یاد آئی۔ وہ کون تھی؟ جس کے آنسوؤں میں اس کا دل بہہ گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر احساس ذلت سے لوٹائے جانے کے درد سے اب بھی بیتاب ہو جاتی تھی۔

اس دن گرمی سخت تھی۔ نور اور رستم شیری کو ٹہلانے لے جانا چاہتے تھے۔ مجھے دخل دینے کا کوئی اختیار تو نہیں تھا مگر میں نے کہا تھا۔

"نور ابھی نہ لے جاؤ دن کو ذرا ٹھہرنے دو شام کو آنے دو ہوا میں خنکی ہو لے پھر جانا۔"

اس نے کندھے اچکائے باپ کی طرف دیکھا اور شیری کو میز کے نیچے سے نکالنے کے لئے اس کے کالر کو کھینچا۔ شیری نے زچ ہو کر اور کوئی راہ فرار نہ پا کر اس کے ہاتھ پر

کاٹ لیا- مہر نے چیخ چیخ کر گھر کو سر پر اٹھا لیا- سب ایک ساتھ چیخ رہے تھے نور شکست اور تکلیف کے احساس سے زمین پر لیٹ رہی تھی- اماں نے جو ان کے جی میں آیا کہا- اگلی تمام تلخیاں انہیں یاد آگئیں- خوب خوب انہوں نے مجھے کو کوسا اور گھر میں فضا ایک دم سخت کشیدہ ہو گئی- رات شیری نے لیٹ کر سختی سے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا- وہ شاید اپنی غلطی پر نادم تھا اور اپنے آپ کو اتنے شور و غل کا قصور وار سمجھتا تھا-

تم بے وقوف ہو بچے' وہ آخر چلے جاتے' نور نے بہر حال تم سے زیادتی کی ہے- تم بہت جلد باز ہو وہ دم سادھے پڑا رہا- میرے ہاتھ کے نیچے بالکل ساکن اور سویا ہوا اور نہایت خوش-

سرگوشیوں میں باتیں ہوتیں' مجھ سے ہر بات چھپائی جاتی' اماں کی اور میری بول چال بند تھی- ہم دونوں میں اور شیری' گویا ذات برادری باہر کر دیئے گئے تھے- کھانا دو مرحلوں میں کھایا جاتا یا پھر میں اپنے کمرے میں کھاتی اور شیری کو بھی وہیں کھلاتی- جب میں کام پر چلی جاتی تب بھی کوئی اس کو نہیں بلاتا تھا آخر وہ کب تک میری پناہ میں رہے گا آخر اسے ان کے ساتھ ہی تو جانا تھا- جیسے جیسے ان کی روانگی کے دن قریب آ رہے تھے میرا ارادہ بھی پختہ ہو گیا تھا-

میں نے اپنے شیری کے لئے ریل میں سیٹ بک کروائی سامان اپنی ایک دوست کی معرفت اسٹیشن بھجوایا- اس دن شام کو معمول کے مطابق میں اسے ٹہلانے کے لئے باہر لے گئی اور ہم مخالف سمت میں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے- جب انہیں پتہ چلا تو کیا ہوا یہ ایک الگ داستان ہے- ان کی ہاؤ ہو کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہر نے عدالت میں حدود آرڈیننس کے تحت میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا جو اس کے چلے جانے اور عدم پیروی کی وجہ سے بالآخر خارج ہو گیا-

شیری اور میں مری سے لوٹ آئے-

اماں کچھ دنوں سخت خفا رہیں پھر جب برف پگھلی اور شدید تنہائی نے انہیں ہراساں کیا تو کہنے لگیں-

"اچھا ہو شیری نہیں گیا تھوڑی رونق رہتی ہے-"

میں اماں سے کیا کہتی کہ اماں اس ڈھنڈار بیکار زندگی میں اس خالی گھر میں میرے آنے پر کوئی تو ہوتا ہے جو محبت سے میری راہ دیکھتا ہے- اچھلتا کودتا اظہار شوق کرتا اور میرے پیچھے پھرتا ہے- میرے قدموں پر لوٹتا ہے- میرے سینے پر سر رکھ کر مجھے سکون دیتا ہے-

ہمک کر میری بانہوں میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھ پر اتنا حق سمجھتا ہے۔ بھلا ٹوٹ کر ایسا کسی نے مجھے کبھی چاہا ہے۔ ملنے والے کہتے ہیں جیسا تم شیری کو چاہتی ہو ایسا تو بہت کم مائیں اپنے بچوں کو چاہتی ہیں۔ "میں ان کی آواز میں چھپے طنز کو سمجھتی ہوں' مگر یہی محبت تو اب میری زندگی ہے وہ میرا محبوب میرا ہمدم میرا ساتھی ہے۔ جب سب طرف سناٹا ہوتا ہے تو اس سے اپنے دل کی باتیں کہتی ہوں اس کو کھوئی ہوئی چاہتوں کے تذکرے سنائی ہوں۔ محبتیں جو مجھ تک پہنچ نہ پائیں اور چھن گئیں۔ لگاؤ جو میرا مقدر نہ بن سکے۔ وہ سارے گزرے نوحے جو جانے والوں کے لئے میرے دل میں بندھے' میں نے شیری کو سنائے اس کے سینے میں میرے راز ہیں' وہ مکمل ساتھی ہے۔ چپ چاپ مجھے کام میں منہمک دیکھ کر تعرض نہ کرنے والا' میری کیفیات میری خوشی غم سب اس پر عیاں' وہ نبض کی طرح میرے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا۔ انسانوں کی محبتوں میں یہ گرمجوشی اور خود سپردگی کہاں ہوتی ہے۔ شیری تو میرے لئے جان سے گزر سکتا ہے۔"

مہر کے ساتھ مقدمہ کے سلسلے میں جس میں میری ایک مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی۔ میرے کاموں میں اس نے بہت دلچسپی لی پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقاتیں بڑھیں میں اپنے دفتر سے آتے ہوئے یا ادھر سے گزرتے ہوئے اس کے پاس چلی جاتی کافی کا پیالہ لے کر ادھر ادھر کی گپ ہوئی شیری کی باتیں اس کی ذہانت اس کی چالاکیاں گھر میں اس کی رونق زندگی میں اس کا مقام' وہ سنتا اور دلچسپی سے یہ سب سنتا مگر اس نے کبھی یہ نہیں کہا وہ شیری کو دیکھنا چاہتا ہے۔ عجیب آدمی تھا۔ اب میں نے الجھنے لگی تھی۔ بھلا وہ کیوں نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہماری دوستی بڑھتی بھی رہی اور اس میں دراڑ بھی پڑتی گئی۔ میرا جی چاہتا وہ مجھ سے شیری کی باتیں پوچھے پھر میں نے محسوس کیا۔ جب میں شیری کی بات کرتی ہوں۔ وہ توجہ سے نہیں سنتا کوئی ادھر ادھر کی کہانی سنانے لگتا ہے۔ اپنی زندگی کے خلاؤں کا ذکر اپنے دکھوں اور ارمانوں کا تذکرہ اپنی دائم المریض بیوی کی بیماری کے عذاب کے قصے اپنی تنہائی کے کرب کا فسانہ اپنی خالی خولی بیکار کا المیہ جس میں پارسائی اور بے رنگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلقات کا کہتا جو کبھی استوار نہ ہو سکے تھے۔ خوابوں اور پرچھائیوں کی سی داستان۔ پتہ نہیں وہ مجھے کیا کہنا چاہتا تھا کیا سمجھانا چاہتا تھا؟ میں جو خوش وقتی گپ اور ذہنی آسودگی کے لئے اس کے پاس چلی جاتی تھی اس کی کیا مدد کر سکتی تھی بھلا۔ کیا ہلکی پھلکی دلچسپی کا دھارا کسی اور رخ پلٹنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

"تم شیری سے ایک جانور سے اتنی شدید بے پناہ محبت کیوں کرنے لگی ہو جبکہ کئی اور

انسان اس سے زیادہ توجہ کے مستحق اور متمنی ہیں۔" اس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی۔ پہلی بار مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔

"اور پتہ ہے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ تمہارے متعلق" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"لوگ کس کس کی کہانیاں نہیں کہتے جناب" میں کھڑی ہو گئی میں کانپتی رہی۔ غصے اور رنج سے۔ دنوں میں ادھر سے نہیں گزری پھر سنا اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اس سال گرمی شدید پڑی، لگتا تھا قیامت اس سے زیادہ کیا ہو گی۔ ریت کے جھکڑ چلتے، آسمان زرد گرد کے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جو نہ برستی تھی اور نہ ہٹتی تھی بس عجیب ریزہ ریزہ ہو کر وجود کو ہکاتی تھی اور گھٹن اتنی تھی کہ سانس رکتا ہوا لگتا تھا۔ کمروں میں بھی پناہ نہ ملتی، میں شیری کو دیکھتی کہ اس کی آنکھیں زرد ہوئی جاتی ہیں وہ بہت کم جاگتا اور نہلائے جانے کے باوجود گرمی کی لپٹیں اس کی سانس سے نکلتی تھیں۔ برف کا بلاک منگوا کر میں کمرے میں رکھتی آگ برساتا ہوا پنکھا اور کولر کچھ نہ کر سکتے۔ شیری دن بدن گھلتا جا رہا تھا میں اسے تسلی دیتی، جی سے لگاتی۔

"شیری ہمت پکڑو یہ ذرا سے سخت دن ہیں، نکل جائیں گے۔ موسم بدلے گا گرد چھٹ جائے گی، مزیدار سردی آئے گی اب کے دیکھنا خوب ہڈیوں کا گودا جمانے والی ٹھنڈ پڑے گی تمہارے وطن کی طرح میرے لاڈلے میں تمہارے لئے کڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں اگر اماں کا بڑھاپا نہ ہوتا گھر میں کوئی اور ہوتا میرے وسائل ہوتے تو میں تمہیں کسی ٹھنڈے پر سکون خطے میں لے جاتی میرے چاند حوصلہ رکھو" میں اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتی جو اس کی کھال کو چھوتے تو بخار کا احساس ہوتا۔ وہ ذرا سی عف عف کرتا۔ میں بے تاب ہوتی میں کیا کر سکتی تھی۔ اپنے پیارے کے لئے اس اجنبی کے لئے اس پردیسی کے لئے۔

مہر کا تار آیا رستم کی طبیعت سخت خراب تھی وہ ہسپتال میں تھا۔ نور اکیلی تھی اور پردیس میں تھی اماں کو بلوایا تھا۔

اماں نے کہا تم چلی جاؤ نا آخر بہن ہو مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جاتا میں اس کے کس کام کی ہوں گی۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اسے معاف کر دو۔ شیری کو اس حال میں چھوڑتے ہوئے میرا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا مگر مجبوری تھی ہائے میں کیا کروں۔

اماں نے کہا تم فکر نہ کرو میں یہاں گھر پر اس کی خوب دیکھ بھال کر لوں گی۔ روانہ

ہونے سے میں نے برف والے کو تاکید کی کہ وہ روز بلاک خود کمرے میں رکھ جایا کرے۔ الماری میں تقریباً سامنے میں نے دوائیاں۔ بسکٹ ضروری سامان رکھ دیا تاکہ ضرورت پڑنے پر ڈھونڈنے میں تکلیف نہ ہو۔ جاتے ہوئے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ میں دروازے میں سے پلٹ آئی۔ شیری آنکھیں موندے لیٹا تھا اور گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا۔ سینے سے لگا کر میں نے اس کے کان میں کہا شیری میں جلد لوٹ آؤں گی گھبرانا نہیں۔بس یوں سمجھو میں گئی اور آئی۔

جدہ میں خلاف توقع مجھے زیادہ دن ٹھہرنا پڑا رستم پر دل کا جان لیوا دورہ پڑا تھا اور وہ بہت آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا۔

اماں کا فون آتا' مہر نہایت دھیمے سروں میں بات کرتی بڑی غم ناک ہوتی' مجھے بھی اس پر ترس آتا۔ کبھی کبھار کہتی اماں تمہارا پوچھ رہی تھیں' خیریت سے تھیں' رستم کے لئے نہایت فکر مند تھیں مگر اپنی صحت کی وجہ سے نہیں آ سکتیں۔ میں اس سے یہ نہ کہہ پاتی کہ اب کے جب اماں کا فون آئے تو شیری کا بھی پوچھ لینا۔

جس دن ڈاکٹروں نے اطمینان کا سانس لیا' اور رستم کی حالت کو خطرے سے باہر قرار دیا' مہر آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور اس کے چہرے پر رونق آئی میں نے اس کے منع کرنے کے باوجود اپنی سیٹ بک کروا لی۔

آخر جلدی کیا ہے' تمہیں' اماں کی خیریت تو معلوم ہو ہی جاتی ہے یہاں سے تار دے کر چھٹی بڑھوائی جا سکتی ہے۔ بس اب میں جانا چاہتی ہوں' شیری بیمار تھا۔

اپنی ساری کمینگی کو آواز میں بھر کر اس نے کہا "اوہ" اور پھر پلٹ کر تیزی سے کہنے لگی "اگر وہ نہ رہا تو تم بیوہ تو نہیں ہو جاؤ گی۔" میں اس کے گھر میں اس کے شوہر کی تیمارداری کے لئے مصیبت میں شریک ہونے کی خاطر اتنی دور سے آئی بیٹھی تھی اور وہ مجھے شیری کے طعنے دے رہی تھی۔ بنا اس سے مزید بات کئے میں سامان لے کر ائرپورٹ آ گئی۔

گھر میں سب طرف عجیب سناٹا تھا حالانکہ دن کے تقریباً دس بجے تھے اماں ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ کمروں میں ادھر ادھر دیکھتی شیری کو پکارتی میں اندر آئی۔ شیری اپنے وجود کا سایہ لگ رہا تھا۔ سہما ہوا گھلا ہوا۔ اس کے پاس جھک کر میں نے پکارا' شیری دیکھو میں آ گئی ہوں۔

نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ ہلکے سے عف کر کے رہ گیا۔ میں نے

اس کے سر کو سہلایا' شیری- شیری! میں نے زور سے پکارا- اماں کہنے لگیں تمہیں میں نے مہر سے کہلوایا تو تھا کہ شیری سخت بیمار ہے وہ بھی دکھی ہو رہی تھی-

میں بھاگی ڈاکٹروں کو فون کیئے دعا کرتی رہی خدا سے میں نے کہا-

"دیکھ اگر تو نے مجھ سے شیری لے لیا تو میں تیری ہستی میں یقین کرنا چھوڑ دوں گی- اگر تجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تو مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا- تیرا خیال ہے تیری اس دنیا میں محبت کی روشنی کے بنا پر جیا جا سکتا ہے؟ اتنے گہرے اندھیرے تو نے بنائے ہیں' کیا اجالے کی ایک کرن دینے کا بخل بھی نہیں کرنا چاہتا- تو سنتا ہے کہ نہیں یہ چاہنے والی آنکھیں ہیں انہیں بے نور نہ کر الفت بھرا دل ہے اسے دھڑکنے کے لئے چھوڑ دے-"

مگر وہ آسمانوں پر کہیں دور بیٹھا جانے کس تانے میں کونسا بانا پرونے میں مگن تھا کہ اس نے میری بات سنی ہی نہیں' پتہ نہیں وہ کیوں مجھ سے خفا تھا کہ اس نے میری تڑپ کا کوئی جواب ہی نہیں دیا- ڈاکٹروں کی ساری بھاگ دوڑ بیکار گئی-

مہر میں بیوہ ہو گئی -

اماں نے کہا "وہ تو تمہارے جاتے ہی سخت بیمار ہوگیا تھا میں بے آس تھی مگر پتہ نہیں کیسے اتنے دن تمہارے انتظار میں جی لیا- اپنے طور پر میں ڈاکٹروں سے علاج کروایا تھا- تم سمجھتی نہیں ہو مجھے بھی اس کی بہت پرواہ تھی بڑی رونق رہتی تھی اس کی وجہ سے-"

میرا دل ایک ویرانہ تھا جس تیز غم ناک آندھیوں کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا- اذیت اور بے چارگی نے میرے دل کو مسل کر رکھ دیا- یہ ایک جانکاہ عذاب تھا- جس کا اس سے پہلے میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا' تب بھی نہیں جب میں نے اس کا دل زیبا کی طرف سے اپنی طرف لگانا چاہا تھا- بے خواب راتیں تاریک دن صرف ایک ہی خیال تھا ہائے شیری نے میرے لئے کتنی اذیت برداشت کی' آخر کیوں کی؟

اور اب وہ سب مجھے یاد آتے ہیں شیری کے پیچھے وہ سب-

وہ جو کبھی میری راہوں سے گزرے میں جو کبھی ان کی راہوں میں آئی-

کیا آدمی اتنی بے ریا بے لوث بے پایاں محبت کرنے اہل ہے؟

***

خواتین افسانہ نگار
۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک
مرتّب
کِشور ناہید

ادب لطیف

جلد نمبر ۴۶ ——— ٹیلیفون نمبر ۲۰۰۹ ——— شمارہ ۱

بانی چودھری برکت علی مرحوم

ماہنامہ ○ لاہور

ادبِ لطیف

مرتب ——— میرزا ادیب

مینجنگ ایڈیٹر ——— افتخار علی چودھری

زرِ سالانہ :- پاکستان میں -/۸ روپے غیر ممالک -/۱۲ روپے

فی کاپی دس آنے

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۲/۵۲۱/۵۳۵۰۶ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء و ۲۷۷۶ مورخہ ۲۹ اکتوبر ۵۴ء

...... بموجب سرکلر نمبر ۱۵۴۴ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء

○

چوہدری افتخار علی پرنٹر پبلشر نے اردو پریس سے چھپوا کر مکتبہ اردو سے شائع کیا۔

ترتیب

پیرایۂ آغاز .... مرتب ۳

انشائیے

دل سے واپسی پر ..... ڈاکٹر وزیر آغا ۴

افسانہ

خزاں بدوش بہار و خارِ زہر آلود ...... سید خلیل احمد ۹

خالی گھر .... جمیلہ ہاشمی ۴۶

کرشن مہاراج ...... ستیندر سنگھ ۵۸

نظم

گواہی .... مصطفیٰ زیدی ۶۱

کاغذی پھول ...... بلراج کومل ۶۲

غمِ رائیگاں ...... جلیل حشمی ۶۳

کھلی ہے راہ تمنا ...... وامق سلیم ۶۶

مقالہ

سرو چراغاں ...... ڈاکٹر سید عبداللہ ۶۷

مرتب

پیرایۂ آغاز

سید خلیل احمد کا رومانی شاہپارہ "خزاں بدوش بہار و خارِ زہر آلود" اس نمبر میں ختم ہو رہا ہے۔ اس افسانے کے ساتھ دو ایسے افسانہ نگاروں کی افسانوی نگارشات بھی اشاعت پذیر ہو رہی ہیں جو اس سے پہلے کبھی ہماری محفل میں نہیں آئے ہماری مراد جمیلہ ہاشمی اور سِتیندر سنگھ سے ہے جمیلہ ہاشمی کا غالباً یہ پانچواں افسانہ ہے اور یہ پانچوں کے پانچوں افسانے موجودہ دَور کی تحریروں میں خاصے نمایاں رہیں گے۔ جمیلہ فکر و اسلوب کے اعتبار سے بلونت سنگھ سے کافی قریب ہیں۔ بلونت کی طرح ان کے افسانے پنجاب کی مخصوص دیہاتی فضا میں سانس لیتے ہیں اور پھر بلونت ہی کی طرح ان کے افسانوی کردار بھی رسکھ ہیں۔ (بلونت کے برخلاف یہ کام جمیلہ کے لیے نسبتاً مشکل ہے) ماحول آفرینی میں بھی دونوں کے قلم مشاہدے کی سطح پر جو نقش و نگار بناتے ہیں وہ بہت حد تک بے عیب ہوتے ہیں مگر ایک فرق عموماً محسوس ہوتا ہے۔ بلونت جہاں حقیقت نگاری میں جذباتیت کو قریب تک نہیں آنے دیتے (پہلا پتھر کے آخری حصے کے علاوہ) وہاں جمیلہ (شاید نسوانی فطرت کے تقاضے پر) دردمندی اور گھلاوٹ سے الگ نہیں رہ سکتیں۔ ممکن ہے آگے چل کر ان کا ترقی یافتہ شعورِ حقیقت کی سنگینی ہی کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائے ــــ جیسا کہ اس افسانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں "برہا کی رات" والی دردمندی اور گھلاوٹ دکھائی نہیں دیتی ــــ یا کم از کم بہت کم محسوس ہوتی ہے!

شاید بعض پڑھنے والوں کو ہماری اس رائے سے اتفاق ہو کہ اس افسانے میں اگر افسانہ نگار پسند کرتیں تو کسی حد تک ایجاز و اختصار سے کام لے سکتی تھیں جس سے افسانے کا فنی پہلو زیادہ واضح ہو جاتا!

ستیندر سنگھ نے اپنے چھوٹے سے افسانے میں بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ ایسی بڑی بات جسے نظر انداز کرنے ہی سے معاشرے میں خرابی پیدا ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔

○

ادبِ لطیف کے اس نمبر میں غزل کا حصہ شامل نہیں کیا جا سکا جس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔

○

ادبِ لطیف کے آئندہ نمبر سے مستقل موضوعات، جو کچھ مدت سے بند ہو گئے تھے از سرِ نو شروع ہو رہے ہیں۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ ان موضوعات کے علاوہ اور عنوانات بھی قائم کئے جائیں!

○

دو ماہ سے کسی کتاب پر ریویو نہیں چھپ سکا۔ ہم ان ناشرین کرام سے معذرت خواہ ہیں جن کی مطبوعات دفترِ ادبِ لطیف میں پہنچ چکی ہیں۔ آئندہ یہ سلسلہ بھی باقاعدہ شروع کر دیا جائے گا۔

○

جمیلہ ہاشمی

خالی گھر

اس دن ننگل میں دوپہر کے بعد سے ڈھول پٹنا شروع ہو گیا۔ پروا ہوا چل رہی تھی۔ مٹی مٹھیاں بھر بھر جیسے کوئی منہ پر پھینکے۔ ہمارے گرد اڑ رہی تھی۔ لوگ خوشی سے گھوم پھر رہے تھے۔ عورتیں اونچی جگہوں میں کھڑی ہو کر اچک اچک کر اس طرف دیکھ رہی تھیں۔ جدھر کشتی ہونے والی تھی۔ ڈھول متواتر نہاڑ کے ایک ہی تال پہ بجایا جا رہا تھا۔ تگ دھڑنگ بچے۔ ڈھیلی قمیصوں والے اکڑی مونچھوں والے لاٹھیوں والے سرخ آنکھوں والے۔ کیسری پگڑیوں والے جوان اکھاڑے کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ ڈھول والا لمبا کرتا پہنے گلے میں ڈھول لٹکائے بجاتا جا رہا تھا۔ گاؤں کی خاموشی میں ایک زلزلہ سا آ گیا تھا۔ پکوڑے بیچنے والے زور زور سے آوازے لگاتے جلدی جلدی اونچی نیچی گلیوں کو پھلانگتے آ رہے تھے۔ اصل میں آج مجھے گاؤں کے پہلوان موتا سنگھ سے کشتی لڑنا تھا۔ میں نے اُسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چند دن ہوئے ملایا سے لوٹا تھا۔ میرے بھی ایک دو یار اس گاؤں میں تھے۔ چوپال میں موتا سنگھ ان سے ملا۔ تو شیخی بگھارنے لگا۔ میں نے یوں انگریزوں سے کشتی لڑی ہے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے میرے یاروں کو بھی "تاؤ" آ گیا کہنے لگے جوان چانن سنگھ چھوٹے ننگل والا بڑا تگڑا جوان ہے اس کو پچھاڑو تو جانیں۔ اور یوں بنا میرے پوچھے میرے مقابلے کی بات ہو گئی۔ چھوٹا ننگل بڑے ننگل سے یہی کوئی پانچ مربّوں کے فاصلے پر ہے۔ پنڈتوں کے گھر سے ذرا آگے چل کر اونچی گلی کے آخری سرے پر کھڑے ہوں تو چھوٹے ننگل کے گھر نظر آتے ہیں۔ ڈاک خانے والوں کو بڑی غلطی لگ جاتی ہے۔ کئی دفعہ ڈاک ایک گاؤں کی دوسرے گاؤں میں چلی جاتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ کہ ایک بار موتا سنگھ نے ملایا سے اپنی بہن کے نام منی آرڈر بھیجا تو کئی دن تک وہ ہمارے چھوٹے ننگل میں گھومتا رہا۔ مگر یہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ ان دنوں مدرسے کا منشی جو ڈاک بابو بھی ہے۔ نیا نیا آیا تھا اور موتا سنگھ کو جانتا ہی نہ تھا۔ یوں بھی وہ پندرہ سال بعد ملایا سے لوٹا تھا۔ اور جن دنوں وہ گیا ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کو کیا جانتے ہوں گے۔ میں شہر میں بڑے چاچا کے پاس ہوتا تھا۔ میرے باپو کو مجھے بابو بنانے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے چاچا کے پاس مجھے شہر بھجوا دیا۔ پانچ سال وہاں رہنے کے بعد بھی جب میں لٹھ گنوار جاہل رہا۔ اور انگریزی کا قاعدہ پانچ حرفوں سے آگے نہ پڑھ سکا آخر چاچی بھی میرے زیادہ روٹیاں کھانے سے تنگ آ گئی تو باپو مجھے گاؤں لے آیا۔

مگر بات تو میں جب کی کر رہا ہوں۔ جب مجھے موتا سنگھ ملایا والے سے کشتی لڑنا تھا۔ یاروں نے میرا بڑا دل بڑھایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ہماری لاج رکھ لینا۔ وہ سات سمندر پار سے آیا ہے۔ تو شیخیاں بگھارتا ہے۔ اس نے انگریزوں سے کشتیاں لڑی ہوں گی۔ کبھی چھوٹے ننگل والے ہمارے چانن سنگھ کے ہاتھ نہیں دیکھے ہوں گے۔ اُسے مزا چکھا دینا۔ ہماری ہیٹی نہ ہو۔ شام سنگھ نے میرے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملا تھا اور پھر وہ سارے داؤں مجھے پہلے سے یاد تھے۔ اور بات بھی کوئی نہ تھی۔ میں ہنستا کھیلتا اپنے ننگل سے بڑے ننگل کی طرف چلا۔ جو گھوڑی میرے نیچے تھی۔ اس کی کمر میرے بوجھ سے جھکی جاتی تھی۔ میں نے آتے ہوئے گھر کے چھبیس سال

کے پرانے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ میری بہن نے سر پر سے تیل مالش وارے تھے۔ اور جب میں دروازے سے نکلا ہوں تو مجھے ماں نے بڑی دعائیں دی تھیں۔ پھر جب تک میں گلی کا موڑ مڑ نہیں گیا ہمسائے کی عورتیں ماسیاں۔ چاچیاں ساری کوٹھوں پر مجھے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں۔ اور ڈھول کی آواز ہمارے گاؤں میں بھی آ رہی تھی۔ دُور سے جیسے مکھیوں کا چھتا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے گاؤں کے اُوپر سے گذر رہے یا ٹڈیوں کی فوج اڑتی ہوئی گذر جائے۔ گاؤں سے باہر نکلے ہیں تو کڑیں سے گذرتے ہوئے ایک سانپ گھوڑی کے سُموں تلے نہ جانے کس طرح آ گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ دُم اور سر کے عین بیچوں بیچ دو ٹکڑے۔ اور دونوں حصے الگ الگ تڑپتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے موتا سنگھ کون سے داؤں جانتا ہو۔ وہ کس طرح کا آدمی ہو۔ اگر میں نے اُسے گرا لیا تو کہیں وہ میرا دشمن ہی نہ بن جائے۔ دوست بنانا بہت مشکل ہے۔ میرے دونوں یار شام سنگھ اور کرتا سنگھ خواہ مخواہ ہر ایک سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ اب یہ دیکھو بنا کسی بات کے یہ جھگڑا کھڑا کر لیا۔ ایسی باتیں رہ رہ کر میرے دماغ میں آ رہی تھیں۔ ہوا چل رہی تھی۔ گاؤں کے راستوں اور پگ ڈنڈیوں پر پتے اڑ رہے تھے۔ گندم کے کھیتوں میں کچی بالیں جھونکوں سے دوہری ہو رہی تھیں۔ درختوں کے ٹھنڈے سایوں تلے اندھیرا سا لگتا تھا۔ نہر کے پانی کی آواز کبھی ہوائی لہروں سے قریب اور دور ہوتی جاتی تھی۔ ڈھول برابر بج رہا تھا۔ چھوٹے ننگل کے لوگ میرے خاندان والے میرے یار اور ان کے یار۔ جوان ہوتے ہوئے لڑکے۔ ننگل کے لوگ یہاں تک کہ تین چار گاؤں دُور کے لوگ تھے۔ میں کوئی ایسا پہلوان نہیں تھا۔ جس کی دھوم دور دور ہو۔ موتا سنگھ پندرہ سال بعد وطن لوٹا تھا۔ پھر بھی لوگ اُسے جانتے تھے۔ سفید داڑھیوں والے کہہ رہے تھے کہ بھئی وہی پنڈتوں والا موتا سنگھ۔ بھئی وہی ایشر داس والا۔ اکھاڑے کے پاس کھڑے بوڑھے اپنے ننگے پاؤں سے مٹی جھاڑتے۔ اپنی تیل والی جوتیاں بغلوں میں دبائے ایک دوسرے کو موتا سنگھ کی بات نئے سرے سے سنا رہے تھے۔ موتا سنگھ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اور سورج ہولے ہولے نیچا ہونے لگا تھا۔ اکھاڑے کی نرم مٹی سے سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اور گرد کے ساتھ نتھنوں میں جا رہی تھی۔ پاس ہی ٹھہرے ہوئے پانی کا ایک ٹکڑا تھا۔ پانی پر لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اور لہروں کے ساتھ آسمان بھی ہلکورے لیتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ذرا اور دور سفید بطخیں قطار باندھے ہولے ہولے نازک کشتیوں کی طرح پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ سیاہ پانی پر سفید بطخیں۔ کنارے ایک اجڑا سا کھجور کا درخت تھا۔ یہ سب کچھ کتنا پُرسکون اور صدیوں پرانا لگ رہا تھا۔ بطخیں اور یہ پانی۔ یہ درخت، یہ سب چیزیں کتنی خاموش اور ہمارے وجود سے کس قدر بے خبر تھیں۔ میں سوچتا بھی جاتا تھا۔ اور باتیں کرتے ہوئے ان سب چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے ننگل میں طاقچے میں رکھے پرانے شیشے میں اپنی شکل مجھے کسی اجنبی کی شکل کی طرح مدھم مدھم یاد آ رہی تھی کیا میری شکل پر رُعب تھا؟

پھر ایک طرف سے آدمیوں کی ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ لوگ موتا سنگھ کو لے آئے تھے۔

اُس نے انگریزی فیشن پر اکھاڑے سے باہر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر ہم دونوں اکھاڑے میں اترے۔ چپ چاپ خاموش ہم دونوں لوگوں کے شور میں بڑے سکون کے ساتھ ایک دوسرے کو گرانے کے لیئے زور لگا رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور پھر بھی اپنی طاقت کا آخری داؤں لگانے کے لیئے بے قرار تھے۔ ہولے ہولے جیسے کسی مشین کے پیچ کھولے جا رہے ہوں۔ میری طاقت کے بند ڈھیلے پڑنے لگے۔ بظاہر میں اسی طرح طاقت ور تھا۔ ہوشیاری سے اپنے دشمن کو پچھاڑنے کی سوچ رہا تھا۔ مگر دراصل چاہتا تھا کہ وہ جیت جائے۔ میں اس سے کہیں چھوٹا تھا۔ پندرہ سال کے بعد وطن لوٹ کر اس کا غرور کیوں ٹوٹے۔

موتا سنگھ میرے دل کی بات سمجھ گیا۔ کہنے لگا، چانن سنگھ جوان میں سستی جیت نہیں لینا چاہتا کیا تم مجھے اپنے مقابلے کا نہیں سمجھتے جو ہولے ہولے مجھے جیتنے کا موقعہ دے رہے ہو۔" میں نے کہا: "تم سے کس نے کہا میں جیتنا نہیں چاہتا جوان؟"

تو پھر زور لگاؤ۔

میں سارا زور لگا چکا ہوں۔

ہم ایک دوسرے کو دھکیلتے رہے۔ اُس نے مجھے گرا دیا۔ میرے یار میری طرف دوڑے کہنے لگے کوئی بات نہیں چانن وہ تو پڑا پرانا پہلوان ہے۔ آج سے بیس سال پہلے کشتیاں لڑتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا پھر کیا ہوا۔ انہوں نے میرے گلے میں بھی ہار ڈالے اور موتا سنگھ کے گلے میں بھی۔ پھر موتا سنگھ نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مجھے گلے لگایا۔ یہ سارے طریقے اس نے دوسرے ملک میں انگریزوں سے سیکھے تھے

جب شور ختم گیا۔ اور میں اپنے گاؤں جانے کے لیئے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ میرے یار میرے ساتھ جانے کے لیئے اپنی اپنی گھوڑیوں کی باگیں موڑنے لگے تو موتا سنگھ میرے پاس آیا۔ اس نے کہا چانن سنگھ جوان آج رات میرے گھر کی مٹھائی کھاؤ۔ تم بھی اور تمہارے یار بھی۔ کیوں جوانو اُس نے اُن سے پوچھا۔

کیوں بجاؤ پھر کبھی سہی آج ابھی اتنی تکلیف کیوں کرتے ہو۔

یہ طریقہ ہے جوان۔ یہاں پر ہوٹل تو نہیں ہیں۔ کہ میں تمہیں کھانا کھلا سکوں۔ ہاں تم لوگ آج میرے مہمان ضرور ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ بھئی سوچ کیا رہے ہو۔ اترو آؤ نیچے آؤ۔ میں گھر کہہ آیا تھا تمہاری روٹی پکی ہو گی۔ میں نا کچھ کہے گھوڑی سے نیچے اترا میرے یار بھی اتر آئے۔ موتا سنگھ نے میری گھوڑی کی باگ اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ اور ہم اونچی گلیوں اور نیچی گلیوں۔ روڑی کے ڈھیروں نالیوں کے گندے پانی کو پھلانگتے کچی دیواروں کا سہارا لیتے اس حویلی کی طرف جانے لگے۔ جو پنڈتوں کے ویران گھر کے پاس ہو کر آگے کی طرف ذرا گاؤں کے کنارے ہے۔ اور ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ آباد بھرے گاؤں میں صرف یہ گھر ہے جس میں کوئی نہیں رہتا سخت سے سخت بارشوں نے بھی جس کی دیواروں میں سوراخ نہیں کیئے۔ چھتیں اسی طرح ہیں۔ کوٹھوں پر گھاس اُگ آئی ہے۔ باہر کی دیوار اب تقریباً ڈھے گئی ہے۔ اور کھلے دروازوں سے کوٹھڑیوں میں نظر جاتی ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو پٹ کبھی بند ہوتے اور کبھی کھلتے ہیں۔ جیسے روحیں آپس میں گلے مل کر بین کر رہی ہوں۔ نکڑ پر چھوٹا سا گھر۔ دو کوٹھڑیاں آگے۔ آنگن اور اس کے ساتھ کسی زمانے میں مٹی کی بنی ہوئی سیڑھیاں ہوں گی۔ ایک طرف نیچی سی پھوس کی چھت کے نیچے چوکا بنا ہوا۔ آباد ہو گا تو اس گھر میں ذرا سی خوشی سے بھی طوفان آ جاتا ہو گا۔ روشنی طغیانی کی طرح دیواروں سے اُبلنے لگتی ہو گی۔ کوئی زور سے بات کرتا ہو گا تو گلی میں سے گذرنے والوں کے کانوں میں بھی ہر بات پڑتی ہو گی۔ ہم موڑ کے قریب پہنچے ہیں۔ تو اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ شام کا تارا زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ آسمان پر اور بھی اکے دُکے تارے گاؤں کے لڑکوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلنے نکل آئے تھے اور نیل چھت اور قریب آ گئی تھی۔

ہماری گھوڑیاں جنہنائی موریوں کی سی چال چلتی ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ گلیوں کی نالیوں کو بڑی شان سے پھلانگتی ہوئی اُن کے گرم سانس بھی ہمارے منہ پر اور کبھی کانوں کے قریب آ لگتے۔ ہوا میں اناج کی خوشبو تھی۔ اور گرد بھی تھی۔ ہمارے پاؤں اور گھوڑیوں کے پاؤں کی آواز سن کر شاید پنڈتوں کے گھر میں ایک اُلو چیختا اور پر پھڑپھڑاتا ہوا ایک کوٹھڑی سے نکلا۔ اور ہمارے سروں پر سے چکر لگا کر دوسری کوٹھڑی میں گھس گیا۔ میرے یار شام سنگھ نے کہا: "مائی درلی کی آتما ابھی تک روتی پھرتی ہے۔" میرے دوسرے یار نے زور زور سے

جپ جی کی ایک دو پوڑیاں جو اُسے یاد تھیں پڑھنی شروع کر دیں۔ موتا سنگھ نے قدم ذرا تیزی سے بڑھائے۔ شام سنگھ پھر بولا۔ "کیوں موتا سنگھ جوان یہ مائی درگی کی آتما ہی ہے نا۔ میں نے سنا ہے تم پر بھی اس سلسلے میں مقدمہ بن گیا تھا۔ بات تو بڑی پرانی ہے۔ پر کیا بات تھی" موتا سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ شام سنگھ بھی چپ ہو گیا۔ اور ہم نیچی دیواروں والے گھروں کے پاس سے گذرتے رہے۔ اندر کوٹھڑیوں میں دیئے جل رہے تھے۔ عورتوں کے بولنے۔ بچوں کے رونے۔ آدمیوں کے کھنگھارنے بیلوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کے بجنے اور روٹیاں پکنے کی ملی جلی صدائیں ہمارے آگے پیچھے تھیں۔

موتا سنگھ کا گھر آ گیا۔ حویلی کے باہر ہی اس کے بھائی نے ست سری اکال کہہ کر ہماری گھوڑیوں کی باگیں پکڑ لیں۔ اور انہیں صحن میں لے جا کر ایک طرف باندھ دیا۔ بہت سے جوان اکٹھے ہو گئے۔ جو آج سارے کشتی دیکھنے گئے ہوں گے۔ سب نے چارپائیوں سے اُٹھ کر باری باری ہم سے ہاتھ ملائے۔ آنگن میں رنگین پایوں کے بڑے بڑے پلنگ تھے۔ اور ان پر نئے کھیس بچھے تھے۔ ہمیں سب سے اُونچے پلنگ پر بٹھا کر موتا سنگھ چوکے کی طرف گیا۔ جہاں چولہے میں تیز آگ جل رہی تھی۔ اور اس کی بہن کچھ پکا رہی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں نے آ کر ہمارے سروں پر پیار کیا۔ اور ہمیں اشیرباد دے کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ دونوں ہاتھ پیچھے اپنی پیٹھ پر رکھ کر جھک کر چلتی تھی۔ اس کے بالوں میں دیئے کی روشنی سے چمک تھی جیسے چاندی ہو۔ پرے بڑی بڑی کوٹھڑیوں میں لالٹین جل رہی تھی۔ اور موتا سنگھ کی ملایا کی بیوی اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ جن سے وہ انگریزی زبان میں بات چیت کر رہی ہوگی۔ اس کی بہن کے بچے پیچھے سے ایک دوسرے کے کرتے پکڑے گھوڑیوں کے قریب ریل گاڑی کھیل رہے تھے اور شور کر رہے تھے۔ نائن کوٹھڑی میں سے تھال لا کر ان میں کھانا پروس رہی تھی۔ کنبے کی اور عورتیں بھی چوکے میں بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں لگی تھی۔ پیڑھیوں پر بچے سو رہے تھے اور عجیب گہما گہمی تھی۔

پھر موتا سنگھ نے ہمارے ہاتھ دھلائے۔ اور اس کے بھائی نے ہمیں ہاتھ صاف کرنے کو تولیہ دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر کھانے کے تھال ہمارے سامنے رکھنے شروع کر دیئے۔ کنبے والے بھی دوسرے پلنگوں پر بیٹھے تھے۔ اوپر تک بھرے تھالوں میں چاولوں پر پسی ہوئی بورا چینی پر گرم گرم گھی کے پڑنے سے سوندھی خوشبو بھوک کو اور بھی تیز کر رہی تھی۔ سویاں تھیں اور کھیر تھی۔ ٹھنڈی جمی ہوئی مزے دار۔ پراٹھے تھے اور بھاجیاں تھیں۔ دہی بڑے تو بہت ہی لذیذ تھے۔ موتا سنگھ میرے پاس بیٹھا تھا اور بار بار اصرار کر کے مجھے اور کھانے کو کہتا جاتا تھا۔ دوسروں سے بھی کہتا۔ اس کا بھائی دوسرے پلنگوں پر بیٹھے کنبے والوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ نائی ساتھ ساتھ پانی دے رہا تھا۔ سب لوگ ڈٹ کر کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں ملایا کی چائے بڑے بڑے شیشوں کے گلاسوں میں پلائی۔ چھوٹے ننگل اور بڑے ننگل کی باتیں ہونے لگیں۔ گاؤں میں ہر کوئی ہر کسی کو جانتا ہے۔ شام سنگھ کہنے لگا۔ "اچھا بھئی مجھے تو اب گھر جانا ہے۔ سویرے سویرے مجھے جنڈیالے کسی کام سے جانا ہے۔" موتا سنگھ کہنے لگا چھوڑ جوان آج رات مل کر بیٹھے ہیں کون جانتا ہے۔ اگلا دن کیسا آئے۔ اور سورج ہمیں کہاں لے جائے۔ آ سارے یار مل کر بیٹھے ہیں چار گھڑی باتیں کریں۔ مگر شام سنگھ نہ مانا۔ جب اس نے اپنی گھوڑی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور موتا سنگھ اُسے رخصت کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ "جوان پنڈتوں کے گھر کے قریب سے نہ گذرنا۔ ذرا چکر تو پڑے گا دوسری طرف سے ہو کر جانا۔"

اچھا شام سنگھ نے زور سے کہا۔ اور پھر موتا سنگھ سے کہنے لگا۔ کبھی یہ بھی سنا ہے کہ چھوٹے ننگل کے جوان مائی درگی کی آتما سے ڈریں

تیرا کیا خیال ہے میں کدھر سے جاؤں؟

موتا سنگھ کہنے لگا۔ اگر کسی جوان کا بھوت ہو تو اُس سے نہ ڈرو۔ تو بھی کوئی بات نہیں۔ پھر یہ عورت کا بھوت ہے۔ عورت زندہ ہو تو بھی اور مرگئی ہو تو بھی ڈرنے کی شے ہے جوان۔ میرا تو خیال ہے۔ بھگت سنگھ کی بات مان ہی لو۔ ذرا چکر پڑے گا تو کیا ہے دوسری طرف سے ہی چلے جاؤ۔

تم بھی تو ڈر کر ہی ملایا چلے گئے تھے نا۔ اور اب پندرہ سال کے بعد لوٹے ہو۔ شام سنگھ نے گویا چڑانے کے لیئے کہا۔

ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔ موتا سنگھ نے کہا۔ پندرہ سال بعد اگر اب بھی مجھے رام دئی دکھائی دے جائے تو میں پھر بھاگ جاؤں گا۔ میں مائی دورگی کی آتما سے نہیں ڈرتا۔

بھئی موتا سنگھ پلنگوں پر بیٹھے ہوؤں میں سے کسی ایک نے کہا۔ تم ملایا چلے گئے تھے پر ہمیں اس بات کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ جب مقدمہ ختم ہو گیا تھا پھر یکایک تمہیں کیا ہوا تھا تم گراں کیوں چھوڑ گئے۔ اب یہ بات چل ہی پڑی ہے۔ تو ہمیں بتاؤ آخر کیا بات تھی؟

شام سنگھ گھوڑی سے نیچے اتر آیا۔ بولا چلو بتاؤ پھر۔ تو میں بھی نہیں جاتا۔ جنڈیالے کا کام بڑا ضروری ہے۔ پھر اب یہ بات سن کر ہی جاؤں گا۔ موتا سنگھ چپ چاپ آکر واپس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بھائی نے حویلی کے بہت بڑے صحن میں چارپائیاں دوسری طرف بچھا دیں۔ بھگت سنگھ بولا۔ نہ جانے ہماری باتیں کب ختم ہوں۔ بچے بلے آرام ہوں گے۔ کیوں نہ باہر والی حویلی میں چلو۔

حویلی میں سجاہت میٹھی لگ رہی تھی۔ فضا میں پہلے دنوں کا چاند ڈوب رہا تھا۔ ہوا میں کوئی آواز نہ تھی۔ پھر بھی لگتا تھا جیسے کہیں سے سہانی بانسری کی میٹھی دھنیں کان میں پڑ کر شہد بن کر خون میں گھلی جاتی ہیں۔ ملایا کی شراب کی دو بوتلیں کسی کنواری کے ہونٹوں کی طرح جادو کر رہی تھیں۔ ہم ہولے ہولے گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ ہوا کے ساتھ نشہ تیز ہو رہا تھا۔

موتا سنگھ نے بوتل اپنے قریب کھسکالی ایک چسکی بھری۔ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو مروڑا۔ اور خاموش ہو کر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

شام سنگھ کہنے لگا کیوں موتا سنگھ چپ کیوں ہو۔ رات بیت رہی ہے جوان اگر تو بول نہیں سکتا تو چل پھر میں تو جاؤں موتا سنگھ نے بڑے دُکھ سے سر اٹھا کر ہولے ہولے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ سن یار راتیں تو بیت ہی جاتی ہیں پھر نہ جانے کیوں دُکھ نہیں بھولتے۔ اور دکھ کے ساتھ مرنے والے کی آنکھیں۔ کیوں یاد آ جاتی ہیں۔ رت دیو کو تم سب نے ہی دیکھا تھا وہ پھر خاموش ہو گیا۔

اوئے یار بجھارتیں کیا ڈال رہا ہے۔ رت دیو کو تو ہم سب نے دیکھا تھا پھر آگے بھی تو کوئی بات کر۔ بھگت سنگھ چڑ کر بولا

پنڈت جی کو بھی تم سب جانتے ہو۔ پر سمجھ نہیں آتا۔ رام دئی کو دورگی نے کیا کھا کر پیدا کیا تھا۔ کبھی منشی کے ہاٹ پر۔ کبھی سادھو کے کوٹھو پر، کبھی چنت سنگھ کے خراس پر بے جھجک ہنسی ہنستی لڑکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی۔ گاؤں میں گلیوں میں گھوما کرتی تھی۔ اُن دنوں سادھو کا لڑکا چندھا روشن گنتا اکڑ اکڑ کر اصیل مرغ کی چال چلتا تھا۔ یہ سارا رام دئی کا جادو تھا۔ ماں اور نانی کی طرف سے پھٹکار کو رام دئی نے کبھی کچھ جانا ہی نہیں۔ بڑی ڈھیٹ تھی۔ دال لینے آئی ہے تو جھولی میں مکھانے ڈالے تیزی

سے نکلتی جاتی ہے۔" میری ماں کہا کرتی تھی جان مار ڈالی پرماتما جانے کس کس کو خراب کرے گی۔ پنڈت جی آپ مر گئے اس جنگلی بیل کو چھوڑ گئے۔ دوسری بیٹیاں بھی تو ہیں۔ نہ کبھی چرخے کو ہاتھ لگاتی ہے نہ کوئی اور کام کرتی ہے۔" جہاں دو چار مامیاں چاچیاں بیٹھتیں بس ذرگی کی خرابی اور اس کے دکھ کے ساتھ ساتھ رام دئی کا ذکر ضرور آتا۔ دوپہروں کو جب ہماری ڈیوڑھی میں ساری حویلی کی عورتیں اپنے اپنے چرخے لا کر آ بیٹھتیں تو ذرگی وہاں سے گذرتی کبھی سفید گائے کے لیئے چارہ لاتی اور کبھی گیہوں پسوانے جاتی۔ کبھی سر پہ اُپلوں کا ڈھیر رکھے ہوئے۔ کانوں سے بہری تھی کسی کی بات بھی نہ سنتی۔ اور پھر اگر کوئی آواز دیتی "ماسی ذرگی۔ بات تو سن"! اس نے کبھی ٹھہر کر رک کر کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایسی دوپہروں کو رام دئی لمبی تان کر سوتی۔ یا پھر گلی میں سے گذرتی تو لڑکوں کو دیکھ کر یوں مُڑ مُڑ کر چلنے لگتی۔ گویا کوئی پیچھے آ رہا ہو۔ آنکھ میچ کر اشارہ کرنا۔ سینے کو ابھار کر چلنا۔ یہ ساری باتیں نہ جانے اس نے کس سے سیکھی تھیں۔

بھگت سنگھ بولا "یہ باتیں تو سب کو معلوم ہیں یار۔ کیا مجھے نہیں پتہ کہ وہ کنوئیں پہ آنے جانے والوں سے بھی یارانہ گانٹھتی تھی۔ چوڑیاں بیچنے والے اسے گچھے کے گچھے مفت دے جاتے۔ دنداسہ اسرخی کی ٹکیاں سب کچھ بس یوں اگلے کے پلّے سے جھاڑ لیتی تھی کبھی دہن دیال سے الجھی ہوئی۔ اور کبھی کسی سے۔ انہیں دنوں تو نہ جانے کہاں سے اس نے بڑا چمک دار اور پھولوں والا ریشمی کرتا۔ دوپٹہ لیا تھا۔ اور پہن کر میری بہن کے پاس دکھانے آئی تھی۔ میری ماں نے اس کے جانے کے بعد بہن کو گالیاں دی تھیں اور کہا تھا۔

"اگر میں نے پھر تجھے اس رنڈی سے بات کرتے دیکھ لیا۔ اور تیری سہیلی بن کر یہ میرے گھر آئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی"!

ہاں تیری بہن کا آدمی سنا ہے مارا گیا تھا۔ موتا سنگھ نے کہا۔ مجھے ملایا میں کسی نے بتایا تھا۔

عورت کا چکر بڑا ظالم ہوتا ہے بھئی۔ اس کا پہلے سے جس عورت کے ساتھ تعلق تھا۔ اس کے خاوند نے میرے بہنوئی کو مار دیا۔ یہ عورت ذات اس سے پرماتما بچاتے رکھے۔ بیچاری میری بہن ایک بچے کو لیئے لیئے بیوہ ہو کر زندگی گذار رہی ہے۔

موتا سنگھ بولا۔ صبر اور شرم کی حدیں ہوتی ہیں۔ تمہاری بہن اسی طرح زندگی گذار دے گی۔ اور رام دئی نے ستّ دیو کے بعد بھی صبر نہ کیا۔ اصل میں اس کا بیاہ میری ماں اور ماسی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں اور لڑکیوں کو محفوظ رکھنے کیلیئے پنڈت جی کے لحاظ کی خاطر ایک پُن کا کام کرنا ہی اچھا سمجھا۔ ذرگی کا بہرہ پن اس کے بیاہ کے بعد اور بڑھ گیا۔ وہ اپنے ننگے پاؤں کی بوائیوں کو بھول کر گھاس چارہ لاتی۔ اور رام دئی کو مکھن ملائی سے روٹی کھاتے دیکھ کر اپنی روکھی سوکھی روٹی نگلتی ہی خوش رہتی۔ سفید گائے کی طرح اسے گھر اور گھر کے آدمیوں سے بڑا لگاؤ تھا۔

ایسا ہی بڑا لگاؤ ستّ دیو کو رام دئی سے تھا۔ اس کے لیئے رام دئی کے سفید چہرے کی آنکھیں ہی سب کچھ تھیں۔ بھگت سنگھ بولا۔ مگر یہ بتاؤ تم آخر کس طرح پھنسے تھے؟

رام دئی کی بڑی لڑکی پانچ سال کی تھی۔ جب میں پہلی بار پنڈتوں کی ڈیوڑھی میں گیا ہوں۔ ستّ دیو دوسرے گاؤں سے دلہان جھاڑنے کے بعد لوٹا تھا۔ اور گیانی بھاگ سنگھ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کو حویلی میں رُک گیا تھا۔ اور جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگا چل یار آ تجھے کھیر کھلاؤں۔ گھر میں نیچے میں تو چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ لڑکی پیڑھی پہ بیٹھی اپنی گڑیا کو کپڑے پہنا رہی تھی۔ ذرگی دینے کی دھم کو میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ اور رام دئی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے ذرگی کو رام رام ست کیا مگر اس نے نہ [illegible]

کر میری طرف دیکھا اور نہ ہی جواب دیا۔ ست دیو نے دلہان زور سے چولھے کے اوپر پھینک دیئے۔ کپڑے اور سر جھاڑتا ہوا چولہے کے پاس بیٹھی لڑکی سے کہنے لگا " نی منی" تیری ماں کہاں ہے۔ منی نے اپنی گڑیا کو پیار سے پیڑھی پہ رکھ دیا۔ اور ڈری ڈری باپ کی طرف آکر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی پھر بولی بھاور دکیو اور بی بی اندر ہیں۔ اس نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ بی بی کہتی تھی اگر میں اندر آئی تو وہ میرا گلا گھونٹ دے گی؟

ست دیو نے بڑی پریشان نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گھبرائی ہوئی اور شرم سے جھکی آنکھوں سے اور بیمار ہوئے ہوئے بیمار کی طرح چلتا کوٹھڑی کی طرف گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ست دیو نے کواڑ کو بجا کر کہا۔ دئی میں آیا ہوں باہر آؤ۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میں چولھے کے پاس حیران تھا۔ درگی چرخہ کات رہی تھی۔ اور چھوٹی لڑکی آنگن میں کھڑی کوٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ دوسری بار پھر اس نے کہا۔ دئی میں آیا ہوں باہر آؤ۔ دروازہ چوں چوں کر کے اپنی چولھی پہ گھوم گیا۔ اور بھڑے ہوئے پٹ کو پہلے ذرا سا کھول کر دئی نے جھانکا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ کرتا پیٹ کے اوپر اٹکا ہوا تھا۔ اور دوپٹہ کندھے پر سے مڑ کر دوسری طرف نیچے لٹک رہا تھا۔ اس نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ ست دیو بولا کیوں اندر کون ہے دروازہ کھول۔ اس کا سانس اس کے گلے میں اٹکا ہوا لگتا تھا۔ اور آواز سینے کے اندر سے کہیں جیسے پاتال سے آ رہی ہو بڑی بوجھل تھی۔ دئی نے میرا بھی لحاظ نہ کیا۔ ہنس کر بولی "کیوں تجھے اس سے کیا کہ اندر کون ہے۔ بڑا آیا رعب ڈالنے والا۔ اس نے آنکھ میچ کر میری طرف دیکھا مجھے وہ اس وقت ایک مسلا ہوا مگر تازہ پھول لگ رہی تھی۔ اس کے گرد تازہ خوشبو تھی۔ جیسے دودھ کی بالٹی میں سے آیا کرتی ہے۔ ایسی سفیدی جیسے دودھ دوہتے ہوئے جھاگ میں ہوتی ہے۔ اس میں زندگی اُبلی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مستی تھی۔ جو ہر شراب اور ہر دارو سے بڑھ کر تھی۔ نہ جانے کس میں کیا تھا۔ اس کا کرتا پیٹ پہ اٹکا ہوا۔ پریشان بال۔ لٹکتا دوپٹہ۔ اگر تم میں سے کوئی اس گھڑی اُسے دیکھتا تو اپنا سارا کچھ واری کر دیتا۔ وہ درگی کے چرخے کے قریب آ گئی اور بولی اس ڈائن نے بتایا ہو گا۔ نہیں بلا کر لائی ہو گی۔ یہ میری جان کی دشمن ہے۔ کُتی مرتی بھی نہیں۔ چڑیل نہ جانے میری جان کب تک کھائے گی؟" اور اس کے چرخے کو زور سے لات ماری۔ درگی نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھا کر اُسے مجھے اور ست دیو کو دیکھا اس کے اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں میں اٹکا ہوا تاگے کا تار ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا میں نے رام دئی کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ بس بس میں صرف یہی کہہ سکا۔ ست دیو چولھے کی طرف چلا گیا۔ اور وہ ایک لمحہ کاش وہ ایک لمحہ نہ آتا جب میں نے رام دئی کو پیچھے سے پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ اپنی ساری خوبصورتیوں، خوشبوؤں اور شوخیوں سمیت میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ وہاں دیئے کی مدھم لو کے سنگم پہ ایک گھڑی میں۔ درگی اور ست دیو کے ہوتے ہوئے میں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ مجھے کتنی شدت سے احساس ہوا تھا کہ بس رام دئی ہی وہ عورت ہے جس کے پیچھے میں دیوانہ ہوں۔ جس کو ڈھونڈتے ہوئے میں آج تک گاؤں کی کتنی لڑکیوں کے پیچھے پھرتا رہا ہوں۔

دوسرے لمحے ست دیو نے چولہے کی راکھ کی ایک مٹھی اس کے پریشان بالوں میں ڈال دی اور کہنے لگا: "تم نے جو کچھ کیا ہے بُرا کیا ہے میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تجھے سنبھال نہیں سکتا۔

رام دئی ہلی نہیں اس نے آگے بڑھ کر ست دیو کو اسی طرح لات نہیں ماری جس طرح اس نے درگی کے چرخے کو ماری تھی۔

بس بال جھاڑنے لگی۔ اور بولی میں اس کا بدلہ تجھ سے ضرور لوں گی۔ دُرگی نے تار چھوڑ دیا اور رام دئی کو گلے لگا کر زور زور سے بین کرنے لگی۔ پھر ہمسائے کی عورتیں کوٹھوں پر چڑھ کر دیکھنے لگیں۔ چودھرائن اپنا لہنگا سنبھالتی آئی اور تھوڑی دیر میں سارا آنگن عورتوں سے بھر گیا۔

چھوٹی لڑکی اپنی گڑیا کو لیئے صحن میں یوں کھڑی تھی جیسے پتھر ہو گئی ہو۔ اور گائے اس سارے شور سے گھبرا کر بار بار سر کو زور سے جھٹکتی اور پھر منہ مارنے لگتی۔ ست دیو بڑا خاموش دھان کے ڈھیر کے پاس بیٹھا تھا۔ جیسے اس سارے تماشے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ دیکھو۔ ۔ نہ جانے کب کا کوٹھڑی سے نکل کر جا چکا تھا۔

میں مہینوں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رات کو مکئی کے کھیتوں میں۔ کڑکتی سردیوں میں۔ برستی بارشوں میں نہ جانے کیسے کیسے جتنوں سے رام دئی سے ملتا رہا۔ ہر بار اُسے دیکھ کر میرا دل ایسے دھڑکتا جیسے باہر نکل جائے گا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ بیاہتا عورت ہے کھائی کھیلی۔ زمانے کی اُونچ نیچ سے واقف مردوں کے دل اپنے ہاتھ میں لینے والی۔ میں ان دنوں پاگل ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کنواریوں سے زیادہ سچی اور پتی ورتا عورتوں سے بھی اونچی لگتی۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ جنڈیالے سے ہر چلے رات کو لوٹ آتا۔ سارا چوہڑ کے باغوں کے پاس سے گذرنے کالے پُل پر سے بھی مجھے ڈر نہ لگتا۔

سیدھا سادا اور بڑا ہی دُکھی ست دیو ہم سب کو دوست سمجھتا تھا۔ اس کے جی میں دکھ گھُن کی طرح اس کے سارے وجود کو چاٹ رہا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اور گیانی ٹھاکر سنگھ سے چہلیں کرتا۔ اس کے چٹکلوں کا جواب دیتا۔

وہ اکثر دوسرے گاؤں میں کام ڈھونڈنے چلا جاتا۔ اور ایک ایک ماہ لوٹ کر نہ آتا۔ گھر میں اس کے نہ ہونے سے کوئی کمی نہ ہوتی۔ صرف اس کا کالا کتا اس کی غیر موجودگی میں بہت کم بھونکتا۔ اور ڈیوڑھی میں بیٹھا اونگھتا رہتا۔ رام دئی کو میں نے ساڑھیاں لا کر دیں۔ دل پیاس کے چمکیلے پھولوں والے سوٹ جو میری بیوی کے پاس بھی نہ تھے۔ خوشبودار تیل۔ میموں کے استعمال کی جتنی بھی چیزیں جنڈیالے کے دکاندار بڑے شہر سے لاتے میں اس کے لیئے لے جاتا۔ ہر نیا کپڑا پہن کر اس کے چہرے پر ایک نیند سی اتر آتی۔ دیسی شراب کے جھاگ کی طرح اصلی اور پھر بھی نقلی۔ دُرگی اُسے نیا کپڑا پہنے دیکھتی تو بس دیکھتی ہی رہ جاتی۔ وہ اسے کبھی کچھ نہ کہتی تھی۔ رام دئی کو دیکھ کر اُن دنوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ صرف اس لیئے پیدا کی گئی ہے کہ اچھے کپڑے پہنے اور زور زور سے ہنسے یا پھر چیزوں کو ٹھوکریں لگائے۔ مجھے تماشے میں کام کرنے والی عورتوں سے بھی زیادہ وہ اس وقت اچھی لگتی جب میرے پاس آنکھیں میچ کر بیٹھ جاتی اور کہتی بوجھو تو میں کیا سوچ رہی ہوں؟

بھگت سنگھ بولا۔ اس سے زیادہ بے شرم عورت دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ لگتا ہے تم اب تک اس کے جادو میں بندھے ہو۔

موتا سنگھ نے شراب کی بوتل اٹھا کر بہت سی اپنے حلق میں انڈیل لی۔ اور پھر منہ بند کر کے ہولے ہولے سے گلے سے نیچے اتارنے لگا۔ اور پھر بولا۔ بس رام دئی اس شراب کی طرح تھی۔ صرف میں اُسے پی نہ سکا۔ ہاں اُسے حلق سے نیچے اتار نہ سکا۔ وہ بہت تیز تھی۔ اور بہت نشہ آور۔

اور اسی نشے میں تو تم نے ست دیو کو مار دیا تھا۔ بھگت سنگھ نے تلخی سے کہا۔

ایسا ہی سمجھو لو۔ میں اور ایشر داس اسے بہانے بہانے بیاس پار لے گئے تھے؟

یہ بات تو تب تھی۔ جو تم رام دئی کو اپنے ساتھ ملایا لے جاتے۔ اُسے یہاں دوسروں کے لیئے چھوڑ گئے ؟

موتا سنگھ پھر نشے میں بہکے ہوئے آدمی کی طرح بولا" دوسرے اس کے لیئے بنے تھے وہ دوسروں کے لیئے نہ تھی۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا۔ اگر مجھے اپنی زندگی کا اتنا خیال نہ ہوتا۔ تو شاید میں آخر تک اس کے ساتھ رہتا۔ مگر میں سدا کا ڈرپوک ہوں۔ بھگوڑا۔ رام دئی مجھ سے بہت اونچی تھی۔ آخری دن وہ حویلی کی دیوار سے لگی ہولے ہولے ہنس رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی ست دیو کی موت کے چھ ماہ بعد تم مجھ سے آج پوچھ رہے ہو۔ کہ میں نے اُسے کیوں مروایا تھا۔

چاند کی مدھم روشنی میں اس کے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور وہی دیوانہ کر دینے والی خوشبو ——— زمین کی سوندھی خوشبو دودھ کی میٹھی باس اڑ رہی تھی۔

اور جب تم نے ست دیو کو مارا تھا تب بھی تمہیں یہ خوشبو یاد ہی ہو گی۔ جگت سنگھ ہولے سے بولا۔

ست دیو کو میں اور ایشر داس کام کرنے والی باقی ٹولی سے دُور دور لے آئے تھے۔ شام کے سائے بیاس کے پانی پر اندھیرا اور سرخی بنے ڈول رہے تھے۔ وہ جیسے آنے والی گھڑی کے قریب آنے سے گھبرا رہا تھا۔ کہنے لگا یار موتا سنگھ میرا تو دل ڈر رہا ہے۔ چلو واپس چلیں۔ میں تھک گیا ہوں میری ٹانگوں سے مانو جان نکل رہی ہے۔ مجھ سے اور کام نہیں ہو سکتا۔ ایشر داس اس کے قریب گیا۔ ہنسا اور اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر اُسے گرا لیا۔ کہنے لگا آدھی ٹانگوں سے جان تو نکل گئی ہے۔ باقی جان بھی نکال دیں۔ گرنے کے بعد تک ست دیو یہی سمجھتا رہا کہ ہم اس سے مخول کر رہے ہیں۔ مگر جب ایشر داس نے اُسے دبوچ لیا۔ اس کا گلا دبانے لگا تو رکتی سانسوں میں سے ست دیو نے کہا" جانے دو یار میرا کیا ہے جو کہو گے وہی کروں گا۔ عورت کے پیچھے میری جان کیوں لیتے ہو۔ کہو گے تو واپس گاؤں بھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے نہ مارو" میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میں ان جانے ہی ہولے ہولے ایشر داس کو پیچھے سے کھینچ رہا تھا۔ کہ ست دیو کو چھوڑ دے۔ مگر انسان کی محبت کے مقابلے میں عورت کی محبت جیت گئی۔ رام دئی کی جادو کرتی آنکھیں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ وہ آنکھیں کہ جب روتی تھی تو اُن پہ واری ہونے کو جی چاہتا تھا۔ میری ساری جان نہ جانے کہاں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ کہ میں ایک آگ تیرتی ہوئی اپنی رگوں میں محسوس کر رہا تھا۔ رام دئی سے ملنے کے لیئے میرا دل تڑپ رہا تھا۔ اور ایشر داس کے نیچے ست دیو بے قابو ہو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ ایشر داس نے کہا" اوئے موتا سنگھ تو بھی تو رام دئی میں میرا شریک ہے۔ سامنے کتے کو مارنے میں میرا ساتھ دے؟

میری کانپتی جان اور رگوں کی آگ ایک دم ٹھنڈی ہو گئی۔ جیسے مجھے متلی آ گئی ہو۔ میں نے کہا چل یار میں رام دئی میں حصہ نہیں لگاؤں گا۔ تو اس کا کام ختم کر۔ گلا تو تو نے پکڑا ہوا ہے۔ میں اس کا کیا کروں۔ جلدی کر جلدی! ایشر داس اور ست دیو برابر کے جوان تھے۔

ہمارے قریب ست دیو کا جسم پہلے تڑپتا رہا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم وہیں کھیتوں میں چھپے آنے والی ریل کا انتظار کرتے رہے جب گاڑی کی بتیاں دُور سے دکھائی دیں۔ تو میں نے اور ایشر داس نے ست دیو کو اٹھا کر پٹڑی پر رکھ دیا۔ انجن سے سیٹیاں سنائی دیں۔ نیچے دریا میں بتیوں کا عکس پڑتا رہا۔ اور لہروں میں سائے ڈولتے رہے۔ جیسے پُل پر سے جنوں کی فوج گذر رہی ہو۔ کیسے انوکھے وقت مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ مجھے ڈھاب یاد آ رہی تھی۔ اور کنارے کے کھیت یاد آ رہے تھے۔ میرے دل پر جیسے کسی نے منوں بھاری پتھر

رکھ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا یہ پتھر کوئی اٹھا دے۔ اور میں ہلکا ہو کر بھینس پر بیٹھ کر ننگ دھڑنگ ایک چھوٹا لڑکا بن جاؤں۔ بیریوں پر چڑھ کر بیر اتاروں۔ امرود چراؤں۔ مگر یہ ساری باتیں پیچھے رہ چکی تھیں۔ میرے جی میں دکھ تھا۔ اور بیتے دنوں کی یاد تھی۔ پر ہر یاد کے پیچھے جیسے اس کا سایہ ہو۔ رام دئی کی آنکھیں ابھر آئی تھیں۔ سانپ نے چڑیا کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ گاڑی رُک گئی۔ انجن کے نیچے آ کر ست دیو کی لاش کے دو حصے ہو گئے تھے۔ پر ریل ایسے جنگل میں کب تک ٹھہرتی۔ اپنے راستے پر چل گئی۔ ہم نے ست دیو کا سر اٹھا کر وہیں پُل کے نیچے گڑھا کھود کر دبا دیا۔ اور خود واپس آ گئے۔

"وہ مقدمہ کس نے چلایا تھا یار" بیری یار شام سنگھ نے بہت دیر کے بعد پوچھا۔

تھا ایک رام دئی کی برادری کا آدمی اُسے نہ جانے کیسے شک ہو گیا کہ ست دیو کو رام دئی نے مروا دیا ہے۔ موتا سنگھ نے ہولے ہولے سے کہا۔ چھ ماہ میں نے ایک شراب کے نشے میں بہکے ہوئے آدمی کی طرح گذارے ہیں۔ تم میں سے کسی نے رام دئی کو ایسے قریب سے نہیں دیکھا۔ وہ جادوگرنی تھی۔ مقدمہ ہونے کے بعد پتہ چلا ہے کہ سادھو کا لڑکا چندھا منشی ایشر داس۔ گیانی تیج سنگھ۔ چودھری بلندا سنت سنگھ۔ سارے ہی کسی نہ کسی وقت رام دئی کے جادو میں آ چکے ہیں۔ جب میرا نام بھی آیا تو میری ماں نے کہا تھا یہ ڈائن ہے۔ ڈائن میرا گھر بھی کھائے گی۔ مقدمے کے دنوں میں جب مجھے اپنی زندگی اور موت کا پتہ نہیں تھا۔ جب ہمارے دو مربعے بِک گئے تھے۔ اور باپو سارا وقت مجھ سے کبھی آنکھیں ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔ رام دئی سے ملنے کی سوچا کرتا تھا۔ پاگلوں کی طرح ہر وقت اس کے سپنے دیکھتا رہتا۔ جیل کی کوٹھڑی میں اور باہر بھی میرے دماغ میں سوائے اس کے کچھ نہیں تھا۔

مگر تم تو بہت جلدی جیل سے نکل آئے تھے۔ تمہاری ضمانت ہو گئی تھی بھئی۔ بھگت سنگھ نے اُسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

ہاں پھر ایشر داس کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ اور میں وعدہ معاف گواہ بن کر چھوٹ گیا۔ تب ایک رات رام دئی نے ہنس کر مجھے کہا تمہیں ست دیو کبھی یاد نہیں آتا۔ اور میں نے اپنے آپ کو بھی ست دیو کی طرح ایشر داس کے نیچے تڑپتے اور پھر ریل کے انجن کے نیچے دو ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ میں ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ میرے پاؤں میں سردی کے باوجود پسینہ آ گیا۔ ہنستے ہنستے میں چپ ہو گیا۔ اور پھر دوسرے دن کے چڑھتے سورج نے مجھے نگل سے دُور، جنڈیالے سے بھی دُور ریل میں بیٹھے اُن جانی زمینوں سے پرے بھاگتے پایا۔

بڑی دیر کے بعد بھگت سنگھ نے کہا۔ تمہارے جانے کے بعد رام دئی جیسے بجھ گئی تھی۔ چند روز وہ بالکل خاموش رہی۔ پھر اس نے مانڈی کے جوان چودھری کو نہ جانے کیسے پھانس لیا۔ بس ان دنوں دُرگی کو میں نے روتے اور تڑپتے سنا ہے۔ ماں بیٹیاں الجھتی رہتیں مینہ گاتے رام دئی نے بیچ دی تھی۔ اور ہولے ہولے گھر کا سامان بھی وہ ٹھکانے لگا رہی تھی۔ چودھری کو مانڈی سے آتے بڑی تکلیف ہوتی ہو گی۔

ارے یار جو آدمی روز رات کو مانڈی سے آ سکتا ہے اور پھر دن چڑھتے واپس بھی آ سکے پاگل ہونے میں کیا شک ہے۔ بھگت سنگھ نے کہا۔ گاؤں میں اُن دنوں کتنی پنچائتیں ہوتی رہی تھیں۔ ہر روز چوپال میں سارے بڑے بوڑھے اکٹھے ہوتے پھر رام دئی اور درگی سے کون بات کرتا۔ دونوں دوھوا اور بے سہارا تھیں۔ لوگوں کو اُن دونوں سے زیادہ مرے ہوتے پنڈت کی آتما کی شرم تھی۔ انہوں نے سنت کے کی بھابی سے انہیں کہلوایا تھا۔ جو بڑی زبان دراز اور تیز بے لحاظ عورت تھی۔ اب تو بوڑھی ہو گئی ہے نا۔ پر مرنے میں چند سال اور لے گی۔ دُرگی نے چُپ چاپ یہ بات سنی اور جواب دینے کی بجائے ڈیوڑھی سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ رام دئی نے کہا تھا بھابی میں تو

آپ ہی گاؤں چھوڑ رہی ہوں تو نے یہاں آنے کی ناحق تکلیف کی ہے!

چوہدری کے گڈے آئے اور بیچنے سے جو سامان باقی بچا وہ رام دئی اپنے ساتھ تانڈی لے گئی۔ گڈے پر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نہ آنسو تھے۔ اور نہ چہرے پر رنج لگتا تھا۔ جیسے وہ مسافروں کی طرح آئی تھی۔ چند دن منزل میں رہی اور اب اپنے راستے جا رہی ہے جب درگی کا چرخہ بھی گڈے پر رکھنے لگے تو وہ ٹوٹ کر رو دی۔ اس نے ڈیوڑھی کی مٹی اپنے سر پر ڈال لی۔ اور بین کر کر کے ماں گوماں اور پنڈت کو آوازیں دینے لگی۔ اس کے لیئے یہ گھر ساری دنیا تھا۔ اور یہ گاؤں مرنا جینا وہ نہ کبھی کسی کے ہاں مہمان گئی اور نہ ہی کسی دوسرے گاؤں میں۔ اس مٹی سے وہ پیدا ہوئی تھی اور اسے اس مٹی میں ملنا تھا۔ سارا گاؤں رام دئی کے گھر کے باہر اکٹھا تھا۔ پنڈتوں کی ڈیوڑھی کے آگے کتنی بھیڑ تھی۔ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بولا: میں نے درگی کا چرخہ اتار کر پھر ڈیوڑھی میں رکھ دیا۔ رام دئی اپنی لڑکی کو جو چھ سات سال کی ہو چلی تھی گود میں لے کر روئی کی ایک گٹھڑی پر بیٹھ گئی اور گڈے والے نے گڈا چلا دیا۔ نہ اس نے کسی کو گلے مل کر وداع کی اور نہ کسی نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ عورتیں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ اور بڑی اداس تھیں۔ سنتو کے کی بھابی کہہ رہی تھی "رام دئی جیسی لڑکی تو واہ گرو کسی کو نہ دے۔ سارا گاؤں اجاڑ کر چلی گئی ہے۔ کئی گزر دن دایاں درگی کی گم سم صورت دیکھ کر اپنے آنسو خشک کر رہی تھیں۔

جگت سنگھ بولا۔ اور پھر درگی دو دن ڈیوڑھی میں یوں بیٹھی رہی۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ نہ بولتی تھی اور نہ ہلتی تھی۔ بڑی بوڑھیاں کہتی پھرتی تھیں اگر یہ مر گئی تو نہ جانے گاؤں پر کیا مصیبت آئے۔ پھر جب اس کی آس ٹوٹ گئی اور رام دئی کی صورت دکھائی نہ دی تو بہری درگی آپ سے آپ کہیں چلی گئی۔ ست دیو کا کالا کتا ڈیوڑھی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہ کبھی کبھار آکاش کی طرف منہ کر کے روتا اور پھر چپ ہو جاتا۔

ایک اور بولا۔ مگر تین چار دن بعد درگی واپس آ گئی۔ اس نے خالی گھر میں دیا جلایا۔ اور چرخہ نکال کر رکھا۔ پھر وہ سردیوں کی لمبی رات میں پرانے بھولے گیت یاد کرتی گاتی اور چرخہ کاتا کرتی۔ اس نے اپنے پلو میں بندھے پتاشے کھول کر کھائے اور ننگی زمین پر لیٹ گئی دن چڑھے لوگوں نے اس کے چیخنے کی آوازیں سنیں وہ پانی مانگ رہی تھی۔ چولہے کی زمین پر ایڑیاں مار مار کر اس نے جگہ کھود ڈالی تھی ایک زخمی جانور کی سی بھیانک آوازیں اس کے گلے سے نکل رہی تھی۔ نہ جانے موت کو اس سے کیا بیر تھا۔ سارا گاؤں ڈر رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ پر کوئی بھی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مگر سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ عورتیں اپنے کوٹھوں پر کھڑی اسے مرتا دیکھتی رہیں۔ اسے چیختا سنتی رہیں۔ پر کون اس کو جا کر دیکھتا۔ سورج کے ڈھلنے تک وہ چیخ چیخ کر اور تڑپ تڑپ کر درگی کا منکا بھی ڈھل گیا۔ نہ اسے زندگی میں سکھ ملا تھا اور نہ موت میں کوئی ساتھی۔ صرف کالا کتا منہ اٹھا کر روتا اور پھر درگی کا منہ چاٹتا رہا۔ میں بھی اس کے کریا کرم میں تھا۔ بھگت سنگھ نے کہا۔ ہم سب نے مل کر اس کی ارتھی اٹھائی اور شمشان میں جا کر اسے روڑی کے ڈھیر کی طرح آگ لگا کر واپس آ گئے۔ کسی نے اس کی موت پر بین نہیں کیئے۔ جیسے کوئی اپنے گناہ کو چھپا کر خوش ہوتا ہے۔ گاؤں والے اس کی موت پر خوش تھے۔ اس کے لیئے کونسی خوشیاں تھیں۔ اور جینے میں کونسی آس تھی۔ اس کا دنیا سے ناطہ ہی کیا تھا۔ اسے کیا اپنے پوتوں کو کھلانا اور بہوؤں کے سر پر سے تیل پانی وارنا تھا۔ میں تو کہتا ہوں جو اتو اچھا ہوا وہ مر گئی۔ پر یہ نکڑ پہ خالی گھر بہت دکھ دیتا ہے۔ جب پچھواڑے کی حویلی والوں نے اس گھر کو ڈھا کر نہا بنانے کا خیال کیا۔ تو رات کو ان

کے گھر میں پتھر برسے تھے۔

میں نے تو سنا ہے جگت سنگھ نے کہا۔ کہ جو کوئی رات کو اس گلی میں سے گزرتا ہے۔ اُسے مائی درگی کی آتما ملتی ہے اور بال کھولے ہوئے بالکل ننگی چیخ کر اُس کی طرف بھاگتی ہے۔ دہشت سے ہی کئی جوان مر مرگئے ہیں۔ اب تو کوئی اُس طرف سے نہیں گزرتا۔ اُس کے بیٹے مرنے کے بعد بھی کوئی سکھ نہیں۔

موتا سنگھ نے شراب کی خالی بوتل کو زور سے حویلی کی دیوار کے ساتھ دے مارا۔ چھن کی آواز سے بوتل کے ٹکڑے پھیل گئے اور کرچوں پر شراب کی نمی پچھلی راتوں کے تاروں کی روشنی میں چمکتی رہی۔

ادبِ لطیف

جلد ۴۶ — فون نمبر ۲۰۰۹ — شمارہ ۱

بانی چودھری برکت علی مرحوم

سالنامۂ ادبِ لطیف لاہور

: مرتب :

میرزا ادیب

: منیجنگ ڈائریکٹر :

اِفتخار علی چودھری

زرِ سالانہ
پاکستان میں ۸ روپے

قیمت سالنامہ
دو روپے آٹھ (۸) آنے

غیر ممالک میں
بارہ روپے

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۴/۵۰۰۶/۲۳۵۰ مورخہ ۱۵ راکتوبر ۱۹۵۴ء، ۶۷۹۶۰۶۶ مورخہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۵۴ء بموجب سرکلر نمبر ۱۵۴۴ مورخہ ۲۲ راپریل ۱۹۵۵ء

دفتر: ادبِ لطیف ○ لاہور

افتخار علی چودھری ناشر نے اُردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ادبِ لطیف، سرکلر روڈ سے شائع کیا

جمیلہ ہاشمی

بن باس

پرندے تیز تیز پر مارتے اُڑتے جاتے ہیں اور دھوپ پیلی ہو کر اپجل کے بڑے تالاب کی سیڑھیوں پر اُتر آئی ہے۔ گوردوارے کے کلس کا رنگ ڈوبتی کرنوں میں سنہری مائل سفید لگ رہا ہے اور بڑے میدان سے دوسری طرف میلہ بکھرنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر میں دسہروں کو آگ لگا دی جائے گی۔ لوگ شور کریں گے، ڈر کر دُور بھاگیں گے اور شام کے نیلے دھندلکے میں چنگاریاں اُڑتی ہوئی پھلجھڑیاں لگیں گی۔ دیر تک آگ کے شعلے اٹھیں گے۔ ارد گرد کے لوگوں کے چہرے اس آگ کی روشنی میں بڑے بھیانک لگیں گے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک راون کا روپ دھارے سیتا کو جدائی سے ولاپ کرتے دیکھنے اور دوسری بار بن باس ہو گئے پا کر خوش ہونے یہاں آیا ہو۔

بن باس کتنی کٹھن بات ہے۔ پر کسی کے بس میں تو کچھ نہیں۔ کون اپنی خوشی سے دکھ قبول کرتا ہے ؟

بھائی کہا کرتے تھے "بی بی تم یہ سارا وقت خواب سے کیوں دیکھتی ہو۔ یہ پیار جو تمھیں اب ملتا ہے۔ یہ رونق جو تمہارے گرد نظر آ رہی ہے ہولے ہولے کم ہو جائے گی۔ وقت ہر شے میں کمی کر دیتا ہے۔ پر یہ بربادی اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں" آج بھائی کہاں ہیں۔ اگر جنم بھومی کی باس کو اٹھائے جاسوس کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلنے والی ہوا جا سکتی اور انھیں کہیں ڈھونڈ سکتی تو میں کہتی جا کر پوچھو تو سہی۔ یہ دکھ میں کمی کیوں نہیں ہوتی۔ برسوں بوجھ اٹھائے اور کٹھن راہوں سے گزرنے پر بھی انسان سپنے کیوں دیکھتا ہے سُکھ کی آس کیوں کرتا ہے۔ روشنی سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے" ؟

سیتا جی نے بن باس بھوگ کر بس یہی دعا کیوں کی تھی کہ وہ رام چندر سے مل سکیں۔ کیا مصیبت انسان کو اتنا سخت نہیں کر دیتی کہ وہ اچھے دنوں کی امید ہی چھوڑ دے۔ اندھیرے سے آخر پیار کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر کیوں ؟ ناکھ کے درخت میں اُس سال سے پھل آ رہے ہیں جس سال مُنی پیدا ہوئی تھی۔ رُت بدلتی ہے تو شاخیں پھولوں سے بھر جاتی ہیں اور پیڑ پھلوں کے بوجھ سے جھک جاتا ہے۔ پیڑ اور دھرتی کو سمبندھ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی جڑیں زمین میں اور گہری گڑتی چلی جاتی ہیں۔ اس رشتے کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔

مُنی اب بڑی ہو گئی ہے۔ سال کتنے دبے پاؤں میرے قریب سے نکلتے چلے گئے ہیں۔

آج بڑی ماں نے گوپال سے کہا تھا۔ "کاکا بہو اور بچوں کو ذرا دسہرے میں گھما لا۔ کتنے برس سے وہ اس گاؤں سے باہر ہی نہیں گئی۔"

گوپال نے بہت تیزی سے کہا تھا۔ "ماں تو نے یہ بھی کہا کب تھا۔ یہ برسوں سے کہیں نہیں گئی تو میرا کیا دوش ہے بھلا اس میں" بھلا اس میں کس کا دوش ہو سکتا ہے۔ جب کوئی مجھے بہو کہتا ہے تو لگتا ہے گالی دے رہا ہو۔ برسوں سے سن رہی ہوں۔ اس رات سے سُنتی آئی ہوں۔ جب گوپال نے مجھے اس آنگن میں دھکیلا تھا اور چوکی میں بیٹھی ہوئی بڑی ماں سے کہا تھا۔

"ماں دیکھ تیرے لئے بہو لایا ہوں بانکی اور سندر۔ آج جتنی لڑکیاں ہمارے ہاتھ لگیں اُن میں سے اچھی ہے۔" اور ویٹے کی لو کو اونچا کر کے ماں میری طرف آئی تھی۔ بھوک اور خوف سے میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میلوں ننگے پاؤں چل کر مجھ میں اُنگلی اُٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ میں ان کے قدموں

میں ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنگن میں بندھی گائے اور بھینس ٹکر ٹکر مجھے تکتی رہی تھیں اور چارہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ماں نے سر سے پاؤں تک کئی بار مجھے دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

"تو اگر اچھے کام کرتا تو آج یہ حال نہ ہوتا میرا۔ دیکھ چولھا جھونکتے جھونکتے میری آنکھیں اندھی ہو چلی ہیں۔ اور ساری کہاریوں نے فصل پر اناج نہ ملنے کی وجہ سے ہمارے گھر آنا بند کر دیا ہے۔ بتا مجھ سے یہ گھر کا بوجھ کیسے سنبھلے گا۔ کھیتی باڑی کرے تو کیا ہی سکھ ہو مجھے"۔

گوپال نے کہا "دیکھ تو سہی۔ اب مہریوں کہاریوں کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ جو تیری داسی ہے۔ بس اس سے چکی پسوا، پانی بھروا جو مرضی کروا میرا اس کا کیا علاقہ۔ میں نے تجھے بہو لا دی ہے"۔

سارے سنگراؤں میں بہوئیں آئیں۔ نہ کوئی باجہ بجا نہ کسی نے ڈھولک پر لہک لہک کر گیت گائے نہ ناچنے والیوں نے سوانگ بھرے اور نہ کولہے مٹکا کر نقلیں کیں۔

میرے دُھول سے اٹے ہوئے بالوں میں نہ کسی نے تیل ڈالا۔ نہ کسی نائن نے سنگار کیا۔ کورے ہاتھوں اور اُجڑی مانگ سے میں سہاگن بن گئی کسی نے دروازے پر میرے سر سے تیل ماش نہ وارے اور بڑھی ماں نے گوپال کی بات سن کر یوں میری طرف دیکھا گویا میں مصیبت ہوں جسے اُس کا پوتا کہیں سے اٹھا لایا ہے۔ پھر دیا اس طرح ہاتھ میں لئے وہ چوکے میں چلی گئی اور مجھ سے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ بہو کا کیسا سواگت ہو رہا تھا۔

تب سے آج تک میں یہی سوچتی ہوں۔ میں بن باس بھوگ رہی ہوں اور میں سنگراؤں میں قید ہوں جو ہلے اکھاڑتے، بیڑیاں پینے جھولوں والے ایک دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے ہیں اور گدھوں پر سامان اتنے زور سے ٹھنستے ہیں۔ جیسے گدھے لکڑی کے ہوں۔ رام لیلا کی رتھیں ایک طرف کھڑی ہیں اور روپ دھارنے والے لڑکے چمکیلے کپڑوں کی پرواکئے بنا ملائی کی قلفیاں اور چٹنی والے پکوڑے کھا رہے ہیں۔ دودھ اور چٹنی کے دھبے ان رنگ برنگ پوشاکوں پر کوڑھ کے داغ لگتے ہیں منی کھڑی انھیں تکتی جا رہی ہے۔ اُسے اس بات کا ہوش نہیں کہ وہ گم ہو جائے گی۔ ہوش ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جسے گم ہونا ہو وہ بھرے گھر سے کھو جاتا ہے۔

گوپال اسے کھینچ رہا ہے اور دونوں لڑکے تنگ کر رہے ہیں بیچنے والے کو دیکھ کر چیز کے لئے ضد کرنے لگتے ہیں یہ میلہ ہے؟

مائیں بچوں سے بے پروا بھیڑ میں دھکے کھا کر ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں اور چھوٹے بچے ایک ایک چہرے کو تکتے زور زور سے روتے آگے ہی آگے بھاگے جاتے ہیں۔ بھلا میلے میں بچھڑنے والے کہیں پھر ملتے ہیں؟ یہ بجوگ جنم جنم کے لئے چاہنے والوں کے درمیان اوٹ بن جاتا ہے وہ موتی جن پر ہم سارا کچھ لٹا دیں۔ اس آس پر کہ ہم انھیں ایک بار پھر دیکھ سکیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ راستے لہروں پر تانا بانا بننے والے کیڑوں کے قدموں کے نشانوں کی طرح ہمارے پیچھے مٹ جاتے ہیں۔ ہم جن راہوں سے چل کر آتے ہیں اُن سے لوٹ نہیں سکتے کچھ بھی تو واپس نہیں آتا۔ اور میلے کی بھیڑ آگے ہی آگے چلتی رہتی ہے۔

وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ بھیا کہا کرتے تھے "بی بی جو لمحہ بیت جاتا ہے وہ مٹ جاتا ہے، دُھول بن جاتا ہے" جب میں پڑھنے میں بے دھیانی سے کام لیتی اور گڑیا گھر کو سجانے میں سکول سے آکر سہیلیوں کے ساتھ لگی رہتی تو بھیا مجھے سمجھایا کرتے تھے۔

یہ گڑیا گھر مجھے بابا نے لا کر دیا تھا۔ بابا یہ کھلونا میرے لئے کسی نمائش میں سے خرید کر لائے تھے۔ منی دونوں ہاتھوں سے اپنی بڑی سی کپڑے کی گڑیا سنبھالے ہوئے ہے۔ گوپال اوپر بھیڑ کو دیکھ رہا ہے اور منی جھک جھک کر گٹھڑی گٹھڑی اپنی گڑیا کو دیکھتی ہے۔ دونوں لڑکے راون کے بت لئے ہوئے ہر چہرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ منی کی آنکھوں میں اپنی گڑیا کے لئے کتنا پیار ہے۔ کپڑے کے چوڑے سے منہ پر بے ڈھنگے تانگوں سے ناک اور آنکھیں بنی ہیں۔ ناک میں نتھلی ہے۔ گوٹے لگی چنری سر پر رکھے اپنے لہنگے کو سنبھالے یہ کٹھنی لگتا ہے۔ ابھی ناچے گی۔ اچل کے تالاب

کے کنارے کنارے ہو کر کھیتوں میں سے ہمارا راستہ سنگراؤں کو جاتا ہے۔ زندگی کا کاروان چلتا ہی رہتا ہے۔ سیدھے ٹیڑھے راستوں اور اجنبی پگڈنڈیوں سے کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا نہ بھی ہو تو بھی سدا چلتے رہنا پڑتا ہے۔ سدا سدا چاہے پاؤں زخمی ہوں اور دل میں کچھ نہ ہو۔

شام کا نیلا دھندلکا اور نیچے اتر آیا ہے۔ شامیں نہ جانے کیوں مجھے بے حد اداس کر دیتی ہیں۔ آکاش پر اکیلا تارا دھڑکتا کانپتا۔ دئے کی لو کی طرح تھرتھراتا ہے۔ اور نیلاہٹ کے خالی سمندر میں اس کی تنہائی مجھے اپنے بن باس کی یاد دلاتی ہے۔ انسانوں کے اس ویرانے میں میں اس تنہا پیڑ کی طرح ہوں جس پر نہ پھول آتے ہیں اور نہ پھل۔

یہ تارا مجھے اس جہاز کی یاد دلاتا ہے جس میں بھائی سمندر پار گئے تھے۔ وہ اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ جب دور دیس کو جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ تو ماں کی آواز میں آنسوؤں کی رُندھن تھی۔ مگر وہ بڑی تسلی سے چیزیں ٹھیک کرتی اور دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ باہر بابا کئی طرح کے انتظامات میں لگے تھے اور بھیا اداس تھے۔ آپا چپ چاپ گم سم آنگن میں بے پاؤں چلتی ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ میں سارے گھر میں چہکتی پھرتی تھی۔ چوٹ جب تک نہ لگے زخم کی تکلیف کا کیا پتہ چلتا ہے۔

بندرگاہ تک ہم سب انھیں پہنچانے گئے تھے۔ بھیا بھائی کا سامان رکھواتے کاغذ ٹھیک کرنے گینگ وے پر اوپر سے اُدھر آجا رہے تھے اور میں جنگلے پر جھکی مٹیالے سبزی مائل پانی کو دیکھتی بھائی سے پوچھ رہی تھی۔ "یہ پانی ایسا کیوں ہے اس پر تیل کے دھبے کیوں ہیں۔ کشتیاں کیبل ہی چپو کیوں ہیں۔ لنگر کیوں ہیں، اونچی نیچی لہروں پر کشتیاں ڈولتی ہیں تو ہول نہیں آتا کیا" سوالوں سے پریشان ہو کر بھائی کہہ رہے تھے "جب تو بڑی ہو جائے گی تو ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہو جائیں گی بی بی"

اور آج مجھے معلوم ہے۔ جس کشتی کے چپو نہ ہوں وہ ڈوب جاتی ہے۔ کشتیاں ساحل پر بھی ڈوب جاتی ہیں۔ پانی کی ایک لہر بھی انہیں ڈبونے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بڑے ہونے پر جب باتوں کا پتہ چلا ہے تو بھائی نہیں ہیں۔

پھر جہاز کی سیٹیاں سنائی دیں اور بابا نے بھائی کو گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر "اچھا بھئی سپردِ خدا کہا تھا" بھیا بھائی سے لپٹ گئے تھے۔ آپا بڑے کمزور دل کی بات بات پر رو دینے والی تھی۔ اُسے ہچکیوں سے روتے دیکھ کر بھائی نے کہا تھا "بی بی کو دیکھو کیسی خوش ہے۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ دو سال ہیں تو میں لوٹ آؤں گا۔ کوئی میں سدا کے لئے بچھڑ رہا ہوں۔ پھر مجھے سینے سے لگا کر بولے" بی بی میں تیرے لئے پیرس سے تحفے لاؤں گا۔ بس تو مجھے خط لکھتی رہا کرنا۔ اور میں نے زور سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر جب آخری سیٹی سنائی دی تو وہ بڑے مطمئن سے' بہت لاپرواہی سے قدم اٹھاتے جیسے کہیں قریب ہی جا رہے ہوں، چلے گئے۔ جب تک جہاز نظر آتا رہا ہم رومال ہلاتے رہے۔ پھر شام کے دھندلکوں میں بندرگاہ کی ساری روشنیوں کا عکس پانی کی لہروں میں ڈولنے لگا اور جہاز کی بتی اکیلے تارے کی طرح کانپتی رہی اور پھر اوجھل ہو گئی اور اس کے بعد ساری روشنیاں میرے گرد سدا کے لئے ڈوب گئیں۔ لہروں میں سے کبھی کوئی کرن نہیں نکلی۔

میں اماں سے لپٹ کر کتنی زور سے چیخ پڑی تھی۔ میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔ اب یہ صورت پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ اب تو بھائی کو کبھی دیکھ نہ سکے گی۔ میرا دل زور زور سے کانپ رہا تھا جیسے مغرب میں خالی آکاش پر اکیلا تارا نیلے دھندلکے سے اوپر تھر تھراتا اور ڈرتا ہے۔

دور باغوں میں رات کی سیاہی اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ گوپال نے دونوں لڑکوں کو کندھوں پر بٹھا لیا ہے۔ اور وہ کھیتوں کے درمیان سفید لکیروں کی سی پگڈنڈیوں پر ہم سے آگے آگے جا رہا ہے میں اور منی دھیرے دھیرے چل رہی ہیں۔ پانی کے نالوں کو پھلانگ کر وہ دس کھیت پرے ہمارا انتظار کرے گا۔ اور دونوں لڑکوں کو راون کی کہانی سنائے گا۔ اُسے کیا معلوم سیتا اس کے پیچھے آرہی ہے۔ اور وہ خود راون ہے۔

کے کنارے کنارے ہوکر کھیتوں میں سے ہمارا راستہ سنگراؤں کو جاتا ہے۔ زندگی کا کاروان چلتا ہی رہتا ہے۔ سیدھے ٹیڑھے راستوں اور الجھی پگڈنڈیوں سے کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا نہ بھی ہو تو بھی سارا چلتے رہنا پڑتا ہے۔ سداسدا چاہے پاؤں زخمی ہوں اور دل میں کچھ نہ ہو۔

شام کا نیلا دھندلکا اور نیچے اتر آیا ہے۔ شامیں نہ جانے کیوں مجھے بے حد اداس کردیتی ہیں۔ آکاش پر اکیلا تارا دھڑکتا کانپتا۔ دئے کی لَو کی طرح تھرتھراتا ہے۔ اور نیلاہٹ کے خالی سمندر میں اس کی تنہائی مجھے اپنے بن باس کی یاد دلاتی ہے۔ انسانوں کے اس ویرانے میں میں اس تنہا پیڑ کی طرح ہوں جس پر نہ پھول آتے ہیں اور نہ پھل۔

یہ تارا مجھے اس جہاز کی یاد دلاتا ہے جس میں بھائی سمندر پار گئے تھے۔ وہ اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ جب دُور دیس کو جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ تو ماں کی آوازیں آنسوؤں کی رُندھی تھی۔ مگر وہ بڑی تسلی سے چیزیں ٹھیک کرتی اور دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ باہر بابا کئی طرح کے انتظامات میں لگے تھے اور بھیا اداس تھے۔ آپا چپ چاپ گم سم آنگن میں بے پاؤں چلتی ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ میں سارے گھر میں چہکتی پھرتی تھی۔ چوٹ جب تک نہ لگے زخم کی تکلیف کا کیا پتہ چلتا ہے۔

بندرگاہ تک ہم سب انھیں پہنچانے گئے تھے۔ بھیا بھائی کا سامان رکھواتے کاغذ ٹھیک کرنے گینگ وے پر اوپر سے اُدھر آجا رہے تھے اور میں جنگلے پر جھکی ملیالے سبزی مائل پانی کو دیکھتی بھائی سے پوچھ رہی تھی۔ یہ پانی ایسا کیوں ہے اس پر تیل کے دھبے کیوں ہیں۔ کشتیاں کیوں ہیں چپو کیوں ہیں۔ لنگر کیوں ہیں، اونچی نیچی لہروں پر کشتیاں ڈولتی ہیں تو ہول نہیں آتا کیا؟" سوالوں سے پریشان ہو کر بھائی کہہ رہے تھے "جب تو بڑی ہو جائے گی تو ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہو جائیں گی بی بی"

اور آج مجھے معلوم ہے۔ جس کشتی کے چپو نہ ہوں وہ ڈوب جاتی ہے۔ کشتیاں ساحل پر بھی ڈوب جاتی ہیں۔ پانی کی ایک لہر بھی انہیں ڈبونے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بڑے ہونے پر جب باتوں کا پتہ چلا ہے تو بھائی نہیں ہیں۔

پھر جہاز کی سیٹیاں سنائی دیں اور بابا نے بھائی کو گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر "اچھا بھئی سپردِ خدا" کہا تھا" بھیا بھائی سے لپٹ گئے تھے۔ آپا بڑے کمزور دل کی بات بات پر رو دینے والی تھی۔ اُسے ہچکیوں سے روتے دیکھ کر بھائی نے کہا تھا "بی بی کو دیکھو کیسی خوش ہے۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ دو سال میں تو میں لوٹ آؤں گا۔ کوئی میں سدا کے لئے بچھڑ رہا ہوں۔ پھر مجھے سینے سے لگا کر بولے "بی بی میں تیرے لئے پیرس سے تحفے لاؤں گا۔ بس تو مجھے خط لکھتی رہا کرنا۔ اور میں نے زور سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر جب آخری سیٹی سنائی دی تو وہ بڑے مطمئن سے بہت لاپروائی سے قدم اٹھاتے جیسے کہیں قریب ہی جا رہے ہوں چلے گئے۔ جب تک جہاز نظر آتا رہا ہم رومال ہلاتے رہے۔ پھر شام کے دھندلکوں میں بندرگاہ کی ساری روشنیوں کا عکس پانی کی لہروں میں ڈولنے لگا اور جہاز کی بتی اکیلے تارے کی طرح کانپتی رہی اور پھر اوجھل ہو گئی اور اس کے بعد ساری روشنیاں میرے گرد سدا کے لئے ڈوب گئیں۔ لہروں میں سے کبھی کوئی کرن نہیں نکلی۔

میں اماں سے لپٹ کر کتنی زور سے چیخ پڑی تھی۔ میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔ اب یہ صورت پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ اب تو بھائی کو کبھی دیکھ نہ سکے گی۔ میرا دل زور زور سے کانپ رہا تھا جیسے مغرب میں خالی آکاش پر اکیلا تارا نیلے دھندلکے سے اوپر تھرتھراتا اور ڈولتا ہے۔

دُور باغوں میں رات کی سیاہی اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ گوپال نے دونوں لڑکوں کو کندھوں پر بٹھا لیا ہے۔ اور وہ کھیتوں کے درمیان سفید لکیروں کی سی پگڈنڈیوں پر ہم سے آگے آگے جا رہا ہے میں اور منی دھیرے دھیرے چل رہی ہیں۔ پانی کے نالوں کو پھلانگ کر وہ دس کھیت پرے ہمارا انتظار کرے گا۔ اور دونوں لڑکوں کو راون کی کہانی سنائے گا۔ اُسے کیا معلوم سیتا اس کے پیچھے آرہی ہے۔ اور وہ خود راون ہے۔

مُنّی مجھ سے کہتی ہے "ماں سروپ کے ماما نے اُسے دُسہرے پر بڑے اچھے رنگ والے کپڑے بھیجے ہیں۔ ریشمی ہیں۔ ہاتھ لگانے سے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ماں میرے کوئی ماما نہیں ہیں۔ جو مجھے بھی اچھی اچھی چیزیں دے سکیں ماں تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ میلہ اچھا نہیں لگا تمہیں تم تھک گئی ہو ماں؟"

"ہاں مُنّی میں تھک گئی ہوں۔ میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ مجھے بہت چلنا پڑا ہے۔"

"کوئی بھی نہیں بوڑھی ہوگئی" مُنّی بڑے یقین سے میری طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ "تم تو دیوی کی مورتی لگتی ہو ماں بڑی ماں بھی یہی کہتی ہے۔"

منّی کو کیا معلوم مجھے کتنا چلنا پڑا ہے۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی کا فاصلہ کتنا بہت ہوتا ہے۔ اور جب انسان اینٹھ جاتا ہے۔ اُس کے من میں کوئی آشا نہیں رہتی تب وہ پُوچھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سنگراؤں کی راہوں پر بچھڑے ہوؤں کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میرا من خالی ہے میں لٹتی ہوں پر پھر بھی دکھ کا ناتا کتنا اٹوٹ ہے۔ گہرا اور پکا کبھی ساتھ نہ چھوڑنے والا۔

مُنّی پھر پوچھ رہی ہے۔ "ماں کیا ہمارے کوئی ماما نہیں ہیں؟"

میں اُسے کیا کہوں۔ میں اُسے کیا جواب دوں۔ دوراہے پر کھڑی سوچ رہی ہوں۔

بھیّا مجھے کتنے پیارے تھے پر میں ان سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ وہ گھر میں گھُستے تو چنچل پن خود بخود سر پر آجاتی۔ چال میں ٹھہراؤ اور ہنسنے کی آواز میں روک کی کوشش ہوتی جب میں اُن کے قریب کھڑی ہوتی تو لگتا دنیا میں اُن سے لمبے قد کا کوئی نہیں ہو سکتا۔ سنبھل کر چلتے اور سلیقے سے بات کرنے والے میرے بھیّا کتنا اچھا لکھتے تھے۔ صاف سیدھی لکیریں۔ نہ صفحے گندے کرتے اور نہ ہاتھوں میں سیاہی بھرتے مجھے کہتے "بی بی! جب تو بڑی ہو جائے گی تو تُو بھی ایسا ہی لکھا کرے گی" سیدھی سطریں اور بہا دینے کے بھیّا آج مجھے دیکھیں تو کیا کہیں میرے نصیب کے لکھتے پر اتنی سیاہی ہے کہ سارے صفحے پر ایک بھی تو سیدھی لائن دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے تو کبھی لکھنا نہ آیا۔

ان دنوں گُڑیا گھر سجا کر میں سوچا کرتی تھی۔ ہم اس میں رہ سکتے ہیں۔ امّاں اور بابا اور میں بھیّا اور بھائی اور آپا سبھی بس یہاں رہیں گے۔ زندگی رس بھرا گیت ہے۔ کسی شے کی ضرورت نہیں کوئی کمی نہیں۔

بھیّا کی شادی ہوئی تو میں نے کہا تھا ہمارا گھر جنت ہے مکمل اور آسمانی جنت۔ ان دنوں اگر میں دُعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھاتی تو سمجھ ہی نہ سکتی کہ کیا چاہوں۔ آج کی طرح اُن دنوں بھی میں نے خدا سے کچھ نہیں مانگا۔ سکھ اور دُکھ کی انتہا زندگی کے چکر میں ایک ہی مقام پر ہے۔

بھائی سمندر پار چلے گئے اور میرے جنت کے خواب چُور چُور ہو گئے۔ ساری زندگی کرچیں نکیلے کناروں والے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح ادھر اُدھر پھیل کر گزرنے والوں کو زخمی کر رہی ہیں۔ سب کے پاؤں معذور ہو گئے ہیں۔ راہ کے دوسری طرف جانے والا کوئی بھی تو نہیں رہا۔ راستہ یوں سُونا ہے جیسے شمشان میں سے ہو کر گزرتا ہو۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ سیتا جی کے ولاپ کو اس دیس میں کون سنتا ہے۔ اکیلے پن کا دکھ کتنا کٹھور ہے۔ زندگی کتنی مشکل ہے گوپال دور کھڑا مجھے پکار رہا ہے۔ مُنّی کو پکار رہا ہے۔ ہم دونوں بہت ہولے چل رہی ہیں۔ کپاس کے کھیتوں میں صرف سُوکھی لکڑیاں کھڑی ہیں۔ ہنستے پھول لوگ سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ گندم کے کھیتوں میں ابھی نہ بالیں پھوٹی ہیں۔ اور نہ ان میں دانے پڑے ہیں۔ ہوا کے جھونکے نرم لچکیلے پودوں کو جھکا لیتے ہیں۔ ہوا کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ہر ایک جھکتا ہے۔

بڑی ماں بہت بے چین ہو گی۔ میری طرف سے ایک انجانا خوف نہ جانے کیوں ہر وقت اُس کے کلیجے کو دھڑکاتا رہتا ہے۔ جس دیس کا وہ سوچتی ہے۔ اُس کا راستہ کٹھن ہے اور میں گوپال کے ساتھ جتنا راستہ چل کر آئی ہوں۔ اُس سے آگے چلنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ آخر کوئی کہاں تک چلتا جائے اور پھر جب کہیں جانا ہی نہ ہو۔ زخمی پاؤں اور زخمی دل لئے کر اجڑی مانگ کے ساتھ میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔ مُنّی میرے راہ میں کھڑی ہے۔ مُنّی میرے اور ان کے درمیان

اوٹ ہے۔ کتنے فاصلے ان کے اور میرے درمیان ہیں بھلا میں اس سے پرے کیسے جھانک سکتی ہوں؟

گانے والوں کی ٹولیاں بھجن گاتی پیچھے آرہی ہیں۔ اچل کے تالاب کے پاس جما ہوا میلہ اب بٹ کر پھیل کر راہوں میں بکھر آیا ہے۔ بچے روتے جاتے ہیں۔ مرد زور زور سے باتیں کرتے ہوئے میرے اور مُنی کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ عورتیں اچھے اچھے کپڑے پہنے دوپٹوں کو سنبھالتی ذرا ذرا سے گھونگھٹ ماتھوں تک سرکائے میلے میں خریدی مٹھائیوں کی پوٹلیاں ہاتھوں میں پکڑے بچوں کو کندھے سے چمٹائے ننگے پاؤں تیز تیز چل رہی ہیں ان کے جوتے دوپٹوں کے پلوؤں میں بندھے ان کے پیچھے جھول رہے ہیں۔ زمین اور جسم کا گہرا رشتہ ہے۔ اُس کے اور انسان کے درمیان کوئی پردہ کیوں ہو۔

دور ہٹتے لوگ سفید دھبے لگ رہے ہیں۔ اکتارہ بجاتا ایک سادھو سنگراؤں جانے والی راہ پر ہمارے پیچھے مڑ گیا ہے۔ اس کی آواز میں کتنا درد ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے جب روشنی کا کوئی وجود نہ ہو اس کے بعد بھی روشنی کی تمنا باقی رہتی ہے۔ اُس کے تاروں کی جھنکار مجھے سنائی نہیں دیتی صرف گیت کے بول ہوا کے ساتھ کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتے ہیں۔

"ماں! تم چپ کیوں ہو کوئی بات کرو مجھے ڈر لگتا ہے!" مُنی بڑھتے اندھیرے میں میرے ہاتھ کو اور زور سے پکڑنے کی کوشش میں اپنی گڑیا کو سنبھال نہیں سکتی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی ہے۔ اُسے کسی اور سوال پوچھنے کا ہوش نہیں۔

مُنی کو بھی بڑے ہونے پر آپ سے آپ پتہ چل جائے گا کہ اندھیرے سے ڈرنا بیکار ہے۔ جب اس کا جادو چل جاتا ہے۔ پھر کچھ کئے نہیں بنتا۔ بھائی کہا کرتے تھے "بی بی پانی میں زور ہے اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔" مجھے ان دنوں میں یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ پانی میں زور کہاں سے آتا ہے۔ حالات کا دھارا راہیں خود پیدا کر لیتا ہے۔ بڑی ماں جب مجھے پکارتی ہیں تو میں پھلکاری کو ماتھے تک سرکائے ہولے سے جی کہتی ہوں۔ ہر کام کو اتنی جلد نپٹانے کی کوشش کرتی ہوں کہ مصروف رہوں اور اپنے ساتھ اکیلے ہونے سوچنے بچارنے کا وقت نہ مل سکے۔

جب سمے تھا تو سوچ نہ تھی۔ اب سوچ ہے تو سمے نہیں۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ یہ کمی کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی کبھی کچھ نہیں ہوتا اور کبھی کچھ۔ آج آنکھیں بند کرتی ہوں تو دل کہتا ہے "وہ سب ابھی آئیں گے۔ اور بھیا مجھے دیکھتے ہی کہیں گے۔ "بی بی یہ کیا بہروپ ہے۔ پھلکاری تمہارے سر پر ذرا اچھی نہیں لگتی۔ اتار اس کو پرے کر یہ دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں۔ چھوڑ دے سارے کام اِدھر آ ہمارے پاس بیٹھ چھٹیاں کتنی کم ہوتی ہیں اور پھر گذر کتنی تیزی سے جاتی ہیں جب ہم گھر آیا کریں تو بس تو کہیں بھی نہ جایا کر۔"

بڑے کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تصویروں کی طرف دیکھتے باتیں کرتے چائے پیتے آتشدان کے سامنے آگ تاپتے۔ جب ہم سب زور زور سے قہقہے لگاتے تو اماں سوئی سوئی آواز میں کہتیں "صبح بھی اٹھنا ہے اب سو جاؤ بچو۔" تو بھیا زور سے پکار کر جواب دیتے۔ "اماں گھر سے دور ہی تو رہتے ہیں۔ سارا سال اُداس ہو کر سویا کرتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ سو ہی جائیں گے اماں" اور میں سوچا کرتی تھی۔ خوابوں کی طرح یہ ساری باتیں دھول میں رل جائیں گی۔ محبت کے سہارے جو جنت آباد کی ہے اس پر اس طرح گرد و غبار چھا جائے گا کہ کہیں بھی شادابی نظر نہیں آئیگی۔ ہم تصویروں کی طرح حقیقت کی پرچھائیں ہیں میرا دل تو سدا سے باؤلا تھا۔ الٹی باتیں سوچنے والا اور بڑا ہی مورکھ۔

دل سدا سے انہونی باتوں کے سپنے دیکھتا اور یونہی دھڑکتا ہے جب اس سے بات کرتی ہوں تو کہتا ہے "آخر تیرا کیا جاتا ہے بی بی! سپنوں پہ تو کسی کا اختیار نہیں اور پھر اس سپنے میں کیا برائی ہے۔ کہ کھلے کواڑوں کے اندر کسی دن وہ سب آ جائیں جن کا تمہیں انتظار ہے۔"

"میں کہتی ہوں میرے لئے سوائے اندھیکار کے کچھ باقی نہیں رہا۔"

دل کہتا ہے نا اُمید ہونا بہت بڑا پاپ ہے"۔ پر اُمید آخر کس شے کی کروں ؟

مُنّی میرا آنچل پکڑے پوچھ رہی ہے" ماں تنا ہمارے ماما ہمارے گھر کیوں نہیں آتے۔ کیا دیوالی پر ہم ماما کے پاس نہیں جائیں گے ماں۔ ساری لڑکیاں ہی تو جا رہی ہیں۔ ماں میرا دل اب اس گاؤں میں نہیں لگتا۔ میرا دل میلے میں بھی نہیں لگا۔ بس میرا جی تو اداس ہے میں ماما کے گھر جاؤں گی۔ کس سے پوچھوں اس کے ماما کا گھر کس نگر میں ہے۔ سنگراؤں سے باہر سارے گاؤں مجھے گڑیا گھر لگتے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ سنگراؤں بھی پرچھائیں ہے۔ سب کچھ پرچھائیں ہے۔

اور پھر بھی آتما نہ جانے کیوں بھٹکتی ہی رہتی ہے۔ ایسی چیزوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے جو کہیں بھی نہ تھیں۔ ایسی آوازوں کو سُننے کی آشا لئے جو پھر کبھی سنائی نہ دیں گی۔ سر پر گوبر کے ٹوکرے اٹھاتے اٹھاتے۔ دودھ بلوتے، اُپلے تھاپتے نہ جانے کیوں چند بہنوں سے میرا دل کیوں دھڑکا کرتا تھا۔ ہواہیں اچانک جانی بوجھی خوشبو ہوتی اور مجھے سارے باجوں کے سُر اپنے قریب آتے جان پڑتے۔ مجھے اپنے سے دُور ہوتے جاتے ہوئے۔ پر اب مجھے معلوم ہے جہاں وہ سب ہیں۔ وہ دیس میری پہنچ سے باہر ہے۔ سنگراؤں کو جانے والے راستوں کی طرح سارے لہراتے راستے ایک دوسرے کو کاٹتے گزرتے ہیں۔ کہانیوں کے اس شہر کا کھوج لگا کر میں کیا کروں گی۔

آباد گھروں کے کھلے کواڑوں سے اندر جلتے دئیوں کی کانپتی روشنیاں پریوں کے دیس کی تصویر سی جان پڑتی ہیں۔ گرپال اور لڑکے ہیں اور مُنّی اب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ سرکنڈوں کے ریشمی بُور میرے بالوں سے چھو رہے ہیں ہوا اپنا ریشمی آنچل سنبھالے دھیرے دھیرے سونے لگی ہے۔

اکیلے سے دو ہوں تو راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

مُنّی کہتی ہے" ماں میں تھک گئی ہوں۔ مجھ سے اب اور نہیں چلا جاتا۔ لڑکے رو رہے ہیں اور ان کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ بلا ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ ہم راہ سے ذرا ہٹ کر ایک کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے ہیں۔ مُنّی نے میری گود میں اپنا سر رکھ لیا ہے۔ گرپال کہہ رہا ہے: دیکھو تو سہی عورتیں اتنی بیوقوف ہیں، آج کتنے بچے گُم ہو گئے ہیں۔ میلے میں انہیں ہوش ہی نہیں رہتا کہ سنبھال سکیں پاگلوں کی طرح رام لیلا کی راس دیکھتے دیکھتے اپنے بچوں سے بچھڑ جاتی ہیں۔

"میلے کے بنا بھی تو بچے ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں" میں اس کی طرف دیکھے بنا مُنّی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہوں۔

"تم کبھی بھول بھی سکو گی اس بات کو کہ نہیں۔ وہ وقت اور تھا یہ اور ہے" گرپال ہولے سے کہتا ہے۔

گرپال کو میں کیسے سمجھاؤں کہ وقت کبھی اور نہیں تھا۔ اور انسان کے نصیب میں دُکھ اس لئے ہے کہ وہ بھول نہیں سکتا۔ میری یادیں وہ زمانہ اُسی طرح زندہ ہے۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ ملک آزاد ہو گیا تھا۔ ملک بٹ گیا تھا۔ اماں اور بابا نے کہا یہ سارے لوگ پاگل ہیں۔ جو ڈر رہے ہیں دوسرے دیس کو بھاگے جاتے ہیں۔ بھلا اتنے اپنوں کے درمیان بھی کبھی کسی کو کوئی دُکھ چھو سکتا ہے۔ اماں اور بابا کتنے بھولے تھے دُکھ تو سدا اپنوں سے ہی ملتے ہیں۔ اُس پریشانی کی کیا اصلیت ہے جو بیگانوں کے ہاتھوں ہمیں پہنچتی ہے۔ ساری زندگی نے اپنی خوبصورتی کھو دی اور ہر شے کا چہرہ خون کے غبار میں چھپ گیا۔ بھگوان۔ گرو اور اللہ کے نام پہ دان دینے والوں نے ایک دوسرے کے گلے پر تلواریں چلائیں۔ بہنوں بیٹیوں کے لئے کٹ مرنے والے عورت کی عزت اور عصمت کو جھوٹا بول سمجھنے لگے۔ بھائی اور اپنوں کے لفظ صدیوں کی بیڑیوں کی طرح اس آزادی اور بٹوارے میں کٹ گئے اور جتھے بنا کر گھومنے والوں کے قدموں میں دھول بن کر رل گئے۔ اماں نے بابا سے کہا تھا" ہم بھی دونوں لڑکیوں کو لے کر چلتے ہیں۔ میرا جی تو ہَول کھاتا ہے۔ اس وقت کسی پر بھروسا کرنا بے کار ہے"۔

اور بابا نے اپنی اُسی طمانیت سے کہا تھا "بی بی کی اماں تم بھی عام لوگوں کی طرح ناحق جان گھلاتی ہو۔ بھلا ہمیں بھی کوئی تکلیف ہو سکتی ہے۔ "بٹوارے کے بنا چارہ نہ تھا۔ یہ شور تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ"

اماں عام زندگی میں تو ایسے جواب سے مطمئن ہو جایا کرتی تھیں پر اس دن نہ ہوئیں۔ بولیں۔ "جان کے ساتھ عزت کا خطرہ ہے جو ان لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ میری مانو تو ہم سب کو بھیا کے پاس بھیج دو۔"

بابا بولے "راہوں پر ہر طرف گاؤں کے آوارہ لوگ بھاگتے پھرتے ہیں۔ گاڑیاں کی گاڑیاں کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ ایسے میں جانا اور بھی زیادہ خطرے کی بات ہے۔ بس تم خاموشی سے اپنے گھر میں رہو۔ خدا ہماری حفاظت کرے گا۔ بابا حالات کی وجہ سے پریشان ہوں گے مگر انھوں نے وقت کے گزرنے پر سوائے خدا کے بھروسے کے اور کسی کی مدد کا ہمیں واسطہ نہیں دیا۔ یوں وقت تو کب سے گزر چکا تھا۔ بابا کی بھول یہی تھی۔ کہ انہوں نے پرانی زندگی اور قدروں کا سہارا لیا تھا۔ اور اسی بھول کے بدلے تو جب گرپال مجھے گھسیٹ کر گھر سے باہر لا رہا تھا۔ میں نے بابا کے سفید سر کو نالی کے کنارے پڑے دیکھا۔ اُن کا جسم نالی میں تھا۔ بند آنکھوں اور خون آلود سر کو بھول کر وہ جانے کس طاقت سے پرواز تھا کر رہے تھے۔ دعا کے قبول ہونے کا وقت تھا بھلا؟ اماں کے سینے سے ایک چمکتا ہوا برچھا آر پار ہو گیا تھا۔ اور وہ اُسی جگہ گر گئیں۔ جہاں انہوں نے خدا سے اپنی حفاظت اور عزت کے محفوظ رہنے کی دعا مانگی تھی۔ آپا کی چیخیں آج بھی مجھے آندھی کے شور میں کبھی کبھار سنائی دے جاتی ہیں۔ پر آج کی طرح تب بھی میں کیا کر سکتی تھی۔ گرپال مجھے کھینچے لئے جاتا تھا۔ میرے سر پر چنری نہ تھی۔ پر مجھے ان راہوں پر بھیا کے ملنے کی آس کب تھی۔ اگر بھیا میرے پاس ہوتے تو بھلا کوئی مجھے چھو سکتا۔ کوئی یوں ننگے سر مجھے جنم بھومی کی ان راہوں پر گھسیٹ سکتا تھا۔ جہاں کا ہر ذرہ ہمیں پیارا تھا۔ ان راہوں پر میرے بابا کا خون گرا ہے اس دھول میں ان کا سفید سر گھسیٹا گیا تھا۔ وہ کون دیس ہے اگر اُس دھول کی ایک جھلک دیکھ سکوں تو آج بھی اس کو ماتھے پر چڑھاؤں۔ وہ مٹی مجھ سے تو خوش قسمت ہے۔

میں نے اپنے بابا سے کتنی باتیں ابھی کرنا تھیں۔ اماں کو میں نے کتنا ستایا تھا۔ بھیا اور بھائی کو کتنا تنگ کیا تھا۔ اور جب میرا وجود ڈولی کے بنا سنگرام ایک کھینچا گیا تو کوئی ماں جایا نہیں تھا جس سے میں رو رو کر التجا کرتی کہ بابل کا دیس چھوٹ رہا تھا اور کوئی مجھے وداع نہیں کر رہا تھا۔

دکھ سہنے کے بعد اگر سکھ کی آس ہو۔ دور کوئی امید ہو تو دکھ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور میرا رستہ کبھی نہ کٹ سکا کیا بھولوں اور کیا یاد کروں گرپال۔ تم نے تو کبھی مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے ہی نہیں دیا۔

بڑی ماں کی مار گرپال کی گالیاں، بھوک کی سختیاں میں نے دور ٹمٹماتے دیئے کی طرح اُس آس کی طرف دیکھ کر برداشت کر لی تھیں کہ شاید بھائی اور بھیا مجھے کسی دن کھوجتے ہوئے سنگراؤں میں آ جائیں۔ پھر میں بڑی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرا دوں گی اور گرپال کی طرف دیکھے بنا اپنے بھیا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اس دن نیم کے پتوں میں کھیلتی ہوا گیت گائے گی۔ اور سارے گاؤں میں خوشیاں ہوں گی۔ انسان اپنے کو ساری کائنات کا مرکز کیوں سمجھتا ہے نہ جانے کیوں۔ جب تک اندھیرے سے آنکھیں مانوس نہیں ہوتیں انسان اُجالے کے لئے آنکھیں جھپکاتا رہتا ہے اور سپنے دیکھتا ہے۔ امیدیں آوارہ خیالوں کی طرح دل کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں۔ مٹی پیدا ہوتی ہے تو میرے سپنوں کی کشتیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ دل کے گرد آشاؤں کا گھیرا ابھر گیا۔ میں نے سپنوں میں جاگنا شروع کر دیا۔ سنگراؤں کے گیتوں میں کبھی کبھار میرا ایک بول بھی گونج اٹھتا۔

جب دونوں ملکوں میں صلح ہوئی تو گرپال بہت اداس رہتا۔ سہما سہما اور پریشان۔ بڑی ماں اور وہ چوکے میں بیٹھے ہوئے ہولے ہولے جانے کیا باتیں کیا کرتے۔ پر مجھ سے دونوں کچھ نہ کہتے۔ ان دنوں منی پاؤں پاؤں چلتی تھی اور توتلی باتیں کرتی تھی۔ خبریں زور و شور سے گھومتی رہیں اور پھر بگولے کی طرح بیٹھ گئیں۔

مجھے کوئی فوج لینے نہ آئی۔

پھر میں نے سنا پاس کے گاؤں سے دوسرے ملک کے سپاہی لڑکیوں کو ڈھونڈ کر لئے جا رہے ہیں۔ کس دیس کو آخر کہاں کن لوگوں کے درمیان؟ ان دنوں میں نے بھی سوچا تھا۔ شاید بھیا اور بھائی بھی مجھے ڈھونڈنے آئیں گے۔ جادو کے شہر کے دروازوں کے باہر وہ کب سے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا چاہیئے۔ ضرور۔ میں سر روز اپنی امیدوں کی پوٹلی کی گرہیں باندھتی اور آس لگائے گلی کے موڑ کی طرف دیکھتی رہتی۔

اُس سال سردیوں میں ہمارے سنگراؤں میں سپاہی مجھے بھی لینے آئے۔ میں بھیا اور بھائی کی بی بی ہونے کے ساتھ ساتھ مُنّی کی ماں بھی ہوں اور میں نے سوچا جانے یہ کون لوگ ہیں۔ وہ کون دیس ہو۔ زندگی میں پہلی بار میرا یقین ڈگمگا گیا سپنوں کا شہر دُھول بن کر میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ میری جڑیں سنگراؤں کی زمین میں گہری ہو گئی ہیں۔ سوکھنا، مُرجھانا اور برباد ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ ہر کسی لڑکی کو مائکے سے وداع ہو کر سسرال جانا ہوتا ہے۔ ہر دلہن بیاہ کر کہیں نہ کہیں جاتی ہے۔ میرے بیاہ میں بھیا اور بھائی نہ ملنے تو کیا ہُوا۔ گوپال نے میرے لئے لاشوں کا فرش بچھایا تھا خون سے راہیں سرخ کی تھیں۔ شہروں کے شہر جلا کر روشنیاں کی تھیں۔ لوگ چیختے چلاتے بھاگتے میری شادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ ساری فضا میں بدلے رواجوں کے مطابق دھوئیں اور آگ اور خون کی بُو تھی مجھے وہ سنگراؤں لایا تھا۔ یہاں گندم کے کھیتوں کے درمیان کچے گھر کی کوٹھڑی میں میری باقی زندگی بیتنے والی تھی۔ اُپلوں کے نیلے دھوئیں سے بھرے گھر میں۔

میں کتنی دیر اس کتاب کے حرفوں کو دیکھتی رہی تھی جو گوپال اتنے برسوں بعد مُنّی کو پڑھانے کے لئے لایا تھا۔ اور لفظ میری آنکھوں میں دھڑکن بن گئے تھے۔ مجھے وہ ساری کہانیاں یاد آ گئی تھیں جو بھیا اور بھائی نے مجھے سنائی تھیں اور پھر کہا تھا "بی بی اس سے بھی اچھی کہانیاں کتابوں میں ہیں بس تو ذرا بڑی ہو جا پھر دیکھنا کتنے مزے کی باتیں پڑھے گی۔" کہانیوں کی شہزادی کی طرح جب فوج مجھے چھڑانے آئی ہے تو میں چھُپ گئی۔ میں کسی اور کے ساتھ کیوں جاتی بھلا مجھے لانے اور وداع کرانے بھیا اور بھائی کیوں نہیں آئے۔ میں دل ہی دل میں بھیا اور بھائی سے روٹھ گئی ہیں اُن سے آج تک خفا ہوں۔

مُنّی جب میرے پاس لیٹتی ہے۔ اور مجھ سے پوچھتی ہے "ماں تم دیوالی میں بھی ماما کے گھر کیوں نہیں جاتیں۔ ماں ہمیں کبھی کوئی مٹھائی کیوں نہیں بھیجتا۔؟

ماما کبھی کھوجنے ہی نہیں نکلے مُنّی۔ تیرے ماما مجھے کبھی وداع کرانے نہیں آئے۔ بھلا زندگی میں کسے اتنی فرصت ہوتی ہے کہ کسی کو ڈھونڈتا پھرے۔ بھولے بسرے رشتے بھی سہارے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ بھیا کے بچے اب مُنّی کے برابر بڑے ہوں گے۔ وہ جب اپنی ماں سے ماما کے گھر کی باتیں پوچھتے ہوں گے۔ تو اُسے چپ رہ کر یا دھیان ہٹانے کے لئے اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کرنی پڑتی ہوں گی۔ کبھی کبھار دل میں کہانیاں ہوتی ہیں پر زبان پر ایک لفظ نہیں آتا۔ گلی کی بہوئیں جب نیم کی چھاؤں میں چرخے کاتتی گیت گاتی ہیں تو میں چپ رہتی ہوں۔ ہمارے آنگن میں کتنی رونق ہوتی ہے مائکے کے گیتوں میں کتنا رس ہے۔ رُتیں بدلتی ہیں۔ سال بر سال کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو ان کے باپ بھائی وداع کرانے آتے ہیں۔ تب آشا۔ ریکھا۔ پُورو اور چندر کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ وہ ہر ایک کے گلے مل کر مائکے جاتی ہیں۔ ان کے بول گیت لگتے ہیں۔ رُتیں بدلتی رہتی ہیں۔

لڑکیاں کوٹھے سے اڑا کر اپنے ویروں کے آنے کا پوچھتی ہیں۔ میرا دل گلے تک دھڑکنے لگتا ہے اور کلیجے کے قریب ایک نس ایسے پھڑکتی ہے۔ مانو پھٹ جائے گی۔ میں کوّے کو اُڑانے کے لئے ہاتھ اٹھاؤں تو بے جان ہو کر وہ میرے پہلو میں گر جاتا ہے۔

بڑی ماں کو مجھ سے آس بندھ گئی۔ جب میں نے اپنی پچھلی زندگی سے سارے ناتے توڑ لئے تو میرا اور بڑی ماں کا ناتا اور گہرا ہو گیا۔ میں اس کی لکشمی بہو بن گئی ہوں۔ میرے ہاتھ کا سوت وہ بڑے چاؤ سے لوگوں کو دکھاتی ہے۔ اور دوسری عورتیں جب اس سے اپنی بہوؤں کے گلے کرتی ہیں تو وہ میری باتیں کر کے اُن کا دل اور بھی جلاتی ہے۔

کھیتوں میں گھومتی اناج کی خوشبو اور سبز گندم کی بالوں کی باس دُور تک پھیلے نیلے دھوئیں میں مل کر ایک گیت بن جائے۔ ان پرچھاؤں کے تاروں سے بھرتا آکاش اور نہر کا ننھی منی لہروں میں بل کھاتا پانی سب اُس کے بول ہوں اگر بیلوں کے لئے سر پر چارے کے گٹھے اٹھائے کسانوں کے پیچھے کسی دن گھوڑے پر سوار ایک جوان میرے کھڈے کو اٹھوں کے سامنے آن کر اُترے اور میں بھیا کہہ کر اُس سے لپٹ جاؤں۔ میں دروازے میں کھڑی کھڑی بھلا کس کا راہ تکا کرتی ہوں۔ آشاؤں کے مرنے کے بعد اُن کی لاشوں کو اٹھائے مجھے کب تک گھومنا ہوگا؟ ان اونچ نیچ راہوں کو دیکھتے یہ آنسو آپ سے آپ میری آنکھوں میں کیوں آ گئے ہیں۔ مُنی کے سر پر اگر یہ آنسوں گر گئے تو وہ گھبرا کر اُٹھے گی۔ اور پوچھے گی۔ "ماں! تم روتی کیوں ہو؟" میں اس سے اپنا دُکھ کیسے کہوں؟

منی اگر پوچھے! "تمہاری آنکھیں بھیگی ہوئی کیوں ہیں تم دسہرے کی رات بھی روتی ہو ماں۔ کیا تم تھک گئی ہو؟"

گرپال نے ــــــ دونوں بچوں کو کندھے پر اٹھالیا ہے۔ مُنی اور میں سنگراؤں جا رہے ہیں۔ سیتا جی نے دوسری بار بن باس پر جانے کے بدلے راون کے گھر کو قبول کر لیا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئے گی کہ میں دوسری بار کسی بے یقینی کا سہارا لے کر اندھیکار سے باہر قدم دھر سکوں۔

زندگی کی ساری روشنیاں پیچھے شہر کی طرح مجھ سے دور ہٹ گئی ہیں مگر مجھے پھر بھی اس اندھیرے سے پیار نہیں ہوپاتا نہ جانے کیوں۔؟ مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ تھکن میرے انگ انگ میں دُکھن بن کر پھیلی ہے۔ پر پھر بھی مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ چلتے ہی رہنا ہے۔ زندگی کے میلے میں باسی اور بن باسی سب قدم بڑھائے چلنے پر مجبور ہیں اور میں قدم بڑھاتی سوچتی ہی رہتی ہوں کبھی بھائی اور بھیا بھی میرے لئے اداس ہوتے ہوں گے؟۔ سب سے زیادہ ڈر تو مجھے مُنی سے لگتا ہے۔ وہ پھر کل مجھ سے یہ سوال پوچھے گی۔ اور پھر کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکے گا نہ گرپال اور نہ میں اور نہ شاید بڑی ماں۔

کئی سوال ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ اتنے کٹھن اور ایسے مشکل جن کا جواب کوئی بھی نہ دے سکے۔

سردیوں کی لمبی راتوں میں دُکھ اوڑھ کر بیتے سپنوں کو بلانا اور کہانیاں سنتا ہے۔ کہانیاں بھلا سچی ہو سکتی ہیں۔ من بڑا ہٹیلا ہے۔ ایسے بیتے دن نہ جانے کیوں یاد آتے ہیں؟

سنگراؤں سے پرے بھی کوئی نگر ہے کیا؟

گاؤں کی اونچی نیچی گلیوں میں گوبر اور موت کی باس اناج کی باس کے ساتھ مل زندگی کے دھارے کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔

آج کا دن بھی ختم ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں کی طرح دن ختم ہو جاتے ہیں۔ جانے ابھی کتنا راستہ باقی ہے؟

نیا دور

سہ ماہی
نیا دور
کراچی
شمارہ نمبر
۸۱—۸۲
خاص نمبر
قیمت: پچاس روپے
شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی
Scanned with CamScanner

جمیلہ ہاشمی

شبِ انتظار

جس رات کی میں بات کہنے جا رہی ہوں اُس کی صبح مجھ پر زیادہ اور بھائی پر کم مار پڑی تھی ماں آتی سردیوں کی گرم دھوپ میں آنگن میں لحاف پھیلائے اُس میں ڈورے ڈال رہی تھی ــــ لڑکیاں سیپاروں پر جھکی نانی کا پڑھایا ہوا سبق دُہرا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر ایک دوسری سے زیادہ کرخت آوازیں نکال رہی تھیں۔ میں تاگے اُلجھا رہی تھی، حالاں کہ میں ماں کو سوئی میں لمبا دھاگا پرو کر دینا چاہتی تھی۔ پھر تھک کر میں نے جھاڑو کی سینک پر دھاگے باندھے اور بوتل کے ڈھکنے سے ترازو بنانے لگی۔ نانی نے لمبی ہوں کی تو ہم خوف زدہ ہو گئے ماں نے ڈانٹا کہ ہم جھاڑو برباد کر رہے تھے۔ ڈر کر ہم سیڑھی پر چڑھ گئے جہاں دیوار کے پار سے ماسے دلاور کا صحن نظر آتا تھا جس میں چڑیاں گوبر کے ڈھیروں سے دانے چُن کر اُڑ اُڑ جاتی تھیں اور کُتے گھڑی گھڑی بھونکتے تھے۔ پھر بطخیں ماں برکتے کی طرف سے بڑی محراب والی نالی کے راستے قائیں قائیں کرتی چونچیں پانی میں مارتی دھوپ کو دُھنکتی سر کو بار بار ڈبکی دیتیں چھوٹی کشتیوں کی طرح تیرتی ہوئی اوپر آتیں۔ کوّے خالی گھر کے دالان میں گھس کر کائیں کائیں شور مچا رہے تھے، کیوں کہ مامی خورشید اور ماسی شاد کھیتوں پر گئی ہوئی تھیں یہ کپاس کی چنائی کے دن تھے۔

ہم دیوار پر ہاتھوں پاؤں سے چلتے دوسری سیڑھیوں سے خالی صحن میں اُتر گئے۔ کُتا زور سے بھونکا بطخیں کواں کواں کرتیں ہمارے پیچھے بھاگیں۔ ہم دوڑ کر دالان کے ساتھ بنے ہوئے چھپر تلے چولھوں کی قطار پر چڑھ گئے اور چھپ کر بیٹھ گئے، جھانک کر دیکھا تو بطخیں زرد پانی میں کھلی آسمان کی نیلاہٹ اور دھوپ سے پار جا چکی تھیں کوّے دالان کو بھول کر منڈیر پر بیٹھے چونچوں

سے پروں کو صاف کر رہے تھے اور چُپ تھے۔ ہم دونوں بھی اپنے ترازو سے کھیلنے لگے۔ ہم چولھوں میں پڑی راکھ کو تولنے لگے۔

اب کچھ اور تولتے ہیں مجھے یاد آیا شہر میں دکان دار اُجلے دہی کو کیسے کھٹا کھٹ برتنوں میں ڈالتے ہیں۔ دیکھنے سے ہی کتنا مزہ آتا ہے۔

ایک چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے سلگتے اُپلوں کا دھواں ذرا ذرا باہر آرہا تھا۔ کاڑھنی میں دودھ گرم ہو رہا تھا، چلو دودھ تولتے ہیں میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ چولھے پر لُڑھکے ہوئے گلاس سے ہم نے دودھ نکالا۔ میں دُکان دار تھی اور آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی بھائی گاہک تھا اور ایک ایک پیسے کا سودا گھڑی گھڑی لے رہا تھا۔ گرم دودھ اُس کے حساب میں میں زمین پر ڈال رہی تھی ہم بہت ہی مگن تھے بہت ہی خوش۔ چھوٹی چھوٹی دودھ ندیاں سی ہمارے چاروں طرف بہہ رہی تھیں

"ہائے میں مرگئی" ماسی شادو کی آواز سنائی دی۔ میں نے اوپر دیکھا اور ترازو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ شادو نے ماں کو آواز دی۔

"بہن قشا نی بہن قشا - دیکھ اپنے لاڈلوں کے کام"۔

ماں کی خوف زدہ آواز سیڑھیوں پر سے آئی۔ نی شادو میرے بچے تو خیریت سے ہیں اور وہ بھاگتی ہوئی دیوار پر سے ڈولتی ہوئی گرنے سے بچتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی پھولے ہوئے سانس سے جیسے اُڑتی ہوئی آئی ہو ماسے دلاور کی طرف آئی۔

"یہ دیکھ یہ دیکھ" شادو نے چیختے ہی کہا "سارا دودھ غارت کر دیا ہے"۔

ماں کا دھواں دھواں چہرہ ایک دم چمکا اور وہ چمک اُس کے ہاتھوں میں اُتری اُس نے مجھے گھسیٹا اور روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیا۔ بھائی کو بھی دو چار طمانچے پڑے۔

ماں بر کتے ننگے پاؤں دھوتی سنبھالتی اپنے دالان سے آئی اور مجھے پکڑ کر ایک طرف کیا۔

"ہوش کر نشا بچے ہی تو ہیں" پھر دودھ کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "اگر سمجھ دار ہوتے تو نقصان کیوں کرتے"۔

ماں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "شادو کو چیختے سنا تو میں نے سوچا خدا نخواستہ بچّوں کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ مگر اب ان کو نصیحت ہو گئی، کبھی پھر ایسا نہیں کریں گے۔ ماسی تم ہٹ جاؤ آج مجھے اس کی ہڈیاں سینک لینے دو، یہ سمجھ دار ہے بڑی ہے دودھ کا حشر کر دیا ہے۔ شادو ٹھیک ہی کہتی ہے اور ماں میری طرف پھر

بیکی۔

نانی کی سیڑھیوں پر آتے آتے ہمسائے میں ماں فضلاں کی بہو کرماں کا جھانکتا چہرہ سب آنسوؤں کی جلن اور کانوں کی سائیں سائیں میں گڈمڈ ہو گئے۔

ماں برکتے مجھے اپنے گھر لے آئی۔ دالان میں بچھی کھاٹ پر بٹھا کر زبردستی گرم دودھ پلایا پھر جب آنسو اور شرمندگی کا زور ذرا کم ہوا تو میرا تپتا ہوا چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھلایا۔ اس کی پوتی مودی نے اپنی گڑیاں اور ان کے پوتے لا کر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ تھوڑی دیر تو میں روتی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی پھر رنگ برنگ کپڑوں، ننھے منے پوتوں اور موتیوں کی نتھ پہنے گڑیا نے مجھ پر جادو کر دیا۔ ہم نے لکڑی کے ستونوں کے پیچھے اپنے اپنے گھر سجائے اور جہیز سینے لگے۔ پوتے بنانا بہت آسان تھا ذرا ذرا سی کترنوں کو ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر زور سے پھیلاؤ تو ڈوری سی بٹ جاتی تھی اور ٹانگوں کے سرے پر ایسے ہی بازو لگا کر ایک گولی سی بنا کر سر لگا دیا جاتا۔ مودی ان کی آنکھیں اور منہ توے کی سیاہی سے بناتی جاتی۔ ہم نے ایک بھیڑ بنا ڈالی۔ حالاں کہ مودی کہتی تھی زیادہ پوتے سنبھالنا بہت مشکل ہو جائیگا پھر یہ آپس میں لڑیں گے تو گڑیا مصیبت میں پڑ جائے گی۔ تھک کر ہم نے لق و دق آنگن کے دوسرے سرے تک بطخوں کو بھگایا، کچے امرود کھائے پینگ پر لمبے لمبے جھونٹے لئے۔ دیوار پر چڑھ کر پچھلی طرف سارنگی بجانے والے فقیروں کے گھر جھانکا۔ مودی نے مجھے اپنی گڑیا کے بیاہ کا قصہ سنایا۔ آئندہ وہ گڑیا کی شادی نوری کے گڈے سے کرنے والی تھی۔ کیوں کہ پہلا گڈا کانا تھا اور اس کا سرہلتا تھا بارات جو آئی تھی تو باجا بجانے والے لڑکے نہیں تھے۔ وہ گڑیا کے بغیر ہی چلے گئے تھے، کیوں کہ مودی نے اتنے میلے گڈے کے ساتھ اپنی گڑیا بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر شمو کی اور اس کی لڑائی ہو گئی تھی دونوں نے ایک دوسرے کے بال نوچے تھے اور بڑا ہنگامہ ہوا تھا دونوں کی ماؤں کو درمیان میں آنا پڑا تھا۔

شام ہو گئی تو گائیں بھینسیں گھر لوٹ آئیں وہ بے صبری سے چارے کی ناندوں میں سر دے تھیں اور ان کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ٹنا ٹن بولتی تھیں اور تیز تیز اڑتی اپنے گھروں کو جاتی چڑیاں اور کوے اور تیز اڑتے تھے۔ مودی کی ماں اور ماسیاں کھیتوں سے واپس آگئیں۔ گھر چمکتے چہروں باتوں اور جوان لڑکیوں سے بھر گیا۔ مودی نے گڑیاں سمیٹ کر ایک ڈبے میں بھریں اور کوٹھری میں

اناج اور گڑ کی بوریوں کی اوٹ میں چھپا کر رکھ دیں۔

"آج نشا کی طرف جانا ہے چرخے تو ٹھیک ہیں نا۔ میرے چرخے کی مال پرانی ہے اور تکلے کو بھی کسی نے ٹیڑھا کر دیا ہے"۔ اس نے پھر کر مودی کی طرف دیکھا۔ "کیوں مودی تو نے آج میرے چرخے کو چھیڑا تھا؟

"نہیں ہم دونوں تو آج گڑیاں کھیلتی رہی ہیں۔ اس سے پوچھ لو۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔

مودی کی ماں نے میرے سر پر پیار کیا۔

پھر وہ آٹا گوندھنے لگ گئی۔ ماں برکتے نے دال کو بگھار لگایا تو مہک سے آنگن بھر گیا۔ ملائی بنا کر اُس نے دودھ کو بڑی چاٹی میں پلٹا اُس کا رنگ پک پک کر ہلکا سُرخ ہو رہا تھا یا شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں سورج کی لالی منڈیر پر سے اس میں جھلک رہی تھی تنور میں شعلے اُونچے اور روشن تھے۔

رات ہونے سے پہلے مودی اور میں ماں برکتے کے بستر میں گھس گئے۔ وہ کہتی میری ماں کو بڑی کہانیاں آتی ہیں چڑیا اور کوے کی کہانی تو بہت ہی مزیدار ہے۔

کہانیاں تو میری ماں کو بھی بہت آتی تھیں مگر مجھے یاد آیا کہ صبح میری پٹائی ہو چکی ہے اور ماں مجھ سے سخت خفا تھی۔ گھر سے مجھے لینے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ مجھے راج ہنس کی بہت عمدہ کہانی یاد تھی مگر میں نے کچھ نہ کہا اور چڑیا کی کہانی سنتی رہی سنتی ہی رہی۔

آنکھ کھلی تو میں ماں کے کندھے سے لگی تھی اور میری ناک اُس کی موٹی چوٹی سے رگڑ کھاتی تھی بالوں میں سے کھٹی لسی کی مہک اُس کی خوشبو سے ملی بڑی میٹھی اور تلخ تھی پھلکاری میں سے ہوا میری ٹانگوں کو لگ رہی تھی۔ مامے دلاور کے صحن میں کتے بھونک رہے تھے لڑکیاں بے پرواہ کھچر کھچر باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔

پھر آناج کی کوٹھیوں کے ساتھ بنے اوسارے پر جب ماں نے اور بچوں کے درمیان مجھے لٹایا تو میں نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اُس نے جھک کر میرے ماتھے کو چوما اور میرے گرد رضائی لپیٹ دی۔ کوٹھڑی آوازوں اور چرخوں کی گھوں گھوں ہنسی کے شور سے

دبکی ہوئی تھی۔ تیل کے دیئے جلنے کی بو۔ مہندی لگے ہاتھوں کے پسینے میں ملی گیتوں کی تانوں میں اڑتی تھی۔ قہقہے چھن چھن بولتے تھے۔ آنکھیں گنگناتی اور چمکتی تھیں ناک کے کیل مجھے چاند لگ رہے تھے اور اُن کی انگلیاں دھاگے پر یوں تیزی سے جبی ہاتھوں کے ساتھ اٹھ اور گر رہی تھیں جیسے مولے وال کے ٹیلے پر وہ ناچ رہی ہوں۔ عجیب جادو تھا ہلکا نیلا دھواں کوٹھری میں بھر گیا تھا اور پھر وہ غبار بن کر میری آنکھوں میں اُتر آیا۔

کسی بچے نے ادسارے پر خواب میں زور سے ٹانگ چلائی جو میرے سر پر لگی اور میری آنکھ کھل گئی۔

"آج کرم نہیں آئی نا اُس کا بہنوئی پچیس سال کے بعد واپس آیا ہے سارے خوش ہیں۔" کسی نے کہا۔

"جانے والے کبھی لوٹ کر تو نہیں آیا کرتے۔" ماں کی آواز آئی۔

"تیرا چاچا واپس نہیں آیا نا!" مودی کی ماں نے کہا۔

"اب چاچا آ بھی جائے تو کیا فائدہ دادی تو رہی نہیں جسے اُس کا انتظار تھا۔ میں کوٹھری میں دادی کے ساتھ ہی سویا کرتی تھی۔ سردی میں جب بھی آنکھ کھلتی میں جاگ جاتی تو اُسے بیٹھے ہوئے ہی دیکھتی گھٹی گھٹی آواز میں جیسے وہ خود ہی سُن سکتی تھی، کہتی امام علی آوے امام علی۔ اُن دنوں میں سوچتی وہ زور سے کیوں نہیں پکارتی کسے بلاتی ہے۔ دم گھونٹ کر کیوں روتی ہے کسی سے کچھ کہتی کیوں نہیں دن کے وقت چُپ چاپ سائے کی طرح پھرتی رہتی ہے رات کو کیوں جاگتی ہے۔ یہ امام علی کون ہے؟ اُس کا کون ہے؟ کیوں کہ گھر میں اور کسی کو میں نے یہ نام پکارتے کبھی نہیں سُنا۔

بڑے ہو کر دادی کے مرنے کے بعد ہی مجھے پتہ چلا کہ وہ میرا چاچا تھا۔

گاؤں کے سرے پر ایک مسجد ہے دالان در دالان اور مغرب کی طرف حجروں کی قطار بڑا سا پختہ کنواں جو ڈھاب کے بڑھنے کی وجہ سے تقریباً منہ تک بھرا رہتا اور مسجد کے باہر کھلی زمین پر سایہ کئے ایک تناور بڑ ہے، جس کے تنے کے گرد چبوترے پر مسافر آ کر دم لیتے اور گرمیوں کی دوپہروں میں لوگ سوتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہیں اور رونق رہتی ہے مگر مسجد میں میرے نانا دو چار شاگردوں کے ساتھ درس دیتے ہیں۔ پتہ نہیں لوگ زیادہ درس میں شریک کیوں نہیں ہوتے تھے

نانا کو کھانا دینے کے بہانے میں اُس بڑ کی چھاؤں میں خُوب کھیلتی پھر جب چھٹیوں میں ہم شہر سے گاؤں آتے تو ان خالی حجروں میں گری ہوئی چھتوں تلے چمگادڑوں کے ڈر سے میں صرف جھانک لیتی یا ستونوں کے گرد بازو ڈال کر خُوب چک پھیریاں لیتی کبھی محرابوں تلے بیٹھ کر منقش چھت کو تکتی اور لکیروں کو دُور تک گنتی چلی جاتی یہاں تک کہ میری نظر گھبرا کر لوٹ آتی۔ نانا اکثر مراقبے میں ہوتے۔ پھر شمّو میں اور مودی کنوئیں کے ٹھیرے ہوئے پانی میں اپنے اپنے چہرے دیکھتے اور ڈھاب سے کنول نکال کر اُن کے ہار پروتے۔ شام پرندوں کے شور میں ڈوبی ہوتی یہاں تک کہ اذان کی آواز بھی دب جاتی۔ اندھیرا بڑا ڈراؤنا ہوتا لوگ کہتے تھے یہاں ایک دیو رہتا ہے مگر مسجدوں میں رہنے والے اُس سے کیوں ڈریں۔ لوگ گاؤں کی طرف جانے کے لئے شام کے بعد دوسرے راستے سے جلتے جو ٹھنڈے کنوئیں کی طرف سے ذرا لمبا تھا مگر آباد تھا۔

"امام علی تم کو مُوطا پڑھے بنا اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے اتنی دُور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ایک بار کہہ دیا تھا کہ یہ رویّت کا مسئلہ ہے اور اس کا سمجھنا بغیر فضلِ خداوندی کے محال ہے اور بغیر مطالعہ کے جنون ہے۔ تم لوگ اکتسابِ علم کے ساتھ اکتسابِ فیض کی بھی دعا کیا کرو۔"

میرے ذہن میں ایک دم چھن سے ہوا برسوں پہلے کی بھُولی ہوئی وہ رات یاد آئی اپنی ماں کی آواز امام علی آ وے امام علی۔

"اچھا تو یہ ماں کے چاچا ہیں جو نانا کے پاس آگئے ہیں۔" میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی گلیوں میں سے دیوانہ وار دوڑتی ہوئی۔ لوگوں سے ٹکراتی گلی کے پتھروں پر ٹھوکریں کھاتی۔ کھیتوں سے پلٹتے ہوئے لوگوں کے ہلوں تلے روندے جانے سے بمشکل اپنے آپ کو بچاتی اُڑتی ہوئی۔ ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی ماسیاں اور مامیاں مجھے پُکارتی ہی رہ گئیں "نشا کی بیٹی کیسے بھاگی جاتی ہے۔" سانس میرے سینے میں سما نہیں رہا تھا۔ باہر کا دروازہ دھڑ سے کھول کر میں جا کر ماں سے لپٹ گئی۔

"ماں۔ ماں" اس کے سوا میرے منھ سے اور کچھ نکل نہیں رہا تھا۔

"ارے خیر تو ہے لڑکی کیا ہوا ہے۔؟" ماں نے مجھے لپٹا لیا۔ "کسی نے مارا ہے کسی شے نے

کانا ہے؟"

"نہیں نہیں" میں نے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہ آئے ہیں" "ہیں۔ نے اٹک اٹک کر کہا

" ارے کون آئے ہیں بول تو سہی" ماں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"امام علی تمہارے چاچا امام علی۔ وہ ادھر مسجد میں نانا کے پاس بیٹھے ہیں"۔

" ماں کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا، اُس کے ہاتھ میرے بازوؤں سے پھسل کر بے جان سے اُس کے پہلو میں گر گئے جیسے اُس کے اندر خوشی کا سناٹا ہو گیا ہو، جیسے یہ سب سے بڑا بوجھ ہو جو میں نے اُس کے کندھوں پر ایک دم اُلٹ دیا ہو۔

نانی نے زور سے ہنکارا بھرا۔" بھئی کون آیا ہے"۔ اُس نے حقے کی نے مُنہ سے نکالی۔

ماں ہولے ہولے قدم اٹھاتی نانی کی طرف چلی۔

اب میں سانس سنبھال چکی تھی۔

" وہ امام علی آئے ہیں ماں کے چاچا" میں نے دور کھڑے ہو کر کہا۔

"تجھ سے کس نے کہا ہے۔ کیا بکتی ہے"۔ نانی نے زور سے کہا۔

"نانا کے پاس مسجد میں بیٹھے ہیں باتیں کر رہے ہیں امام علی" میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

نانی نے سر دائیں بائیں گھماتے ہوئے کہا۔ " وہ امام علی ہو ہی نہیں سکتا، پھر میری طرف مڑ کر کہا۔" تجھے کیا پتہ امام علی تیری ماں کا چاچا ہے۔ کون یہ قصے کہتا ہے تجھ سے"۔

" ماں کی دادی راتوں کو روتی اور پکارتی تھیں امام علی آ دے امام علی" میں نے سر اٹھا کر بڑے حوصلے اور دلیری سے ماں کی طرف دیکھا ماں نے سر جھکا لیا وہ اُپلوں کو توڑ رہی تھی تاکہ اُن پہ دال کی ہنڈیا سہج سہج پکے۔

نانی نے کہا" چل بھاگ یہاں سے جانے کہاں سے اتنی باتیں آ گئی ہیں اسے۔ نشا اسے کریما یاد کروا یہ سارا دن ٹک کر نہیں بیٹھتی کھیتوں اور باغوں میں گھومتی ہے۔ باتیں سننے اور ٹوہ لینے کی عادت پڑ گئی تو جائے گی نہیں۔ چل جا تختی لے کر آ اور لکھ"۔

میں مرے مرے قدموں سے اندر گئی کافی دیر کھڑی رہی پھر تختی کو ڈھونڈا اور باہر لا کر اُسے ملتانی مٹی سے مچکایا پھر ہل ہل کر اُسے سکھاتی رہی۔ کلک سے اس پر الف بے لکھتی رہی مگر سارا وقت میرا جی اس بات میں پڑا تھا کہ آخر امام علی جو ماں کا چاچا تھا کیوں واپس نہیں آسکتا۔ وہ آگیا ہے مسجد میں نانا کے پاس ہے مگر نانی کیوں خفا ہو رہی ہے آخر؟

پھر شام کی نرم ہوائیں کھیتوں پر سے دھان کی خوشبو لائیں ستاروں کے دیئے تیزی سے ایک کے بعد ایک جلنے لگے۔ کام سمیٹ کر ماں اور اس کی سہیلیاں۔ ماں برکتے کی بہوئیں شادو اور اس کی بہنیں مولے والی کی طرف چلیں۔ جہاں ٹیلوں پر روز شام کو میٹیاروں کا ہجوم ہوتا تھا۔ بوڑھی عورتیں ایک دوسری سے ملتی تھیں اور بہوؤں کے قصے کہتی تھیں۔

میں نے مودی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے کہا "میں تجھے ایک بات بتاتی ہوں بڑے راز کی۔ ماں کا چاچا امام علی آگیا ہے اور مسجد میں نانا کے پاس بیٹھا ہے مگر نانی کہتی ہے وہ آ ہی نہیں سکتا۔ اور وہ بھوت نہیں تھا نہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ وہ باتیں کر رہا تھا اور اُن کے پاؤں چھو رہا تھا۔

مودی نے کہا ہو سکتا ہے وہ بھوت ہی ہو تمہارے نانا کے پاس سنا ہے جن قابو ہیں"۔

"اچھا میں نے حیرت سے کہا بڑے مزے کی بات ہے نانا کے پاس بھوت آتے ہیں"

"اور کیا میری دادی کہتی ہے، ماسی خورشید کہتی ہے، پھوپھی شادو کہتی ہے سب کو پتہ ہے"۔ مودی نے کانپ کر کہا۔

"نہیں مودی وہ سچ مچ کا امام علی تھا" میرے دل میں عجیب پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔

"تم یہاں ٹھہرو میں اپنی دادی سے پوچھ کر آتی ہوں" وہ ٹیلے پر ناچتی ہوئی عورتوں کے گھیرے سے پرے دوسرے گھیرے کی طرف چلی گئی۔

ستاروں کی مدہم روشنی میں گیت اور پاؤں کے لہریئے غبار کی طرح مولے والی کی مٹی پر گھوم رہے تھے اور مودی کی چھوٹی سی ڈری ہوئی دادی کو پکارتی آواز اسی میلے میں گم ہوئی لگتی تھی میں نے تھوڑی دیر مودی کا انتظار کیا اور پھر دوسری، کی نل چنے والی لڑکیوں کی ٹولی میں رل مل کر گیت گانے کی کوشش کرنے لگی، جن کے بول مجھے نہیں آتے تھے مگر جو مجھے اپنی جھنکاروں کی وجہ سے اچھے لگتے تھے۔ میٹھے رسیلے جیسے گنے کا رس ہو جو ہاتھوں میں اور منہ پر لگ جاتا ہے جس

کی بُو خواب کی طرح ہوتی ہے بھلائے نہیں بھولتی ساتھ ساتھ چلتی ہے یا پکتے گڑ کی مہک کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے اور جان کو مٹھاس سے بھر دیتی ہے۔

واپس جاتے ہوئے عورتیں ماں سے پوچھ رہی تھیں۔" نشا تیرا چاچا امام علی سنا ہے آگیا ہے اور مسجد میں ہے۔"

"اگر چاچا ہوتا تو گھر پیغام آتا" ماں نے ہولے سے کہا۔

"میں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی جب امام علی گیا ہے"۔ ماں برکتے نے کہا تو تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی نشا۔

اندھیرے اور بھیڑ اور غبار میں جو ستاروں کی روشنی میں کم دھندلا تھا۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا جو بہت دُکھی لگ رہی تھی اُس کے قدم آہستہ اُٹھ رہے تھے اور وہ باتوں کے شور میں گم سُم ہو گئی تھی۔ ماں کو اپنی دادی کا گھٹی گھٹی آواز میں رونا اور پکارنا اور امام علی آوے امام علی کہنا یاد آرہا ہوگا۔ آدمی اکثر کسی قصور کے بنا بھی بہت دکھی ہو جاتا ہے بہت ہی دکھی۔

"ماں نانا کے پاس جن قابو ہیں؟" کریما کا سبق سُنا کر میں نے پوچھا۔

"تجھے کون یہ سب سناتا ہے تیری نانی ٹھیک ہی کہتی ہیں سارا دن کھیتوں اور باغوں میں گھومتی اور بڑ تلے اکیلی کھیلتی ہے۔ یہ کیا قصے تو نے بنا رکھے ہیں۔ ماں خفا نہیں تھی مگر خفا لگتی تھی۔

"پھر وہ امام علی جو نانا کے پاس آئے کون تھے، کیا جن تھے تیرے چاچا نہ تھے، جن کے لئے روتے روتے تیری دادی مر گئی۔"

"کس نے تجھ سے یہ سب کہا۔" ماں نے میرے کندھے پکڑ کر مجھے اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس رات جب تم سب چرخے کات رہی تھیں اور اُسارے میں بچے سو رہے تھے تو میں جاگ رہی تھی۔ میں نے تمہاری سب باتیں سُن لی تھیں۔

ماں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔" تو تم نے میری بات سُن لی تھی۔" پھر سوچ سوچ کر کہنے لگی۔" پتہ تو مجھے بھی ٹھیک سے نہیں کہ کیا ہوا مگر سُنا ہے کہ تمہارے نانا اپنے چھوٹے بھائی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے اور انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ کہا تھا اس گھر میں اب کبھی نہ آنا اور چاچا نہیں آئے۔"

"کہیں تو ہوں گے وہ کبھی تو واپس آسکتے ہیں۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں منی کبھی نہیں جو ایک بار لکیر سے نکل گیا تو وہ بس گیا پھر وہ واپس نہیں آسکتا۔" ماں مجھ سے زیادہ اپنے سے بات کر رہی تھی۔ "تمہارے نانا بہت غصہ ور اور بات کے پکے ہیں اور یہ سب امام علی چاچا بھی جانتے ہوں گے اُن کے واپس آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

"مگر وہ کہیں تو ہوں گے۔؟" میں نے پھر ہٹ دھرمی سے کہا۔

ماں نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "دادی انھیں پکارتی ہوئی مر گئی۔ روتی روتی چلی گئی۔ سانس بند کر کے وہ گھُٹی گھُٹی آوازیں دیتی جو اُس کے سوا کوئی سُن نہ سکتا۔ اب تو لوگ سب بھول گئے ہیں، اس گھر میں کوئی یہ نام نہیں لیتا، کہیں تو کسی دن نانا کے سامنے یہ نام نہ لے دینا۔"

"تمہارے چاچا نے کیا کیا تھا ماں' جو اُنہیں گھر سے نکال دیا تھا۔" میں نے ماں کے گلے میں جھولتے ہوئے کہا۔

"اُس کا نصیب ہی ایسا تھا کہ وہ گاؤں کا سب سے سجیلا آدمی سب سے جوان اور باہمت آدمی اُس میں سما نہیں سکا۔ کبھی جگہیں سُکڑ جاتی ہیں اور آدمی بڑا ہو جاتا ہے۔ پر تو اپنے سبق میں دھیان لگا بھول گذری باتوں کی ٹوہ لگانے کا فائدہ۔ ٹوہ لگانے والے کو تیرے نانا اچھا نہیں سمجھتے۔"

عجیب تھے نانا بھی مگر میں نے ماں سے کچھ نہ کہا اور کریما یاد کرنے لگی۔

شہر کی اُس بستی میں پانی بھرنے پر موہن سنگھ نوکر تھا۔ پُرانی بستیوں سے دُور اور کارخانوں کے قریب یہ دس بارہ گھر تھے اور درمیان میں بنے پکے کنوئیں کے ساتھ کوٹھڑی میں موہن سنگھ سارا وقت گنگناتا اور اپنی دکنی بولی میں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ محنتی اور نرم خُو مضبوط کندھوں پر بڑی بڑی بالٹیاں لٹکائے وہ ساری بہوؤں اور بوڑھیوں کے دُکھ سُکھ میں بھی شریک رہتا ہر ڈیوڑھی میں اُس کے جوتے کی چرچر سنی جاتی۔

جن سردیوں کی یہ بات ہے اُس سال موہن سنگھ کے کنوئیں کی جگت پر ایک انوکھی سی رسیلی آواز چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔

"کون ہے وہ تیری" بڑی بوڑھیوں نے اور یہاں تک کہ کسی بات کی بھی ٹوہ نہ لینے والی ماں نے

موہن سنگھ سے پوچھا۔

"میری کون ہوتی جانے کہاں سے آئی ہے بس ایک دن آن کر بیٹھ گئی۔ جگت پری سوتی ہے اور سارا وقت بھجن گاتی ہے۔ کہتی ہے میرا اس جگ میں کوئی نہیں اور میرا جی نہیں پڑتا کہ اُسے دھکا دوں۔"

"اُسے کہیں کسی گھر میں نوکر رکھوا دو" چھوٹی بہو نے کہا۔

"نہیں بہو ماں میرا اس پرا... اتنا زور بھی نہیں کہ میں اُسے نوکری کرنے کا کہوں اور وہ کرلے اپنا کماتی ہے اور دھرتی تو بھگوان کی ہے"۔

"کیا وہ پاگل ہے" بی بی نے پھر پوچھا۔

کانوں کی لوئیں چھو کر موہن سنگھ نے کہا "وہ باتیں ہی کب کرتی ہے کہ اس سے پوچھوں ہاں آواز کوئل کی سی ہے وہ تو آپ نے سنی ہوگی؟ جو کچھ کہتی ہے تو کہتی ہے میں اپنے مرلی منوہر کو کھوجتی ہوں کنہیا مجھے چھوڑ گئے جانے کہاں نکل گئے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جانے کیا کھوجتی اور کیا دیکھتی ہیں وہ پاگل نہیں ہے بالکل نہیں ہے"۔

جب میں نے اُسے دیکھا تو سفید بالوں کے باوجود وہ نہایت خوب صورت تھی مگر اس کے جسم میں سے لگتا تھا آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ شعلوں سے بنی ہوئی لگتی تھی۔ نازک سے ہاتھ رنگ میں ڈوبے سفید پاؤں وہ ایسی تصویر تھی جس پر سے وقت گزر گیا ہو۔ پھر اس نے ہماری باہری چوکھٹ پر آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ رنگوں سے لکیریں کھینچتی اُن کو مٹاتی اور بناتی رہتی مگر پاگل وہ نہیں تھی۔ کبھی گھر کے اندر چلی آتی ہر طرف دیکھتی آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہتی اور پھر آپ ہی آپ باہر نکل جاتی۔ ہم اس کے یوں آنے اور چلے جانے اور بیٹھے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

برسات اُس سال بہت گھن گرج سے آئی تھی طوفان اور جھکی ہوئی سیاہ گھٹائیں جو گھروں کے اندر گھسی چلی آتیں گاؤں کی طرف جانے والے سارے راستے بند ہو گئے اور ماں بولائی بولائی پھرتی اب کیا ہوگا، ارے ان دو بوڑھے آدمیوں کا کیا ہوگا جن کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ ماں بادلوں کو دیکھ کر ہاتھ ملتی۔

"ماں اگر چاچا امام علی ہوتے تو نانا کا کوئی تو ہوتا، انھوں نے یونہی انھیں گھر سے نکال دیا"۔ میں نے ایک دن بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"تجھے کیا پتہ لڑکی عزت کی خاطر اصولوں کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ محبت کی ایک انتہا ہوتی ہے کہ آدمی بھول نہیں سکتا معاف نہیں کر سکتا بھلا نہیں سکتا۔" ماں بہت ہی دکھی ہو گئی تھی اور میں نے سوچا اب میں ہرگز چاچا امام علی کا نام نہیں لوں گی۔ مگر ایسی برسات میں کون مسجد تک اُن کا کھانا لے کر جاتا ہو گا؟

کوئی ہو تو سہارا رہتا ہے یہ سوچتے ہوئے یونہی میں نے باہر کا دروازہ کھولا تو دروازے کے ساتھ لپٹی بیل کی طرح وہ کنہیا کی رادھا کواڑ کے ساتھ ساتھ اندر جھک گئی۔

"آؤ رادھے آؤ کئی دن سے تم دکھائی نہیں پڑیں"۔

"برسات میں کون گیت گا سکتا ہے بابی بڑا دم گھوٹنے والا وقت ہوتا ہے، گاؤں کے راستے بند ہو جاتے ہیں کہیں کوئی آجا نہیں سکتا، سانس مشکل سے آتا جاتا ہے۔"

"تمہارا کونسا گاؤں ہے۔؟" میں نے فرش پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تھا ایک۔ جو میرا ہو سکتا تھا مگر نہیں ہوا۔" اُس نے بڑے دُکھ سے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکا تمہارا عجیب بات کہتی ہو گاؤں میں جا کر رہو تو گاؤں اپنا ہو ورنہ نہیں۔" میں نے جوش سے کہا۔ میرا جی چاہتا تھا وہ مجھ سے باتیں کرے مجھے بتلائے وہ کون تھی اور ایسی بہت سی باتیں جو کہانیوں کی طرح اُس کے گرد پھیلی تھیں۔ نانی نے ٹھیک کہا تھا ٹوہ لینے کی میری عادت اب پکی ہو گئی تھی۔

"گاؤں نے مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ باہر پھینک دیا جیسے میں کوڑے کا ڈھیر تھی۔ اور اس میں کسی کا بھی کوئی دوش نہ تھا نہ اُس کا اور نہ میرا۔" اُس نے اپنے رنگے ہوئے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھا۔

"وہ دوسرا کون تھا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"دوسرا وہی جو دوسرا نہیں تھا۔ جو کبھی دوسرا نہیں تھا۔" اُس نے سر گھٹنوں پر رکھا یا سیندور کی دھار بالوں میں گہری تھی۔

ماں نے پوچھا "یہ یوں کیوں بیٹھی ہے"۔

"کہتی ہے اس کا کوئی گاؤں تھا۔ پتہ نہیں کون گاؤں تھا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بی بی جب گاؤں نے مجھے پھیر ہی دیا تو اُس کا کیا نام ہوگا، دنیا کا کوئی کونا۔" اُس نے سر اُٹھایا تو آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں وہ جانے کے لیے اُٹھی۔

"بیٹھو رادھا،" ماں نے کہا،" چلو اور باتیں کریں۔"

وہ ہنسی ہے تو اُس کے دانتوں کی لڑیاں چمکیں باریک گلابی ہونٹ ہنسے سارا چہرہ ایک دم کھلا جیسے چاندنی میں شبنم بھرا پھول۔

"بھلا کیا باتیں کروگی؟ کیا کوئی بات مجھے خوش کرسکتی ہے وہ زندگی لوٹا سکتی ہے۔ جب وہ دن پھیرے نہیں جاسکتے تو بے فکری کے اُس کے ساتھ گزارے دن تو پرماتما بھی نہیں لوٹا سکتا۔ نہیں پرماتما بھی نہیں سمجھیں۔" اور اُس نے ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کے گرد گھیرا باندھ لیا جیسے سخت غصّے میں ہو اور لڑنے کی تیاری کررہی ہو۔

"صرف تم ہی دُکھیا نہیں؟ رادھا دنیا میں اور لوگ بھی ہیں پریشان اور غموں میں ڈوبے۔" ماں نے کہا۔

پھر ہم تینوں نے طوفان کی گرج کو سُنا ہوا اپنی بھیگی اوڑھنی کو جھٹکاتی تیزی سے اندر آئی اور سب کو گیلا کرگئی۔

"میں چلوں گی۔" رادھا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسے میں تو کوئی کسی دشمن کو بھی گھر سے جانے کا نہیں کہتا۔ طوفان غصہ ور دیو کی طرح پھنکار رہا ہے۔ موہن سنگھ کے کنوئیں تک جاتے جاتے کہیں تم اُڑ ہی نہ جاؤ اتنی دھان پان ہو تم۔"

رادھا مُنہ کھولے آنکھیں کھولے حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی اور لگتا تھا سانس اُس کے گلے میں اٹک جائے گی پھر وہ دھم سے فرش پر یوں بیٹھی جیسے اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانا چاہتی ہو۔

"تم کون ہو۔" اُس نے ماں سے پوچھا۔ اور موہن سنگھ کہتا تھا وہ پاگل نہ تھی۔ وہ کیا تھی کیوں اتنی بے چین تھی۔ پھر اُس نے اپنے بالوں پر۔ پلّو کو کھینچ کر ہٹایا۔ "یہ دیکھتی ہو یہ سُہاگ رنگ میں اب بھی اُس کی راہ دیکھتی ہوں پتہ نہیں اُسے میں یاد ہوں کہ نہیں مگر مجھے لمحہ لمحہ رتی رتی سب یاد ہے۔ اُس کی نگاہوں کے لہریئے اُس کی سجیلی آواز درد میں اُس کا دمکتا ہوا چہرہ چنچل، ہنسوڑ، مدھ بھری آنکھوں والا۔

میں اُس سے ملنے سے پہلے چمپا تھی بے فکر آزاد باپو کی پان کی دُکان کو چلانے والی۔ سگرٹ کی پنی میں لپیٹ کر جب پہلے پہل میں نے پان اُسے دیا تو وہ ہنسا تھا اور مجھے اچھا لگا تھا۔

"یہ تو کوئی بُری بات نہ تھی۔" ماں نے کچھ کہنے کے لئے کہا۔

"ارے یہ بُری بات ہی نہ تھی۔" وہ بہت خفا ہو گئی۔"کوئی کسی کے جی کو اچھا لگے تو بہت بُرا ہوتا ہے بی بی اچھا لگنا بہت بُرا ہوتا ہے مگر اس میں اُس کا کیا دوش تھا۔ میں نے اُس سے کہا تھا تم روز آیا کرو تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ پھر اُس نے وہ راستہ چھوڑ دیا۔ میں پاگلوں کی طرح ہر آنے والے کی طرف دیکھتی میرا رنگ زرد ہو گیا۔ ایک آگ تھی جس سے میرے دن اور رات جلتے تھے میں باتیں بُھولنے لگی، گاہکوں کی بات دھیان سے نہ سُنتی جیسے میرا سارا جسم چتا بن گیا ہو، نیند اور بھوک مجھ سے بھاگ گئیں میرے ماں نہیں تھی گھر پر میرے اور باپو کے سوا کوئی نہ تھا، میرا سُننے والا کوئی نہ تھا کس سے اپنا دُکھ کہتی۔ ہائے میں تو کہیں کی نہ رہی تھی کچھ کر نہ سکتی تھی!

پھر ایک دن میں نے اُسے دیکھا۔ میں نے کہا" میں تمہارے ساتھ جاؤں گی میرا من تمہارے بنا نہیں لگتا۔ میرا من کہیں بھی نہیں لگتا۔ تم مجھے نہیں لے گئے تو میں جان دے دوں گی تمہیں نہیں دیکھتی تو جیوں گی کیسے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں"۔

اُس نے کہا،" رادھا تمہارے اور میرے درمیان یہ سب اتنا آسان نہیں میرے بھائی ہیں، ماں ہے اور بہت سی گھاٹیاں ہیں اڑچنیں ہیں، تم میرا پیچھا مت کرو سکھی رہو گی۔ وقت تمہاری مدد کرے گا، مجھے بھول جاؤ گی، کوئی کسی کو ایک سی شدت سے نہیں چاہا کرتا۔ تم میری زندگی میں مت آؤ کوشش کرو اور بھول جاؤ اسی میں سکھ ہے"!

مجھے سُکھ نہیں چاہیئے تھا۔ مجھے سُکھ کی کب تلاش تھی میں تو بس اُسے دیکھتے رہنا چاہتی تھی اُس کے قدموں کی دُھول بن کر جینا چاہتی تھی۔

"رادھا مجھے بھی تو جینے کا حق ہے اور تمہارے ساتھ زندگی ناممکن ہے بہت ہی ناممکن۔"

اُس نے کہا تھا مگر میں اُس کے پاؤں سے لپٹی رہی۔ میں سمجھنے اور سوچنے کی منزلوں سے آگے نکل گئی تھی مجھے اُس جلن سے بچنا تھا، جو اُس کے بنا میرے جی کو لپیٹ لیتی تھی میں اُس کے پیچھے چلی آئی ہائے اب یاد آتا ہے وہ کتنا دُکھی تھا مگر میں تو دیوانی تھی میں نے اُسے دیکھا ہی کب تھا میرا اپنا آپ ہی

میرے لئے سب کچھ تھا۔ راستے میں اُس نے مجھے ایک چادر خرید کر دی اور مسجد میں لے گیا۔ پھر ہم اسٹیشن آئے اور گاڑی میں بٹھا کر وہ بولایا بولا یا بڑا گھبرایا ہوا سا جیسے ڈھے گیا ہو پلیٹ فارم پر پھرتا رہا۔ اور اُس گھڑی خوف سے میں کانپ رہی تھی۔ ہائے میں نے اُسے کتنا دُکھی کر دیا تھا۔۔ گاؤں کا راستہ لمبا تھا وہ خیالوں میں گُم تھا نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا نہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا پتہ نہیں وہ کتنا خفا تھا جانے وہ کیوں اتنا خفا تھا؟

جب ہم نہر کے ساتھ سے گاؤں کی طرف اُترے ہیں تو پہلی بار اُس نے کہا "رادھا اب تم میری بیوی ہو میری عزت ہو اس چادر کو اچھی طرح لپیٹ لو تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی سارے سوالوں کے جواب میں دوں گا۔ تم چُپ رہو گی مگر گھبرانا نہیں میں نمٹ لوں گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں مصیبتیں آئیں گی تو خود ہی لوٹ جائیں گی"

میرے جی کو بہت ڈھارس ہوئی وہ کتنا نرم مزاج تھا اور اجنبی ہونے پر بھی مجھے تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا دل ٹھہرے ہوئے پانی پر تیرتے کنول کی طرح لگا کھلا ہوا اور دھوپ میں ڈولتا ہوا پیار کے سمندر دل پر بہتا ہوا۔

گاؤں کے جس آنگن میں مجھے لے جایا گیا وہ خوب بڑا تھا۔ گھر میں ساس اور بہو کے سوا کوئی نہ تھا۔ ساس نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بٹھایا تو میرے بیٹے کے لئے آئی ہے نا مجھے سدا پیاری رہے گی۔ مگر دیکھ ابھی باہر مت نکلنا کسی سے کچھ مت کہنا جو بہوئیں اور بیٹیاں تم سے ملنے آئیں اُن سے زیادہ باتیں نہ کرنا۔ پھر اُس نے مجھے گہنے لا کر پہنائے ساڑھی اتروا کر گھاگر پہنایا بالوں میں سونے کے پھول پروئے ماتھے پر ٹیکا لٹکایا۔ میں چمپا سے رادھا اور رادھا سے دلہن بن گئی۔

دس دن جو میں نے اُس گھر میں کاٹے میری زندگی کے درخت پر پھول ہیں۔ ساس مجھے کتنا چاہتی تھی اُس کی بھابی مجھے کتنا چاہتی تھی۔ گاؤں کی بہوئیں مجھے کتنا چاہتی تھیں اور وہ مجھ سے بندھا تھا میں اُس کی حفاظت میں تھی اپنا بوجھ اُس کے کندھوں پر رکھ کر میں کتنی سکھی ہو گئی تھی اور خوشی میں مکمل۔ ہائے وہ چاہتوں سے بھرا گھر خواب میں بنے محل کی طرح آنکھ کھلنے پر مجھ سے چھن گیا۔ جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا وہ اُسے اور مجھے سپاہیوں کے گھیرے میں شہر لے آئے۔ باپو نے میرے آگے ہاتھ جوڑے میرے پاؤں پر پگڑی رکھی انجانے لوگوں نے مجھے سمجھایا۔ مگر عدالت میں میں نے بیان دیا

کہ وہ مجھے اچھا لگتا تھا میں اُس کی بیوی تھی باپو سے میرا کوئی ناتہ نہ تھا۔ میں اُس گھر کی بہو تھی اور خوش تھی۔ میں خود اس کے پیچھے گئی تھی میں اُس کے بنا جی نہیں سکتی تھی۔ مگر میرے اس بیان سے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست دنگا ہوا کئی لوگ مارے گئے کئی جگہ آگ لگی پوری زندگی اُلٹ پلٹ ہوگئی۔ میں جو ایک معمولی پنوارلن تھی کہانیوں کی راج کماری بن گئی۔

مقدمہ چلا اور اُسے سزا ہوگئی۔ مجھے ایک دھرم شالہ میں رہنے کے لئے بھجوایا گیا۔ مگر میں وہاں سے بھاگ آئی۔ جیل کے گرد اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں نے چکر لگائے۔ دروازوں کے ساتھ سر کو ٹکرایا۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اُن دنوں میں سچ مچ دیوانی ہوگئی اور پھر میں گاؤں گئی۔

ایسی ہی برسات تھی ایسے ہی دن تھے سارے راستے بند تھے مجھے اُس آنگن تک پہنچنا تھا جس میں اُس کے پیچھے چاہت ہی چاہت ملی تھی۔ اُس کواڑ کو پکڑ کر میں بھکارن کی طرح کھڑی رہی کھڑی ہی رہی۔ اُس کی ماں نے میری طرف دیکھا تک نہیں جیسے میں وہاں تھی ہی نہیں میرا اس گھر سے کیا ناتا تھا؟

بارش میں بھیگتے دیکھ کر اُس کی بھابی نے کہا جو تو نے کرنا تھا سو کر دیا یہ گھر برباد ہوگیا۔ وہ اب کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آسکتا بھلا تو کیوں اپنا وقت برباد کر رہی ہے۔ جہاں سے آئی ہے وہیں لوٹ جا۔ اس گاؤں میں جب اُس کے لئے جگہ نہیں تو تو کہاں رہ سکتی ہے۔

وہ شام میری زندگی کی آخری شام تھی جب میں نے بادلوں کی سُرخی میں اُس آنگن سے اُٹھتا اُپلوں کا نیلا دھواں دیکھا اور چڑیوں کو اولوں کی طرح برس کر بیٹھتے اور ہوا کے جھونکوں کی طرح اُٹھتے دیکھا۔ وہی ایک آنگن جو میرا دل تھا وہ ایک آنگن پھر اندھیرے میں ڈوب گیا اور میں گم ہوگئی گم ہی ہوگئی۔

جب وہ جیل سے چھٹا ہے تو جانے کہاں گیا۔ میں نے ساری عمر ایک ایک چہرے کو تکتے گزاری ہے غور سے دیکھتے اُسے کھوجتے مگر وہ تو دنیا کی بھیڑ میں رل مل گیا مجھے کہیں دکھائی نہیں پڑا۔

اور میں نہ پنوارلن چمپا رہی نہ اُس کی رادھا نہ ساس کی پیاری، میں کون ہوں بھلا میں کون ہوں اُس نے چوڑیوں سے بھری بانہوں کو پھیلایا اور چاروں طرف دیکھا۔

ماں نے اُٹھ کر رادھا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور دونوں چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

"گاؤں سے جو پہلی خبر آئی وہ اسی برسات میں مکمل تباہی کی تھی۔ نانا کا مکان ڈھے گیا تھا۔ نانی ماموں دلاور کے گھر میں تھیں نانا مسجد میں بیمار تھے۔ ماں تڑپ تڑپ کر رو دی اور جب راہ ذرا خشک ہوئی پانی اُترا تو ہم گاؤں آئے۔

ہر طرف ویرانی اور اُداسی تھی لوگ اپنے گھر بڑے اَن منے دل سے اٹھا رہے تھے اور تھکے ہوئے ہارے ہوئے لگتے تھے۔ نانا کا گھر بنانے والا کوئی نہ تھا۔ ماں مٹی کے ڈھیروں کے پاس کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ نانی نے کہا "نشا مقدر سے کون لڑسکتا ہے مگر کوئی صورت نکل آئے گی پریشان نہ ہو۔"

ماموں دلاور کا گھر مجھے پرایا پرایا سا لگا گھٹا گھٹا سا میں سونے کے لئے مودی کی طرف چلی گئی جہاں رات میا نے انھیں چاچا امام علی کی بیوی کی باتیں بتائیں ماں برکتے اور مودی کی ماں بھی ہمارے پاس بیٹھی رہیں۔

"بڑی بدقسمت لڑکی تھی وہ ساری زندگی اُس پرچھائیں کے لئے گزار دی۔ مانگ میں رنگ سجائے پھرتی ہے اور اُس کی راہ دیکھتی ہے، جو کبھی اُس کی راہوں سے نہیں گزرے گا۔"

"مگر آخر وہ کیوں نہیں آسکتا میری ماں کا چاچا امام علی۔" میں نے بڑے دُکھ سے پوچھا۔

"تمہارے نانا کا مزاج بالکل دوسرا ہے وہ قرآن پاک تو سمجھ سکتے ہیں مگر دل کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ امام علی بڑے دل گُردے کا جوان تھا ایک لڑکی کی بات پر اُس نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ مقدمے کے بعد تمہارے نانا نے اُسے گھر آنے سے منع کر دیا۔ جانے اب کہاں ہوگا۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں نہ کہیں تو ہوگا ہی۔" ماں برکتے بڑے افسوس سے یہ سب کہہ رہی تھی ہم چُپ چاپ بیٹھی رہیں، یہاں تک کہ گلی میں ہل لے کر جانے والے لوگوں کے قدموں کی چاپیں اُبھریں پھر مُرغ اذانیں دینے لگے چڑیاں چوں چوں کر کے درختوں پر جاگیں کُتے بھونکے اور سویرا ہونے لگا۔

پتہ نہیں دل کی بات کبھی کسی کی سمجھ میں آتی بھی ہے کہ نہیں اور مقدر بنانے والا جانے کیا بناتا اور کیوں بناتا ہے۔ دیوانگی اور فرزانگی میں کیا باریک فرق ہے۔ نانا ان باتوں کا جواب دے سکتے ہیں وہ مسائل کا حل جانتے ہیں مگر دل کی بات کیا سمجھیں گے کیا جانیں گے؟